ڈھائی سو روپے

کے

پانچ انعام

مجلۂ مکتبہ کے

قلمی معاونین کو سال بھر کے بہترین مضامین کے لئے حسب تفصیل ذیل عطا کئے جائیں گے:-

۱- ڈاکٹر سید محی الدین قادری، ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ — ۵۰ — **مختصر ڈراما**
ایک اکٹ کا، اچھی اور ہندوستان کی معاشرت کے مطابق ہو

۲- مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی۔ ایم اے۔ ال ال۔ بی۔ پروفیسر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ — ۵۰ — **تاریخی مقالہ**
ریاست حیدرآباد اور خاصکر گولکنڈہ کی سلطنت کے متعلق ہو

۳- مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی۔ ایم اے، پروفیسر کلام کلیہ جامعہ عثمانیہ — ۵۰ — **تنقیدی مضمون**
اردو کے کسی مصنف یا شاعر پر تحقیقی اور انوکھے رنگ میں

۴- مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ منشی فاضل، دفتر دیوانی فینانس۔ ریاست حیدرآباد — ۵۰ — **تحقیقی مضمون**
تاریخ اسلام سے متعلق

۵- مدیر مکتبہ — ۵۰ — **مختصر افسانہ**
حیدرآباد کی زندگی کے کسی پہلو پر

نوٹ:- (۱) تاریخی اور تنقیدی مضامین نہایت تحقیقی ہوں اور ڈرامے اور افسانے بالکل اچھے (۲) کوئی مضمون رسالہ کے تیس صفحوں سے زیادہ طویل نہ ہو (۳) جو مضامین انعام کے اہل قرار دیے جائیں گے ان کا اعلان ماہ آبان (ستمبر) میں ہوگا۔ (۴) انعاموں کی تقسیم ماہ آذر (اکتوبر) میں عمل میں آئیگی (۵) مضامین کی جانچ مبصرین مجلہ کے علاوہ فی الحال حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہوگی:- (۱) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر فلسفہ۔ (۲) ڈاکٹر میر سیادت علی خان ایم اے ال ال بی ڈی فل بی سی ال پروفیسر قانون۔ (۳) مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری۔ ایم اے بی اس سی، آنرز (مینچسٹر) پرنسپل کلیہ انجینئرنگ جامعہ عثمانیہ۔

کی

خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کریں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے "مجلۂ مکتبہ" بلاقیمت حاضر ہوگا یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے اُن کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلۂ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ اُن کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اسی طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

رجسٹرڈ نشان سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹرڈ نشان سرکار انگلشیہ (۰۰۰۰۰۰۱)

[illegible] مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلّہ

مکتبہ

مدیر سید عبدالقادر سروری ام اے ال ال بی

جلد ۸	بابتہ ماہ آذر ۱۳۴۱ فصلی	فہرست	ماہ اکتوبر ۱۹۳۱ عیسوی	شمارہ ۱

خدا کا شکر ہے کہ رسالے کی ساتویں جلد ختم ہو گئی۔ اور اس اشاعت سے آٹھویں جلد کا آغاز ہو رہا ہے، اس دوران میں "مکتبہ" نے جو کام کیا، اس پر تبصرہ کرنا میرے منصب میں داخل نہیں ہے۔ قارئین کرام خود اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ "مکتبہ" نے جو کچھ بھی اب تک کیا نہایت خاموشی کے ساتھ کیا۔ علمی پہلو کے ساتھ ادبی دلچسپی کو بھی برقرار رکھنے کی برابر کوشش کی گئی۔ اور توقع ہے کہ آئندہ رسالے کی ظاہری اور معنوی خوبیوں میں غیر معمولی اضافہ ہو سکے گا۔ ملک کے بعض علم دوست حضرات رسالے کی افادیت کو بڑھانے اور اس کے علمی اور ادبی پہلوؤں کو فروغ دینے میں کمال مہربانی، میرا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ پروفیسر عبد المجید صدیقی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری، مولوی عبد القادر صاحب صدیقی اور مولوی نصیر الدین ہاشمی کی علمی عطاؤں کا اعلان رسالے کے کسی دوسرے مقام پر شایع ہوا ہے۔ ان قیمتی عطیوں کے قائم کرنے سے ہمارا مقصد، رسالے کے مضمون نگاروں میں سنجیدہ نگارش اور ادبیت کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول میں ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر میر سیادت علی خان، اور مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری نے مبصری کی اہم ذمہ داری قبول فرمائی ہے اس سے ہمارے ادب کو ضرور فائدہ پہنچے گا۔ "مکتبہ" اپنے ان معاونین کی امداد کا معاوضہ کسی طرح کے شکریہ سے بھی ادا نہیں کر سکتا۔

ایک اور امر جو آئندہ رسالے کی خاطر خواہ کامیابی کو یقینی بنا رہا ہے یہ ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور جن کی قلمی اور اخلاقی اعانت ہمیشہ مکتبہ کی شامل حال رہی ہے۔ قیام ولایت میں غالباً اپنی علمی مصروفیتوں کے سبب اور پھر وطن واپس آنے کے بعد سے اب تک سستانے کے لئے مکتبہ کے حق میں خاموش سے ہو گئے تھے۔ لیکن بڑی مسرت کی بات ہے کہ اب وہ اپنی قلمی امداد اور نہایت قیمتی مشوروں سے رسالہ کی مدد پر آمادہ ہو گئے ہیں مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ علمی دلچسپی میری بڑی معاون ثابت ہو گی خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ جناب یافعی صاحب اور مولوی سید محمد صاحب نے اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے، اپنی قیمتی اعانت سے مجھے محروم فرما دیا ہے۔ گذشتہ تین سالوں میں ان حضرات نے میرا جس قدر ہاتھ بٹایا اس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ سچ یہ ہے کہ پچھلے دنوں میں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے

ہیں کم سے کم وقت رسالے کی خدمت میں صرف کرسکا اور ادارت کے فرائض کا زیادہ بار اپنے معاونین کے کندھوں پر ڈالتا رہا۔ ظاہری اعانت سے محروم ہوجانے کے باوجود، جناب یافعی صاحب اور سید صاحب کی قلمی اور اخلاقی اعانت کا میں ہر وقت متوقع ہوں۔ اس رسالہ سے مولوی عزیز احمد صاحب میرے ساتھ بہ حیثیت سب ایڈیٹر کے کام کررہے ہیں۔ عزیز احمد صاحب علمی دنیا میں پہلے ہی سے روشناس ہوچکے ہیں ان کے مضامین نہ صرف مکتبہ میں بلکہ ہندوستان کے اکثر رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سچا ادبی ذوق ہے اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ عزیز احمد صاحب کی خدمات سے رسالے کو معتد بہ فائدہ پہنچے گا۔

مجھے بڑی توقع ہے کہ اپنی نئی تجویزوں میں ہمیں پوری کامیابی ہوگی۔ اور آئندہ مکتبہ علمی اور ادبی رسالہ کی دلچسپیوں کا مثالی نمونہ ہوگا۔

اس دفعہ جتنے مضامین رسالہ میں شایع ہورہے ہیں وہ کسی نہ کسی خاص اہمیت کے مالک ہیں خصوصاً بعض موضوع ایسے ہیں جن کو اردو دنیا سے روشناس کرانے کا مکتبہ کو سب سے پہلے فخر حاصل ہو رہا ہے۔ اس اچھوتے موضوع سے میری مراد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا مضمون ''صوتیاتی تحقیقات'' ہے ڈاکٹر قادری نے یورپ کی جامعات لندن اور پیرس میں اس موضوع پر بہت سا تحقیقاتی کام کیا ہے اور ''ہندوستانی فونیٹکس'' کے عنوان سے کتاب بھی لکھی ہے جس کی بیحد تعریف اُن کے استاد پروفیسر جولس بلوک صدر شعبہ لسانیات مشرقی جامعہ پیرس نے مقدمہ میں کی ہے۔ عرصہ سے میں متقاضی تھا کہ ڈاکٹر قادری صوتیات پر اردو میں کچھ لکھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہا کہ یہ مضمون اردو سے نامانوس ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ خدشہ بے بنیاد بھی نہ تھا چنانچہ یورپ اور ہندوستان کے اکثر رسالوں میں جہاں ''ہندوستانی فونیٹکس'' پر بہترین تنقیدیں شایع ہوئی ہیں اس موضوع پر اردو میں کتاب نہ لکھنے کے اعتراض کا جواب دفع دخل مقدر کے طور پر یہ دیا ہے کہ جدید لسانیات اور صوتیات کی اصطلاحیں اردو میں مفقود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جس صفائی سے اپنے مطالب کو واضح کیا ہے اس سے توقع ہے کہ اگر وہ اس موضوع پر اردو میں کتاب بھی لکھیں تو انہیں کامیابی ہوگی۔ ''صوتیاتی تحقیقات'' بڑی حد تک عام فہم ہے تاہم ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بعض مقامات مزید توضیح اور تشریح کے محتاج ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دقت کچھ تو موضوع کی اجنبیت کی وجہ سے ہے اور کچھ اصطلاحات کے فقدان کی پیدا کردہ۔ اگر یہ فن اردو زبان میں گھُل مل جائے تو یقین ہے کہ یہ دشواری بھی حل ہوجائیں گی۔

اس رسالہ میں میرا مضمون "شعر کی صنفیں" اردو کے لئے کوئی نیا نہیں حقیقت میں میں نے اپنا بیشتر مواد قدیم شاعری کی کتابوں سے فراہم کیا ہے۔ کہیں کہیں اپنے تجربوں سے بھی میں نے کوئی نئی بات اضافہ کردی ہے۔ امید ہے کہ یہ مضمون دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ یہ مضمون میری کتاب "جدید اردو شاعری" کا ایک باب ہے جو اب چھپ رہی ہے۔

زکریا صاحب کا افسانہ "ایفائے شرط" "میری طرح" اکثر قارئین کرام کو پسند آئے گا۔ عربوں کی معاشرت جانبازی محبت ایثار غرض بے شمار متضاد اوصاف کا مجموعہ ہے لیکن اس افسانے میں جس ایثار کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، وہ بہت ہی اونچا ہے۔

مولوی عزیز احمد صاحب کا مختصر ڈراما "تعطیل" ہلکی سی شوخی کی وجہ سے دلچسپ بنگیا ہے۔ قارئین اس کو پڑھکر بہت محظوظ ہوں گے۔

ہندوستان کی علمی دنیا سے ایک گرانمایہ ادیب کے اُٹھ جانے پر ہمیں سخت صدمہ ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا جو شاعر اور خاصکر ناول نگار کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے تھے۔ چند روز ہوئے ایک جسمانی صدمہ سے انتقال کر گئے۔ رسوا لکھنو میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں تعلیم پائی فلسفہ ان کا خاص مضمون تھا لیکن طبیعت ادیبانہ پائی تھی عالم شباب میں بہت ہی شاعرانہ زندگی بسر کی تھی جس کا اثر آخر تک باقی تھا۔ مرزا رسوا عرصہ سے حیدرآباد میں مقیم تھے پہلے کچھ دنوں تک وہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ پڑھاتے رہے پھر دارالترجمہ میں فلسفہ کے مترجم ہو گئے تھے۔ ان کے ناول "امراؤ جان ادا" "اور شریف بدمعاش" وغیرہ بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ افسانوں میں "امراؤ جان ادا" رسوا کا شاہکار اور اردو ادب کا بڑا کارنامہ ہے۔ جس پر ہم کبھی تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ ایسے ادیب کی موت اُردو کے اونچے اور اچھے مصنفین کی کمی میں ایک اور کا اضافہ کر دیتی ہے۔ جس کا ہم کو جس قدر صدمہ ہو کم ہے۔

شعری صنفیں

یہ مضمون مدیر کی کتاب "جدید اردو شاعری" کا ایک حصہ ہے جو زیر طبع ہے (مکتبہ)

تمہید علمی اور تنقیدی مطالعہ کے لئے شعری تقسیم اصناف پر کر لی جاتی ہے۔ اس طرح تعین کی بنیاد یا تو شعر کی شکل ہوتی ہے یا موضوع کی نوعیت۔

مشرقی شاعری میں شعر کی تقسیم کا اصول عموماً اس کی ظاہری اور مقررہ شکل رہا ہے۔ عربی، فارسی، اور اردو کی طرح، سنسکرت اور ہندی میں بھی شعر کی تقسیم معین اور مقررہ شکل پر ہوئی ہے۔ جیسے چوپائی، چھپائی، دوہا، سورٹھا، وغیرہ۔ لیکن مغربی شاعری میں شعر کی گروہ بندی اور تفریق موضوع کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔

ایک قسم شعر کی وہ ہے، جس میں شاعر اپنے موضوعات اور الہامات کی تلاش، خود اپنی ذات یعنے اپنے تجربات، خیالات اور جذبات کے اندر کرتا ہے۔ ایسی شاعری شخصی، ذاتی یا داخلی شاعری کہلاتی ہے کیونکہ اس میں شعری تحریکات، شاعر کو اپنے ہی اندر سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم کی شاعری وہ ہے جس میں شاعر، اپنی ذات سے ہٹ کر، اپنے اطراف کی وسیع کائنات پر نظر ڈالتا ہے۔ اور اپنے کلام میں اپنے ذاتی احساسات اور جذبات کو بہت کم داخل کرتا ہے یہ غیر شخصی یا خارجی شاعری ہے۔ میر تقی میر کی غزل کی شاعری داخلی شاعری ہے اور ان کی مثنویاں خارجی شاعری کے ذیل میں آتی ہیں۔ غزل کی تمام شاعری عموماً داخلی شاعری ہوتی ہے۔ اور یہ اپنی خصوصیات میں انگریزی کی "لی رک" شاعری سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ ہمارے پاس داخلی شاعری کا میدان اسی پر محدود نہیں ہے۔ رباعی بھی داخلی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ ہماری زبان کی تمام مذہبی، قومی اور عاشقانہ شاعری داخلی شاعری ہی کی سرحد میں آتی ہے۔

داخلی شاعری کے چند ضروری عناصر ہیں۔ شریفانہ جذبات، اور صداقت شعاری کے علاوہ

حسن اور صفائی بیان کا اس میں پایا جانا ضروری ہے۔ تناسب اور اختصار بھی اس میں زور پیدا کر دیتا ہے
داخلی شاعری میں عظمت اور ابدیت انہیں شاعروں کے حصے میں آئی ہے، جو اپنے ذاتی جذبات کو اس
طرح پیش کرتے ہیں کہ ہر پڑھنے والا ان کو اپنے جذبات سمجھنے لگے۔

داخلی شاعری اکثر غیر شعوری طور پر فلسفیانہ اور متصوفانہ شاعری بن جاتی ہے۔ سعدی، حافظ، عمر خیام
مولانائے روم اور غالب کی شاعری اس کا اچھا نمونہ ہے۔ مرثیہ بھی داخلی شاعری ہی کی ایک اہم صنف ہے
اگر وہ سادہ اور مختصر ہو۔ جیسے غالب کا مرثیہ عارف یا حالی کا مرثیہ غالب۔ فارسی میں مرثیہ ہمیشہ داخلی رہا۔
لیکن اردو میں، یونانی مرثیہ[1] کی طرح بہت سے خارجی مضامین بھی اس میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ یونانی مرثیوں
میں ہمارے موجودہ مرثیوں کی طرح مضامین کا بڑا تنوع ہوتا تھا۔ جنگ و جدل کے واقعات معاشرتی حالات
اور بین یعنی مُردوں کے لئے آہ و زاری، یہ سب قدیم یونانی مرثیہ کی خصوصیات ہیں جو اردو مرثیہ میں
بھی موجود ہیں۔

خارجی شاعری کا اصل اصول، جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے، شاعر کے ذاتی جذبات خیالات
اور محسوسات سے اس کا براہ راست تعلق نہ رکھنا ہے۔ اس میں شاعر اپنے بطون اور جذبات سے
قطع نظر کرکے بیرونی دنیا پر قلم اٹھاتا ہے۔ داخلی شاعری میں تو مضامین کے لئے شاعر اپنے دل کے گوشے
ٹٹولتا ہے، مگر خارجی شاعری کے لئے اس کو سواد بیرونی دنیا سے مل جاتا ہے۔ گو اس کے بیانات میں
اس کی ذات کی جھلک بھی موجود ہو سکتی ہے۔ قدیم زمانے کے گیت رزمیہ نظمیں، قصے، خصوصاً مہماتی
قصے سب خارجی شاعری کے ذیل میں داخل ہیں۔ مغربی ادبیات میں ڈراما کی شاعری بھی خارجی شاعری
کی ایک صنف ہے جو سب سے زیادہ اہم تصور کی جاتی ہے۔ اردو میں ڈراما کی صنف معین نہیں ہے۔
ڈراما کے مماثل اگر کوئی چیز ہے تو وہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے ہو سکتے ہیں۔ مرثیوں کے بعض حصے
بے حد موثر اور ڈرامائی ہیں۔ ان میں کردار بھی ہیں، اور خود شاعر بھی ایک شخص قصہ کی حیثیت رکھتا ہے۔
ڈرامے کا بڑا اہم جزو یعنے مکالمات بھی مرثیوں میں موجود ہیں۔

موضوع کی نوعیت کے لحاظ سے شعر کی اصناف پر نظر ڈالنے کے بعد، ہم ان اصناف کی اجمالی

---

[1] پرائمر آف گریک لٹریچر صفحہ ۱۰۵

تفصیل یہاں پیش کرتے ہیں، جو شعر کی ظاہری بناوٹ[1] شکل اور صورت کے اعتبار سے معین کی گئی ہیں۔ اردو میں شعر کی صورتیں حسب ذیل ہیں:۔

غزل قصیدہ قطعہ رباعی مثنوی مسمط

ترکیب بند ترجیع بند مستزاد فرد

قدیم شاعروں کے ذہن میں ان صورتوں کے علاوہ شعری خیال کے اظہار کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔ شعر کی یہ صورتیں اس قدر جامع ہیں کہ کسی حال میں بھی شعر ان کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جدید شاعری نے بھی ان پر بہت کم اثر ڈالا۔ غیر مقفیٰ نظم کے سوائے جدید شاعری میں اظہار خیال کی جو بھی صورت ہوگی، وہ انہیں اصناف میں سے کسی ایک کے ذیل میں آجاتی ہے۔

ان اصناف کی بنیاد چند ظاہری لوازم اور معنوی خصوصیات پر رکھی گئی ہے۔ اس کا ذکر نیچے اپنے اپنے موقع سے آئے گا۔ قدیم شاعری کو کماحقہ سمجھنے کے لئے ان لوازم اور خصوصیات کا جاننا ضروری ہے۔ قدیم اردو شاعر کے ذہن میں شعر کے موضوع کے مقابلے میں اس کی ظاہری شکل زیادہ اہمیت رکھتی تھی، اوپر لکھے ہوئے اصناف میں پہلی پانچ اور مسمط کی ایک شکل مسدس بہت مقبول ہوئیں۔ ہم یہاں ایک ایک صنف کو لیکر اس کی ظاہری شکل، معنوی خصوصیات اور اس کے معیار خوبی سے مفصل بحث کریں گے۔

غزل یہ شعر کی وہ شکل ہے جس میں ایک ہی وزن اور ایک ہی قافیہ کے چند اشعار ہوتے ہیں۔ غزل کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ باقی اشعار میں صرف دوسرے مصرعے پہلے شعر کے ہم قافیہ ہوں گے۔ قافیہ کے لحاظ سے اس کی شکل کا یہ نقشہ ہوگا:۔

ا	ا ....
ب	ا ....
ج	ا .... وغیرہ

غزل کے اشعار کی تعداد تین[3] سے لیکر پچاس تک معین کی گئی ہے لیکن عام طور سے دس[10] بارہ[12] شعر سے زیادہ کی غزلیں کم لکھی جاتی ہیں۔

غزل کے پہلے شعر کو "مطلع" کہتے ہیں۔ مطلع، طلوع ہونے کی جگہ ہے۔ لیکن اس اصطلاح میں اس کے معنے غزل کی ابتدا کے ہوتے ہیں۔ آخری شعر جس پر غزل ختم ہوتی ہے متمم یا مقطع کہلاتا ہے۔

[1] شاعری کی مختلف شکلوں کو زیادہ آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرنے کے لیے ہر شعر کے قافیہ کی مخصوص ترتیب کو اس طرح کے نقشوں سے دکھایا گیا ہے

مقطع میں عموماً شاعر اپنا مختصر نام لاتا ہے، اس نام کو "تخلص" کہتے ہیں۔

غزل کا لفظ درحقیقت تعریف ہے۔ اس سے غزل کی بنیادی معنوی خصوصیت کا پتہ چلتا ہے غزل کے معنے جوانی کا حال بیان کرنے کے ہیں۔ شعر کی یہ صنف جذبات شباب یعنے حسن وعشق کے مضامین کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ یہی غزل کا معنوی امتیاز ہے جو اب تک باقی ہے۔ تصوف، اخلاق اور حکیمہ مضامین اس میں بعد شامل کئے گئے تھے۔ غزل کی خوبی کا معیار یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی زبان سلیس اور شیریں ہو۔ غزل کا ہر شعر منفرد ہوتا ہے۔ ایک شعر کے مضمون کو دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن قدیم شاعروں نے ایسی غزلیں بھی لکھی ہیں، جن میں کوئی مسلسل مضمون باندھا گیا ہے۔

غزل درحقیقت ایک عاشق اور ایک متعلم فطرت حکیم کے منتشر یا غیر مربوط خیالات اور مشاہدات کے اظہار کے لئے بے حد موزوں صنف شعر ہے۔ عاشق اس میں اپنے منتشر خیالات اور جذبات کو اور حکیم اپنے منفرد مشاہدات اور نکات کو ہم وزن اشعار میں ظاہر کرکے قافیہ کے رشتہ میں انہیں منسلک کرسکتا ہے اس طرح غزل گویا محبت اور عشق کے داخلی مضامین کے لئے مخصوص ہوگئی ہے۔

قصیدہ قصیدہ کی ظاہری شکل وہی ہے جو غزل کی ہوتی ہے۔ فرق صرف مضمون کا ہے۔ قصیدے میں کسی کی مدح یا ہجو کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قصیدہ غزل کی بہ نسبت عموماً زیادہ طویل ہوتا ہے۔ بعض قصیدے پانچ پانچ سو شعر کے بھی لکھے گئے ہیں۔

ایک مکمل قصیدے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے چار حصے ہوتے ہیں۔ ہر حصے کا نام جدا جدا ہے۔ پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں۔ پہلا حصہ تشبیب کہلاتا ہے۔ تشبیب کے معنے شباب کے جذبات بیان کرنے کے ہیں۔ عربوں کے یہاں شاعری تمامتر قصیدے پر مشتمل تھی۔ حسن وعشق کے موثر جذبات کے اظہار کے لئے۔ ان کے ادب میں کوئی علحدہ صنف تھی ہی نہیں، اس لئے انہوں نے اس کے تمہیدی حصے کو اس طرح کے مضامین کے لئے مخصوص کرلیا تھا۔ بعد میں تمہید کے مضامین زیادہ وسیع کرلئے گئے۔ زمانے کی شکایت اور نصیحت موسم بہار وغیرہ کے مضامین بھی تمہید ہی میں بیان ہونے لگے۔ لیکن اس حصے کا نام پہلا ہی برقرار رہا۔ اردو میں قصیدہ بجنسہ منتقل کرلیا گیا۔

قصیدے کے مضامین مربوط ہوتے ہیں۔ تشبیب قصیدے کا تمہیدی حصہ ہوتا ہے۔ اس حصے کی بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ شاعر اس میں ایسے مضامین بیان کرے جو آگے آنے والے مدح کے حصے سے

چسپاں ہو جائیں۔ لیکن اس کا پورا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ صرف تمہید کے ختم پر ایک یا ایک سے زیادہ شعر ایسے لائے جاتے ہیں جو مدح یا ہجو وغیرہ کی طرف متوجہ کردیں۔ یہ قصیدے کا دوسرا مرحلہ ہے اور بڑا اہم مرحلہ ہے اس کو گریز کہتے ہیں۔ یہاں سے شاعر قصیدے کے اصل مدعا کی طرف لوٹتا ہے۔ باکمال قصیدہ گو، اپنی تمام چالاکی تشبیب کے غیر متعلق مضامین کو بھی مدح وغیرہ کی طرف لوٹانے میں دکھاتا ہے۔ گریز کے مختصر اشعار کے بعد، اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔

تیسرا حصہ قصیدے کا مدح یا ہجو وغیرہ ہے۔ قدیم قصیدہ گو ممدوح کے ممتاز اوصاف بیان کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں مدح اور ذم رسمی چیز بن گئی۔ اور اس کو نباھنے اور موثر بنانے کے لئے قصیدہ نگاروں نے، شان و شوکت کے اسالیب اختراع کرنے شروع کئے۔ یہیں سے قصیدہ کا یہ اصول بن گیا کہ اس کی زبان اور مضامین رعب داب سے پر ہونے چاہئیں۔ قصیدے کے معنے "گاڑھے مغز" کے ہیں مدح و ذم کا باب دعا یا بددعا پر ختم ہوتا ہے۔ دعا مدحیہ قصیدے کا چوتھا اور اختتامی حصہ ہے۔

قصیدے کا عام اصول تو یہی ہے جو اوپر بیان ہوا لیکن بعض وقت قصیدے میں تشبیب نہیں ہوتی۔ اور سرے سے مدح شروع کردی جاتی ہے۔ ایسے قصیدوں کو "مقتضب" کہتے ہیں "مقتضب" کے معنے بانجھ کے ہیں۔ اور یہ اشارہ ہے قصیدے کے تشبیب سے خالی ہونے کی طرف۔

قطعہ شکل کے لحاظ سے غزل اور قصیدے سے مشابہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں مطلع نہیں ہوتا۔ پہلے شعر کے دونو مصرعوں کے قافیہ مختلف ہوتے ہیں اور ہر بیت کے آخری مصرعے کا قافیہ وہی ہوتا ہے، جو پہلی بیت کے دوسرے مصرعے کا۔ قطعے کی شکل حسب ذیل ہو گی:-

ا........	........ب
........ج	........ب
........د	........ب

قطعہ کے معنے کاٹے ہوئے کے ہیں۔ اس کو قطعہ کہتے ہی اس لئے ہیں کہ یہ غزل یا قصیدے سے کاٹا ہوا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔

قطعے کا موضوع قصیدے اور غزل سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قدیم شاعری میں سب سے زیادہ غیر رسمی موضوع اگر کسی صنف کا ہے، تو وہ قطعہ ہے اس میں کسی خاص موقعے کے واقعات، کسی شے کی

تعریف کوئی نصیحت یا حکمی اور اخلاقی نکتہ آزادی کے ساتھ مربوط نظم کیا جاتا ہے قطعے کی صنف قدیم شاعری کی ایک ضروری صنف ہے۔ جب شاعر کوئی طویل نظم لکھنا نہ چاہے تو قطعے کے لباس میں اپنے افکار کو ظاہر کرتا ہے۔ اردو میں غالب اور حالی کے قطعے بہت مقبول ہیں۔

رُباعی مربوط صنفوں میں سب سے چھوٹی نظم ہے۔ اس میں صرف دو شعر یا چار مصرعے ہوتے ہیں اسی لئے اس صنف شعر کو دوبیتیہ[ل] یا رباعی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اردو میں صرف یہی ایک صنف شعر ایسی ہے جس کا وزن معین ہے۔ رباعی ہمیشہ ایک ہی وزن یعنے ایک ہی بحر میں لکھی جاتی ہے اس کی بحر، بحر ہزج سے مشتق ہے۔ تمام مصرعوں کا وزن ایک نہیں ہوتا۔ پہلے مصرعے کے وزن کے ارکان یہ ہیں:-

مفعول مفاعیل مفاعیلن فع — دوسرا مصرعہ اس وزن پر ہوتا ہے۔

مفعول مفاعلن مفاعیلن فع — تیسرے اور چوتھے مصرعے کا وزن یہ ہے

مفعولن، مفاعلن مفاعیلن فع

بعض وقت اس بحر ہی کو بحر رباعی بھی کہتے ہیں رباعی کے پہلے دو اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں رباعی کی شکل نقشہ کی رو سے یہ ہوگی:-

.... ا .... ا

.... ب .... ا

رباعی کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں صرف ایک چیز، ایک بات اور ایک واقعہ بیان کیا جائے۔ قطعے کی طرح رباعی کے مضامین میں بھی شاعر کو آزادی رہتی ہے۔ وہ جس چیز پر چاہے رباعی کے پیرایہ میں اپنے خیالات ظاہر کرسکتا ہے۔ باکمال رباعی نگار شعرا کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ صرف چار مصرعوں کی محدود وسعت میں، اپنے مافی الضمیر کو اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ کچھ تشنگی باقی نہیں رہ جاتی۔ پہلے مصرعے میں وہ جس چیز کو روشناس کرتے ہیں۔ دو مصرعوں میں اس کو بڑھا کر چوتھے مصرعے میں منتہا تک پہنچادیتے ہیں۔ رباعی ایجاز کا مکمل نمونہ ہوتی ہے۔ اسی لئے زور اور اثر اسکا ممتاز وصف ہوتا ہے۔

ل دوبیتیہ اب متروک ہے۔

رباعی فارسی ادب کی پیداوار ہے۔

مثنوی اردو ادب کی بہترین اصناف میں سے ہے۔ قافیہ اور ردیف کی قید سب سے کم مثنوی میں کی جاتی ہے۔ اسی لئے دنیا کی بعض طویل ترین لازوال نظمیں اسی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے بھی اس میں اتنی ہی وسعت ہے، جتنی خود کائنات میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو میں بعد کو مثنوی کے بھی کچھ رسمی ضابطے بن گئے تھے ابتدا میں یہ حالت نہ تھی، رودکی نے اس میں غزل کہے اور، فردوسی نے رزمیہ مضامین اس میں بیان کئے، نظامی نے عاشقانہ قصے اور عطار نے متصوفانہ افسانے اس میں کھپائے سودا اور میر کی مثنویاں بھی بے حد مختلف الموضوع ہیں۔ دکن میں، فارسی شعرا کی تقلید میں متصوفانہ قصے زیادہ تر مثنوی میں لکھے گئے تھے، بعد کو قصے کا موضوع گویا مثنویوں کے ساتھ مختص ہو گیا تھا، لیکن پھر آزاد اور حالی نے مثنوی کے موضوع کے دائرہ کو وسیع کر دیا۔

مثنوی مسلسل نظم ہوتی ہے۔ جس کے ہر شعر کا قافیہ جدا ہوتا ہے۔ اردو میں عام طور سے مثنوی ہی سب سے زیادہ طولانی نظم ہوتی ہے۔

مثنوی کی شکل کا نقشہ یہ ہوگا۔

.... ا .... ا

.... ب .... ب

.... ج .... ج وغیرہ

مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالب مربوط ہوں۔ اور ہر شعر مطلب کو اختتام کی طرف بڑھائے نہ شان و شوکت اس کا لازمی جز ہے اور نہ ایجاز و اختصار۔

مسمّط اردو شاعری کی چھٹی شکل ہے۔ تسمیط کے معنے پرونے کے ہیں۔ اس میں شعر بندوں [1] کی صورت میں لکھے جاتے ہیں۔ تین یا تین سے زیادہ مصرعوں کا ایک ایک بند ہوتا ہے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ سب سے پہلے کم سے کم تین ۳ اور زیادہ سے زیادہ دس ۱۰ مصرعے ایک وزن اور ایک قافیہ کے لکھے جاتے ہیں باقی بندوں میں اسی وزن کے شعر اس طرح لکھے جاتے ہیں کہ آخری مصرعہ کے

---

[1] بند اردو میں اسٹانزا (STANZA) کے قائم مقام ہیں۔

سوائے ہر بند کے باقی مصرعے ایک قافیہ کے ہوتے ہیں۔ مسمط کی آٹھ ذیلی شکلیں ہیں۔ جن کے نام ہر بند کے اشعار کی تعداد کے مناسب ہوتے ہیں:۔

مثلث جس میں ہر بند کے تین مصرعے ہوں اس کی شکل یہ ہوگی:۔

ا .... ا ....

ا ....

ب .... ب ....

ا ....

ج .... ج ....

ا ....

مُربع۔ اس میں ہر بند کے چار مصرعے ہوتے ہیں۔ شکل یہ ہے:۔

ا .... ا ....

ا ....

ا ....

ب .... ب ....

ب ....

ا ....

مخمس۔ پانچ مصرعوں کا بند ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی:۔

ا .... ا ....

ا .... ا ....

ا ....

ب .... ب ....

ب .... ب ....

ا ....

مسدس - میں ہر بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے ۔ صورت یہ ہے ۔

..................ا ....ا
..................ا ....ا
..................ا
..................ا

..................ب ....ب
..................ب ....ب
..................ب
..................ا

متاخرین شعراء نے "مسدس" میں تھوڑی سی تبدیلی کرلی ہے ۔ اس کے قافیوں کی ترتیب وہ حسب ذیل رکھتے ہیں ۔

..................ا ....ا
..................ا ....ا
..................ب
..................ب

..................ج ....ج
..................ج ....ج
..................د
..................د

گویا مسدس کی اس جدید شکل میں ہر بند کے چار مصرعے ایک قافیہ کے ہوتے ہیں اور آخری دو مصرعوں کا قافیہ علحدہ ہوتا ہے ۔ اس جدت سے مسدس کی درحقیقت ایک نئی شکل ہوگئی ہے ۔ مسمط کے اصول یعنے ہر بند کے آخری مصرعے میں پہلے بند کے قافیہ کے التزام کو ترک کردینے سے مسدس میں بڑی روانی اور

زور پیدا ہوگیا ہے ۔ اور یہ اردو شاعری کی بڑی مقبول صنف بن گئی ہے ۔ انیس اور دبیر نے اپنے لازوال مرثیے اسی شکل میں لکھے ہیں ۔ حالی کا دیرپا کارنامہ "مسدس مدوجزر اسلام" بھی اسی جدید صورت پر ہے ۔

مسمط کی باقی شکلیں مسبع، مثمن، متسع اور معشر ہیں ۔ جن کے ہر بند میں علی الترتیب سات، آٹھ، نو، اور دس مصرعے ہوتے ہیں ۔ اور ہر بند کا آخری مصرعہ پہلے بند کے قافیے کے مماثل ہوتا ہے ۔ مسدس کی طرح ان شکلوں میں بھی بعض شاعروں نے ترمیم کرلی ہے ۔ ہر بند کے آخری مصرعے سے تسمیط کی قید اُڑادی ہے ۔

یہ شکلیں اردو شاعری میں شاذونادر ہی استعمال ہوتی ہیں ۔ اس لئے اُن کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے ۔

مسمط کے مضمون بھی مسلسل ہوتے ہیں موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے ۔

ترکیب بند میں بندوں کی ترکیب یہ ہوتی ہے، اس کے ہر بند میں غزل کے قافیہ کی ترتیب ملحوظ رکھی جاتی ہے ۔ اور آخر میں دو مصرعے گرہ کی طور پر علحدہ قافیہ کے لکھے جاتے ہیں ۔ بعض وقت گرہ کے شعر تمام ایک ہی قافیہ کے ہوتے ہیں، اور بعض وقت ان کے قافیہ مختلف ہوتے ہیں حالی کے ترکیب بند اس آخری شکل پر لکھے گئے ہیں ۔

ترجیع بند کی صورت بالکل ترکیب بند کی سی ہے ۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اس میں آخری یعنے گرہ کے شعر کی ہر بند میں تکرار ہوتی ہے ۔ گویا ہر غزل کے آخر میں ایک ہی شعر بار بار دہرایا جاتا ہے ۔

ان اصناف شعر کے علاوہ ایک اور شکل بھی ہے جو کبھی کبھی استعمال ہوتی ہے اس کو مستزاد کہتے ہیں ۔ غزل کے یا رباعی کے ہر مصرعے کے بعد ۔ ایک ٹکڑا زیادہ کردیا جاتا ہے، میر کی یہ رباعی مستزاد قابل مطالعہ ہے اردو شعر کی یہ شکلیں موضوع کی ضرورت سے زیادہ صوری تنوّع کی پابند ہیں ایک

ہی شکل وصورت کے شعر لکھتے لکھتے جب شاعر کی طبیعت اکتا جاتی ہے، تو وہ اپنے خیالات کو دوسرے لباس میں جلوہ گر کرنے لگتا۔ گویا صوری تنوّع کے خیال نے یہ مختلف شکلیں پیدا کردی تھیں۔ متاخرین کے تقلیدی اصرار نے انہیں معین کردیا۔ قدیم شاعر کے ذہن میں ان شکلوں کے علاوہ کوئی اور صورت شعر کہنے کی موجود نہیں تھی۔ اجتہاد، مذہبی امور کی طرح شعر میں بھی شبہ اور مذمت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن علی گڑھ کی تحریکات کے بعد سے جون جوں تعلیم، تربیت، معاشرت اور ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا ہوتی گئی، شاعری سے یہ ظاہری پابندیاں بھی کم ہوتی گئیں۔ وہ رسمی سے زیادہ شخصی، قومی اور وطنی بنتی گئی تاہم پہلے دور کے جدید شعرا نے شعر میں صوری تبدیلی بالکل نہیں کی۔ صرف ان مضامین کو رسمی قید اور پابندی سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اور اس میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں بعض اردو شاعر مغربی شاعری کی تقلید میں شعر کے نئے نئی شکلیں اختراع کر رہے ہیں۔ مولانا علی حیدر طبا طبائی نے انگریزی ترکیب بند (STANZA) کو اردو میں رائج کیا[۱]۔

موضوع اور شکل کی قید کے متعلق بعض شاعروں کا بالکل یہ نظریہ ہے۔

"فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے" (غالب)

چنانچہ اب شاعر بہت سی ایسی بحریں ایجاد کر رہے ہیں، جو زیادہ تر ہندی بحروں سے ماخوذ ہیں، ان بحروں میں ترنم کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ موضوع اور اس کی نوعیت کے مناسب بحر شعر کے لئے استعمال ہو مثلاً عاشقانہ مضامین کے لئے مترنم بحریں، اور جنگ و جدل کے واقعات کے لئے پرشکوہ بحریں وغیرہ۔ اس وقت اردو شاعری کی اصناف اور شکلوں پر دو اثرات کام کر رہے ہیں۔ ایک طرف زبان قدیم کی شاعری کی طرح پھر ہندی اثرات کو زندہ کرنے اور بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، دوسری طرف مغربی شاعری خصوصاً انگریزی شاعری کی اصناف اردو شاعری پر خاص طور سے اثر انداز ہیں۔

---

[۱] "دلگداز"، جلد نمبر بابتہ

شامِ ہجراں

از

جناب مرزا اسد اللہ بیگ صاحب حیدر

وہ وحشت خیز منظر الاماں تھا شامِ ہجراں کا
شفق وہ مطلعِ خونیں کی وہ عالم بیاباں کا

وہ حالت نزع کی ان زرد رو کرنوں پہ تھی طاری
غروبِ مہر تھا یا چرخ پر مدفن کی تیاری

اداسی ایسی چھائی تھی تماشہ گاہ عالم پر
پھریرے تھے ردائے ماتمی گویا کہ پرچم پر

یکایک پھر گیا ہر شئے پہ رنگ سوگوارانہ
کہ ہنستے ہنستے ہو غمگین صورت کوئی دیوانہ

ہوئی جاتی تھیں دھندلی آئینہ خانہ کی تصویریں
نظر کی ٹوٹ جاتی تھیں پئے نظارہ تدبیریں

دھوئیں کی طرح یوں ابر سیہ تھا آسمانوں پر
پریشاں زلف تھی دوشیزۂ دنیا کے شانوں پر

تنی مکڑی کے جالے کی طرح یوں اوس کی چادر
نظر آتا تھا گویا دھندلے شیشہ سے یہ منظر

الم انگیز سطح آب کی سنسان خاموشی
غمِ فرقت میں میرے ساتھ موجوں کی وفا کوشی

ریاضِ دہر کا ہر طایرِ شیریں نوا چپ تھا
بسیرے کو بجائے شاخِ گل بستر تھا کانٹوں کا

سکوتِ مطلق اشجارِ صحرا پر تحیر تھا
کہ یکساں جن کے شاخ و برگ پر رنگ تاثر تھا

ق

عجب مسحور کن تھی دیدۂ نرگس کی حیرانی
پریشانی سنبل پر صبا کی فتنہ سامانی

ہوائے شام چلتی تھی مگر اتنا دبے پاؤں
فلک پر ظلمتِ شب یا زمیں پر جس طرح چھاؤں

زمیں کی غرقِ استیلائے غم تھی طبع وارفتہ
کہ آمادہ تھا ٹھنڈی سانس بھرنے کے لئے رستہ

سمٹتا آ رہا تھا اک طرف سے دامنِ ہستی
پرِ پروازِ مُرغِ روح کو ہر اوج تھا پستی

طپیدہ تھی رگِ جاں تن میں کرب و درد کی صورت
پریدہ تھا غبارِ زندگانی گرد کی صورت

سکونِ بیخودی تھا قلبِ بیمارِ محبت میں
اُبھرتے آتے تھے نقشِ اجل بیکس کی صورت میں

تھے گہری سوچ میں سب ذی حیاتِ عالمِ فانی
بنی تھی خامۂ قدرت سے اک تصویرِ حیرانی

مذہب اور یورپ

از

جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب
ڈی، ایس، سی، (پیرس) اے۔ انسٹی ٹیوٹ، پی (لندن)، ڈی الیف ایچ
صدر شعبۂ سائنس، اسلامیہ کالج لاہور۔

سولھویں صدی سے قبل اہل مغرب کے قلوب انفرادی آزادی، اشتراکیت، اور مساوات وحریت کے اصولوں سے آشنا نہ تھے۔ اس دور کا نقشہ موسیو جولیس بارن اپنی کتاب[1] "تاریخ اخلاق وسیاست" کے صفحہ ۲۹ پر یوں کھینچتا ہے:-

"۱۶۸۵ء کو بمقام نانٹس ایک آرڈننس وضع ہوا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ ملک فرانس میں کوئی پروٹسٹینٹ باقی نہ رہے۔ اس قانون کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف وہی شادیاں واجب متصور ہونے لگیں جو رومن کیتھولک تعلیم کے مطابق عمل میں آئیں۔ پروٹسنٹ ازدواج سے جو اولاد پیدا ہوتی وہ ناخلف قرار دی جاتی۔ اسی دوران میں دو اور آرڈننس وضع ہوئے۔ جن کی بنا پر تنومند سپاہی پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں بھیجے گئے۔ جن کے مظالم یادگار زمانہ ہیں، انہوں نے بچوں کو ماؤں سے چھین لیا، کئی عورتوں کو جلاوطن کیا۔ کنواریوں کی عصمت دری کی اور اکثر سربرآوردگان وقت کو نظربند کر دیا......"

جس طرح مذہبی حقوق کشی عام تھی، اسی طرح تحریر وتقریر پر بھی استبداد کی مہریں لگادی گئی تھیں ۱۷۵۷ء میں ایک قانون بنایا گیا، جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ کل مصنف و مؤلف جن کی تحریر اشتعال انگیز ہو۔ پھانسی پر لٹکا دیے جائیں۔ ان کتابوں کی شدید طور پر ممانعت کی گئی جن میں حکومت پر

---

[1] M. Jules Barne :- Histoire des idees morales et politique
(Bibliotheque nationale de Paris)

نکتہ چینی مرقوم ہو۔ موریت نے اس قانون کے جواب میں "آزادی تحریر واشاعت" پر ایک مبسوط کتاب لکھی مگر جب اجازت اشاعت کے لئے اس کا مسودہ منتظم جنرل کے پاس بھیجا گیا تو اس نے حاشیہ پر یہ حروف لکھ کر مسودہ واپس کر دیا: "خفیہ انتظامیہ پر رائے دینے والا شیریں مقال شاعر ہونا چاہیئے نہ کہ ایک گمنام محرر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جب کوئی کتاب لکھی جاتی تو مصنف کو مندرجہ ذیل محکمہ جات کا خوف ہوتا:-

(۱) کونسل ملکی سے قید کا ڈر

(۲) صربان (SORBONNE) کے اعتراضات کا ڈر۔

(۳) پادریوں کی مخالفت کا ڈر۔ پادریوں کی انجمن عامہ نے "انسکلوپیڈیا" کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی اور ۱۷۷۰ء میں اس کی تین کاپیاں جو کتب فروشوں کے پاس موجود تھیں حاصل کر کے باسٹیل (BASTILLE) میں رکھ دی گئیں۔

(۴) پارلیمنٹ سے ڈگری کا ڈر۔ کوئی کتاب نہ چھپی تھی جس کو فرانس کی پارلیمنٹ نے ملعون نہ قرار دیا ہو۔

اس جبر و تشدد کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب پسند آزاد خیال فلاسفہ پیدا ہوئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ میں پاپائیت کے خلاف بالخصوص اور مذہب کے خلاف بالعموم جہاد عام کیا گیا۔ اور اکثر فلاسفہ فرنگ نے ایسے مذہب کو جہل سے موسوم کیا جس کی بنیاد فہم عام پر نہ رکھی گئی ہو۔ والٹیر۔ جان جک روسو۔ مان ٹس کیو۔ دِدرو وغیرہ حکیموں نے انسانی محبت اور آزادی خیال کی تبلیغ کی۔ لاک، ہل وتیسرس اور کوندیاک نے فلسفۂ ارتقاطبعی کی حمایت کی اور جان ہیکس، ساو آنزولا، میونھر اور بروَنو نے پاپائیت کے خلاف دھواں دھار تقاریر کیں۔

دراصل فلسفہ ارتقا طبعی کا ذکر حکیم ابن مسکویہ نے اپنے رسائل میں کیا تھا۔ جلال الدین رومی نے بھی اپنے اشعار میں اس کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ اور بارھویں صدی عیسوی میں اس مسئلہ نے عربی اور اسلامی درسگاہوں میں کافی فروغ حاصل کیا۔ مسلمان حامیانِ ارتقا نے اس کو حیوانات تک ہی محدود نہ رکھا تھا۔ بلکہ انہوں نے حیوانات کے علاوہ جمادات اور عالم بالا کے درجے اور مدارج بھی قائم کئے، ابن الصائغ نے کئی سو سال پیشتر قرطبہ کے کالجوں میں اس کی بنیاد کو استوار کیا۔ جب یورپ کے خیالات میں ہیجان پیدا ہوا تو چونکہ عیسائیوں میں پاپا اور اس کے پیرو پادریوں نے

اسلام کو ایک نہایت ڈراؤنی شکل میں پیش کیا تھا۔ اس لئے وہ بجائے اسلام کو نظر غائر سے مطالعہ کرنے کے فلسفہ ارتقا طبعی کی طرف مائل ہوئے۔

۱۸۳۵ء میں لیبنے نے انڈے کی ہیئت و اصلیت پر ایک طویل کتاب لکھی ۱۸۳۸ء میں موسیو شلائیدن نے اسی مضمون کو وسعت دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ فی الحقیقت جملہ پیدائش کی ابتدائی شکل انڈا ہے۔ اس نے کئی تجربوں سے یہ ثابت کیا کہ پودے، انسان اور حیوان اس کے پابند ہیں، یہی نہیں بلکہ اس نے ایک خاص آلہ سے انڈے میں زندگی پیدا ہونے کے اوقات و وجوہات پر تحقیق و تدقیق کی۔ ہکسلے اور ڈارون نے فلسفہ ارتقا طبعی کے اہم ترین اصولوں پر بے حد قسمت آزمائی کی اور "انسان کی پیدائش" پر دو ضخیم کتابیں لکھیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دراصل انسان بندر کی کامل ترین صورت ہے۔ جین مولر۔ کیویر۔ بیئر اور لامارک نے بھی ان خیالات کی تائید کی۔

اس طرح یورپ میں علوم ظاہری نے جذبات مذہبی پر قابو پالیا اور ضمیر، عمل، اخلاق، زندگی ہر چیز کے لئے ایسی توضیحات پیدا کی گئیں جن کی بنا فلسفہ و حکمت و تحقیقات علمی ہی۔ یہ ثابت کیا گیا کہ ذات، کمال، عمل، شخصیت، اخلاق حتیٰ کہ زندگی بجائے خود حقیقت کی غیر معتمد تعبیریں ہیں، دراصل ان تمام اوصاف کی موجد و ناصر میکانیکی قوت ہے۔ جو روز ازل سے ایک ہی کیفیت میں عمل پیرا ہے، اس میں کمی و بیشی نہیں ہوتی (CONSEWATINN OF ENEGY) زندگی، حرکت اور ہیئت، حالت توازن کا نام ہے۔ جب کسی وجہ سے اس توازن میں نقص پیدا ہوتا ہے تو زندگی موت، حرکت، سکون، ہست نیست سے متبدل ہو جاتی ہے۔ اس تحقیق علمی کی بنیاد پر بیکن اور ڈیکارٹس نے یہ کہا کہ دنیا کی حقیقی ترقی یہ ہے کہ علم ہندسہ، طبیعیات اور تحقیقات سائنس میں سر توڑ کوشش سے کام لیا جائے۔ فاراڈے نے کہا کہ ہم تحقیق سے اس قوت کو ڈھونڈھ لیں جو جملہ قوائے ظاہری و باطنی کی محرک و منظم ہے۔

حال کی تحقیقات نے فلاسفۂ غرب کو از سر نو دریائے حیرت میں ڈبو دیا ہے، حکمائے طبیعت کا قول ہے کہ مادہ کو جزئیات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور آخری جز جس میں اصل مادہ کی حقیقت و اصلیت کی جملہ صفات موجود ہوں اس کا نام سالمہ (MOLECULE) ہے یہ سالمہ بجائے خود کئی جوہر (ATOM) ہیں، پھر جوہر کے مرکز میں اثبات بھی جاگزیں ہے اور اثبات برق

کے اردگرد نفی برق کے ذرات اس طرح گھوم رہے ہیں جس طرح سورج کے گرد ستارے، نفی برق کے ذرّات کو برق پارہ (ELECTRON) کہتے ہیں۔ اس نفی و اثبات برق کو کیمیکل، مکنیکل، یا مقناطیسی ذرائع سے جدا کرنے سے "برق رواں" میسر ہوتی ہے جو ہمارے لمپ کو روشنی، کروں کو حدت پہنچانے کے علاوہ کئی دوسرے ذریعوں سے انسانی ضروریات کے کام آتی ہے۔ یہ حیرت خیز انکشافات دنیائے سائنس کے فلاسفہ کے لئے بے حد حوصلہ افزا ہیں اور محققین فرنگ اس پر آمادہ ہیں کہ خدا کی تلاش دار التجارب میں کریں۔ پروفیسر آئن سٹائن نے ایک ہندسی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر شئے کی ایک انتہا ہے۔ یعنی ہر چیز خطِ منحنی میں جا ملتی ہے، انسانی خیال، وقت، خلا، سب اسی قانون کے کارگزار ہیں، سر جیمس نے تو خدا کو "مہندس اعظم" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ فلاسفہ فرنگ باایں ہمہ قیل و قال حکمت کی کنجی سے خدائے برتر کی ہستی کا راز کھولنے سے قاصر ہیں، خود لارڈ کیلون کا قول ہے کہ "ہم ایسی قوت کو ماننے کے لئے مجبور ہیں جو جملہ قوتوں کی منتظم ہے" چند روز ہوئے پروفیسر اڈنگٹن نے "مذہب اور سائنس" کے عنوان سے لندن میں لکچر دیا جس میں کہا گیا تھا "ہماری غافل دنیا واقعات کی دنیا ہے اور اس میں کامیاب ہونے کے لئے اعتقاد اور عزم راسخ ہی کافی نہیں۔ مذہب خود مذہب کا محافظ ہے اور یہی چیز ہے جو آخر الامر حقیقی سچائی تک پہنچا سکتا ہے" اس بحث سے صاف ظاہر ہے کہ باوجود تمام تحقیق علمی کے نکتہ پروران فرنگ خدا کی ہستی کے متعلق کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ؎

از پئے ادراکِ او ہر جا کہ ہست
حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

غزل

از

حضرت صفی اورنگ آبادی

اس کی محفل ہے، نہیں ہے یہ کوئی گھر اپنا
نیک و بد آپ سمجھ لے دلِ مضطر اپنا

دل کہیں بھی نہیں ٹکتا تھا گھڑی بھر اپنا
ایسے وحشی کو کیا آپ نے کیونکر اپنا

اب چمن اور جوانانِ چمن سے کیا کام
ہے یہ اپنا دل صد پارہ گلِ تر اپنا

وہ سمجھتے ہیں کہ امید ہے اس کو ہم سے
ہم سمجھتے ہیں بھروسہ ہے خدا پر اپنا

کس کو نظّارۂ صورت سے ہے معنی مطلب
سب کی نظریں نہیں اس پر جو ہے منظر اپنا

تم سے کیا! ہم وہ کسی سے بھی نہیں کہہ سکتے
دل تڑپ جاتا ہے جس بات پہ اکثر اپنا

کچھ تو سوچو! یہ ستم کیا ہے۔ ذرا تو سمجھو!
آدمی کام کرے سوچ سمجھ کر اپنا

وہ چلا، صبر چلا، ہوش چلے، جان چلی
کیا کریں زور نہیں ہائے کسی پر اپنا

شبِ فرقت نہ ہو کیوں قدر مجھے اشکوں کی
انہیں تاروں کو سمجھتا ہوں میں زیور اپنا

وہ جو مل جائے تو پھر پرسشِ اعمال بھی ہو
دل ٹھکانے نہیں اے داورِ محشر اپنا

ہم نشیں پوچھتے ہیں رنگ تری محفل کے
ہم سے لے لیتے ہیں حصہ یہ برابر اپنا

اپنی دہلیز کے سجدے بھی اگر بار ہوے
گھر میں رکھ لیجیے اُٹھوا کے یہ پتھر اپنا

ہم کسی بزم میں کیا خاک برابر بیٹھیں
بیٹھنا یاد ہے وہ اُن کے برابر اپنا

وہ جو خاموش بھی بیٹھے تو ہمیں تڑپایا
کام کرتے رہے ہر حال میں تیور اپنا

اے صفی اس لئے آوارہ پھرا کرتا ہوں
جی بہل جائے کسی طرح گھڑی بھر اپنا

ایفائے شرط

از

(جناب محمد زکریا صاحب مائل)

شیخ احمد جس طرح اپنے قبیلہ کا ہر دلعزیز سردار تھا، اسی طرح اس کا شاداب و خوش منظر نخلستان بھی گردونواح کے تمام آباد قطعات کی ناک تھا۔ شیخ بمقابلہ اپنی ذاتی وجاہت کے اخلاقی خصوصیات میں زیادہ مشہور تھا۔ اور یہی وہ بات تھی جس نے شیخ کو نہ صرف اپنی زمینداری میں بلکہ دور دور کے قصبات میں بھی کافی سے زیادہ شہرت دے دی تھی۔ مسافروں اور اجنبیوں کے لئے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اندھوں اور لولے لنگڑوں کے لئے اس کی کوششیں مختلف صورتوں میں مصروف نظر آتی تھیں۔ وہ ہر ممکن صورت سے ان کی امداد کرتا تھا۔ اسی طرح بوڑھے اور ازکار رفتہ لوگوں کی امداد بھی اس کے فرائض میں داخل تھی۔ وہ ان کے لئے کنوئیں سے پانی بھرتا اور ان کے گھر پہنچاتا۔ غرض وہ ہمیشہ ان لوگوں کی خدمت میں سرگرم کار رہتا جو ذرا بھی اعانت کے خواہشمند نہ ہوتے۔ ان سب کے ماسوا اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے مدۃ العمر میں کبھی اپنی زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کیا تھا۔

(۲)

شیخ کچھ ایسا متمول نہ تھا کہ لوگ اس کی دولت پر حسد کرتے مگر اس کے پاس خالص عربی نسل کا ایک گھوڑا ضرور ایسا تھا کہ دور دور اس کی شہرت تھی۔ عربوں کو گھوڑے سے بہت انس ہوتا ہے اور وہ اس کے ہر عیب و ہنر سے کماحقہٗ واقف ہوتے ہیں۔ جتنی مہارت ان کو گھوڑوں کے پرکھنے اور سمجھنے میں ہوتی ہے دوسری قوموں کو اس کی آدھی بھی نہیں ہوتی۔ شیخ کے گھوڑے نے بہت سے ماہر و مشاق شہسواروں کو دور دراز مقامات سے کھینچ بلایا۔ گروہ در گروہ لوگ آتے اور شیخ کے مہمان ہو کر اس گھوڑے کو دیکھتے اور اس کی خریداری کے متعلق گفت و شنید کرتے۔ بعض اوقات بڑے بڑے ذی حیثیت زمینداروں نے بڑے اصرار کے ساتھ گراں قدر قیمتیں لگائیں۔ مگر شیخ کو یہ گھوڑا

اس قدر عزیز تھا کہ اس نے کسی کی بات منظور نہ کی اور بڑی سے بڑی رقم بھی لینا گوارا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس گھوڑے کی فکر میں رہنے لگے اور بعض نے یہ بھی ٹھان لی کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں اس پر قبضہ ضرور کر لینا چاہیئے۔

نخلستان کے قریب ہی خانہ بدوش قبائل بھی آباد تھے جن کے اخلاق کی ذمہ داری کوئی قوم بھی نہیں کر سکتی۔ ان قبائل میں ایک حسین لڑکی لیلیٰ خصوصیت سے قابل ذکر تھی جو اپنے بے مثال حسن و جمال کی بدولت گرد و نواح کے تمام نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بہت سے منچلے عرب اسے حاصل کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگانے پر تیار تھے مگر وہ اپنے ارادہ کی اتنی پکی تھی کہ کسی کا افسوں کارگر نہ ہوتا تھا۔ مگر لیلےٰ کے غریب ماں باپ دوسرے قبائل کے پر اصرار خواہشوں کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے تھے، آخر انہیں مجبور ہو کر لیلےٰ پر زور ڈالنا پڑا کہ اب تمہیں اپنے لئے کوئی مناسب جوڑا انتخاب کر لینا چاہیئے یا کوئی ایسی صورت اختیار کرنا چاہیئے کہ شادی کا پیام دینے والوں سے جو دن رات کی چقلش رہتی ہے اس سے نجات ملجائے۔

لیلےٰ بھی گھوڑے کی تعریفیں اور شیخ کے اسے جان سے عزیز رکھنے کے حالات سن سنکر اس کی بہت مشتاق ہو گئی تھی۔ جب اسے والدین نے مجبور کیا تو آخر اس نے بڑے غور و خوض کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ شادی کے خواہشمندوں کے لئے ایک شرط مقرر کر دی جائے جو اس شرط میں کامیاب ہو وہی لیلےٰ کی زوجیت کا شرف حاصل کرے۔ اور یہ شرط وہی شیخ کا گھوڑا قرار پائی۔ آس پاس سب کہیں اعلان کر دیا گیا اور تھوڑے دن کے لئے لوگوں کے ہجوم سے فرصت ملگئی۔

(۴)

لیلےٰ کے بے شمار چاہنے والوں میں قاسم سب سے زیادہ بہادر، منچلا اور حسین نوجوان تھا۔ وہ جس سرزمین میں رہتا تھا اس کی مسافت لیلےٰ کے گاؤں سے بہت تھی۔ مگر اشتیاق کے مارے ہوئے قاسم نے کسی صعوبت کی پروا نہ کی اور منزلوں سفر کرنے کے بعد خراب و خستہ حالت میں لیلےٰ کے گاؤں تک پہنچا دو چار دن ٹھہر کے شادی کی شرطیں معلوم کیں اور پھر سیدھا شیخ کے مسکن کی جانب روانہ ہو گیا۔

شیخ نے بڑے حوصلہ کے ساتھ اسے اپنے یہاں ٹھہرایا۔ ہر قسم کی تواضع مدارات سے اس کی دلجوئی کی مگر یہ بات بھی اس کے کان میں ڈالدی کہ آپ جو چاہیں حاضر ہے مگر گھوڑے کے متعلق کوئی

گفتگو نہ کی جائے۔" اور ہوا بھی یہی کہ قاسم نے ہرچند کوشش کی کہ کسی پہلو سے کسی قیمت پر شیخ گھوڑا علٰحدہ کرنے پر آمادہ ہو جائے مگر وہاں تو نہیں کے سوا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ آخر قاسم نے غلبہ عشق سے متاثر ہو کر یہ طے کر لیا کہ جائز کوششیں تو سب ختم ہو چکی ہیں اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ شیخ کو فریب دیکر گھوڑا حاصل کیا جائے کیونکہ اس کی رائے میں جنگ اور محبت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سب کچھ روا تھا

(۵)

شیخ کی عادت تھی کہ وہ روزانہ شام کو گھوڑے پر سوار ہو کر تفریح کے لئے باہر چلا جاتا تھا اور غروب آفتاب کے بعد واپس آتا تھا۔ ایک دن حسب معمول وہ تفریح کرکے واپس ہو رہا تھا کہ راستہ میں ایک آدمی سے دوچار ہوا جو سر سے پاؤں تک کمبل میں لپٹا ہوا زمین پر پڑا ہوا تھا اور نہایت دردناک آواز سے کراہ رہا تھا۔ شیخ جیسا رحمدل اور دردمند شخص، ناممکن تھا کہ ایک مصیبت زدہ انسان کو بے پوچھے چلا جاتا۔ اس نے فوراً گھوڑے کی باگ کھینچی اور اس سے پوچھا:

"تمھارا کیا حال ہے"

"میں بیمار ہوں۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور کسی قریب کے گاؤں میں پہنچا کر پناہ دیجئے۔"

شیخ فوراً گھوڑے پر سے اترا اور ہاتھوں کا سہارا دیکر اس آدمی کو گھوڑے پر بٹھایا اور خود اس کی باگ ہاتھ میں لیکر پاؤں پاؤں چلنے لگا۔

"براہ مہربانی ذرا ٹھہرئیے۔" اجنبی نے دس بارہ قدم چلکر کہا۔

"آپ میرا کمبل چھوڑ آئے ہیں، ذرا وہ لے آئیے"

شیخ نے جیسے ہی کمبل لانے کے لئے باگ چھوڑی، اجنبی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور روانہ ہو گیا۔ شیخ نے مڑکر دیکھا تو حریف کا داؤں چل چکا تھا اور تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ یہ قاسم تھا! قاسم نے تھوڑے فاصلہ پر پہنچکر بلند آواز سے کہا "شیخ صاحب خدا حافظ! میں اپنا کام کر چکا آپ نے دیکھا۔ کس طرح میں نے وہ گھوڑا حاصل کر لیا جس کے دینے پر آپ نے ذرا بھی آمادگی ظاہر نہ کی تھی۔"

"صرف ایک بات" گھوڑا اڑھانے سے پہلے سن لیجئے

"ہاں وہیں سے کہئے، فوراً کہئے" قاسم نے کہا

"صرف ایک بات، اگر آپ ماننے کا وعدہ کریں تو مجھے اپنے نقصان کا کوئی ملال نہ ہوگا، یعنی اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ یہ گھوڑا کیونکر حاصل کیا تو خدا کے لئے یہ ہرگز نہ کہنا کہ میں نے فریب دیکر حاصل کیا ہے یہ اسلام کے پاک وصاف دامن پر ایک بدنما دھبہ ہوگا اور اس سے مسلمان بدنام ہونگے۔

شیخ کے ان الفاظ میں خدا جانے کیسا جادو بھرا تھا کہ قاسم تمناؤں کا مارا نوجوان قاسم تھر تھر کانپنے لگا اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ اس پر سخت ندامت طاری ہوئی اور اس نے دفعتاً گھوڑا شیخ کی طرف بڑھا کر کہا۔ "لیجئے جناب یہ آپ کا گھوڑا آپ کو مبارک رہے۔ میں بھی مسلمان ہوں اور اسلام کا کوئی شریف فرزند اپنے مذہب کو بدنام کرنے کے لئے دانستہ ایسی حرکت کا ہرگز مرتکب نہ ہوگا۔" اس کے بعد شیخ نے ہرچند قاسم کو روکنے کی کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سنی اور نہایت تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتا جنگل میں کسی طرف نکل گیا۔

(۶)

دنیا میں جہاں اور بلائیں بنی نوع انسان پر مسلط رہتی ہیں، انہی میں ایک محبت بھی ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری بلاؤں کا احساس بھی بلا ہوتا ہے اور محبت کے احساس میں یہ بات نہیں بلکہ جس خوش نصیب پر یہ لطیف نشہ مسلط ہوتا ہے، اس کی لذیذ ترین کیفیات اسی سے پوچھنے اور سننے کے قابل ہوتی ہیں۔ دوسرے اس کی مصیبت کو مصیبت اور جنون سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ اس میں بدرجہا لطف و راحت محسوس کرتا ہے۔ "قاسم نے محبت کے جوش میں آئین مروت کے خلاف جو اقدام کیا تھا، اس میں اس کی کامیابی یقینی تھی مگر وہ فوراً چونک اٹھا گویا فطرت نے خود اس کی رہنمائی کی اور اس نے قبضہ میں آیا ہوا گوہر مقصود ہاتھ سے دے دیا تاہم وہ خوش تھا اور اپنی اس ناکامی کو عین کامیابی سمجھکر نہایت مردانگی کے ساتھ یاس و نامرادی کے جانکاہ صدمے جھیلنے پر تیار تھا۔ لیکن قاسم کی اس عجیب جستار اور پھر اس حیرتناک ایثار کی شہرت دور دور پھیل چکی تھی۔ جو سنتا تھا وہ بے اختیار قاسم کا مداح ہوجاتا۔ لیلے کے کان بھی اس اہم واقعہ سے ناآشنا نہ تھے۔ اس نے بھی سنا اور نہایت گہرے تاثر کے ساتھ سنا یہاں تک کہ آخر اُس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر کے والدین سے تذکرہ کیا اور کہا "جہاں تک میں غور کرسکی ہوں، میرے نزدیک اب شرط پوری ہوچکی"

کیوں۔ کس طرح اور کس نے پوری کی؟

شرماکر" قاسم نے" اور وہ اس طرح کہ شیخ سے گھوڑا لے لیا اور پھر بہایت دلاوری کے ساتھ واپس کردیا اور میرے نزدیک شرط کی غایت یہی ہونا چاہیئے کہ لوگوں کی جرأت اور اخلاق کا معیار بھی معلوم ہو جائے جواب ہو گیا" لیلےٰ کے والد کے لئے اتنا اشارہ بہت تھا اس نے بھی مٹی کے خیال کی تعریف کی اور فوراً اپنے آدمی قاسم کے گاوں میں روانہ کرکے اسے بلوایا اور بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ لیلےٰ کو بیاہ کر قاسم کے ساتھ رخصت کر دیا۔ عین اس وقت جبکہ قاسم روانگی کے لئے تیار تھا شیخ احمد اپنے عزیز گھوڑے پر سوار لیلےٰ کے دروازہ پر آکر رکا اور اپنے قاسم سے بغلگیر ہو کر شادی کی مبارکباد دی اور اپنے گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں دیکر کہا کہ یہ شریف جانور تم ہی جیسے شریف و عالی ہمت نوجوان کا حق ہے اس لئے میں نہایت خوشی بلکہ آرزوں کے ساتھ اسے تمہارے سپرد کرتا ہوں اور اگر تم نے قبول کر لیا تو اس کو اپنی ان تمام تکالیف کی تلافی سمجھ لونگا جو میں نے انکے تمہاری جستجو میں اٹھائی ہیں۔

نشاطِ روح

از

جناب محمد جمیل احمد خان صاحب کوکبؔ شاہجہانپوری

اہلِ ہوس کی تنگیٔ دل ما و من میں تھی — دُنیا فریبِ لذّتِ کام و دہن میں تھی

گلچیں کا خوف اور نہ اندیشۂ خزاں — یعنی نمود فطرتِ اہلِ چمن میں تھی

برباد کر دیا دلِ آوارہ گرد نے — ورنہ نشاطِ روح تو اُس انجمن میں تھی

ظاہر پرست اہلِ خرد کچھ کہیں مگر — معراج مستِ عشق تو دار و رسن میں تھی

اب تک وہی ہیں تارِ رگِ جاں کی جنبشیں — کیا بات لحنِ شاہدِ شیریں سخن میں تھی

کس طرح برقرار رہے گا جو رنگ ہے — وہ بات اب کہاں جو دلِ پُر محن میں تھی

گو حاصلِ کشاکشِ باہم تھا آئینہ — کیا کیجیے کہ لذّت دلِ ما و من میں تھی

محرومیوں میں اپنی نظر کا قصور تھا — ورنہ نمودِ حُسن تو ہر پیرہن میں تھی

کوکبؔ تمام عمر کٹی اضطراب میں

آشفتگی وہ عرصۂ دار الفتن میں تھی

صوتیاتی تحقیقات

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور - ام، اے، پی ایچ، ڈی (لندن)
پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ

صوتیات اس علم کو کہتے ہیں جس میں زبانوں کے صوتی آغاز و ارتقا، تغیر و تبدل اور خاصکر لب و لہجہ کی نسبت نظری اور عملی دونوں طریقوں سے تحقیق و تفتیش کی جاتی ہے۔ علم لسانیات کی یہ ایک نہایت اہم اور جدید شاخ ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر ان بحثوں سے ہے جو ظاہر کرتی ہیں کہ کس طرح حروف اپنے مخارج سے ادا ہوتے ہیں، اور کیونکر ایسی ترتیب پاتے ہیں جو لفظوں اور جملوں کی تشکیل کرتی ہے۔ اس کے علاوہ نطقی آوازوں کی لمبائی یا حرکت، آواز کا موسیقیانہ مدوجزر اور کانوں پر ملفوظ حروف اور جملوں کا جو اثر پڑتا ہے ان سب کی تشریح و تجزیہ کرنا بھی صوتیات ہی سے متعلق ہے

(۲)

صوتیات کے علمی فائدے متعدد ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ ملکوں میں اس علم سے جن علمی و عملی فضاؤں میں کام لیا جا رہا ہے اُن کی ایک مختصر فہرست یہ ہے۔

(۱) غیر زبانوں کا سیکھنا یا سکھانا۔

(۲) مادری زبان کا سیکھنا۔

(۳) اپنی زبان کی متفرق شاخوں اور بولیوں کی تحقیق و تفتیش۔

(۴) انفرادی نطقی نقائص کو دور کرنا۔

(۵) بہروں کو گفتگو سکھانا۔

(۶) اُن زبانوں کے لئے جو اب تک نہیں لکھی گئیں حروف تہجی تیار کرنا۔

(۷) خاص خاص ضرورتوں (مثلاً مختصر نویسی، اندھوں کے حروف تہجی، اور ٹیلگرافی کے اشاروں

وغیرہ) کے لئے طریقہ تحریر ایجاد کرنا۔

(۸) نظم اور اس کی بحروں کی خاصیت کا سائنٹفک تجزیہ۔

(۹) زبانوں کے موجودہ رسم الخط کے نقائص دور کرنا۔

(۱۰) لسانیات۔

مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ اس مختصر مضمون میں صوتیات کے ان تمام عملی فائدوں پر نظر ڈالی جائے اس وقت اس کے صرف ایک اہم پہلو یعنے زبانوں کے سیکھنے سکھانے اور مادری زبان کی صوتی تنقیح و تجزیہ کی نسبت عام معلومات پیش کئے جائیں گے۔ تاکہ ادب اُردو کے طلبہ اور ہماری زبان کے لسانی پہلوؤں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس فن کے طریقہ کار اور عملی فوائد کی اہمیت سے واقف ہوسکیں۔

(۳)

عہد حاضر میں سیاسی ہلچل کی وجہ سے ہندوستان میں زبانوں کا مسئلہ بھی زیر بحث آگیا ہے۔ اور نہ صرف صوبجات کی تقسیم لسانی عناصر کی بنا پر کی جارہی ہے بلکہ تمام ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان قرار دینے کی اہمیت بھی تسلیم کرلی گئی ہے۔ اس کے علاوہ خود ہماری ریاست ابد مدت میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور عہدہ داروں کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ریاست کی سرکاری زبان کے علاوہ ان دیسی بولیوں (مثلاً مرہٹی، تلنگی اور کنڑی وغیرہ) سے بھی واقف رہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ وہ زمانہ دور نہیں ہے جب کہ صوتیاتی اصولوں اور عملی طریقہ کار سے مدد لینے کی طرف توجہ کی جائے گی۔

ان معاشی اور سیاسی ضرورتوں کے علاوہ خود اردو زبان کے بہت سے لسانی مسائل تحقیق و تجزیہ طلب ہیں۔ رسم الخط کا جھگڑا سایہ کی طرح ساتھ ساتھ لگا ہوا ہے۔ مختلف بولیوں کے صوتی اختلافات ابھی تک بحث طلب ہیں۔ اور ان سب سے جُدا ایک اور چیز ہے جس کے بدنما داغ دھونے کے لئے دولت آصفیہ کا بہت کچھ حصہ پانی کی طرح بہہ چکا ہے۔ یہ نستعلیق ٹائپ کا مسئلہ ہے اور ان سب امور کا کماحقہٗ تصفیہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ صوتیاتی تحقیقات سے مدد نہ لیجائے۔

(۴)

غیر زبان کا اچھی طرح سے سمجھنا اور صحیح طور پر بولنا صوتیات کی مدد کے بغیر نہایت مشکل ہے۔

عام زبان سیکھنے والے اس وقت تک صحیح تلفظ نہیں کر سکتے جب تک کہ اس زبان کا **صوتی تجزیہ** نہ ہو چکا ہو۔ اور جب تک کہ طالب علم نے **صوتیاتی تربیت** نہ حاصل کی ہو۔

صوتی تجزیہ سے مراد یہ ہے کہ اس نطقی عمل کا تعین کیا جائے جس کی وجہ سے زبان کی ہر آواز ظاہر ہوتی ہے اور زبان کی وہ خصوصیت مقرر کردی جائے جس کا تعلق صرف حروف و اصوات کی لمبائی، حرکت، اور لہجہ سے ہو۔

صوتیاتی تربیت سے مراد یہ ہے کہ ۱۔ قوت سامعہ کی تربیت کی جائے۔ ۲۔ مخرجِ اعضا سے مشق کرایا جائے۔ ۳۔ مسلسل گفتگو میں صحیح آواز کا صحیح موقعہ پر استعمال کرنا بتایا جائے۔ اور ۴۔ مسلسل گفتگو کی آوازوں اور حروف کو صحیح لمبائی، حرکت اور لہجہ کے ساتھ ادا کرنا سکھایا جائے۔

(۵)

ہمارے ملک میں زبانوں کی تحصیل کی طرف کچھ کم توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ کوئی مدرسہ ایسا نہ ہوگا جہاں ایک سے زیادہ زبانیں نہیں پڑھائی جاتیں۔ لیکن ایسے کتنے استاد ہیں جو زبان پڑھانے اور سکھانے کے صحیح معنوں میں اہل ہیں؟ عربی، فارسی، مرہٹی، تلنگی وغیرہ زبانیں سکھانے اور پڑھانے کے لئے سرکار نے ہر درسگاہ میں استاد مقرر کئے ہیں لیکن کیا کسی استاد کو اس امر کا موقع ملا ہے یا دیا گیا ہے کہ وہ اس خاص زبان کے لسانی اور صوتی پہلو کا علم اور تربیت حاصل کرے؟

سرکار کا موقع دینا تو کجا، زبانوں کے ایسے کتنے اساتذہ ہیں جنہیں اپنی اس کمی کا احساس ہے احساس ہونا تو ایک طرف میں تو سمجھتا ہوں کہ اُن میں سے کئی ایسے ہوں گے جو یہ مضمون پڑھنے کے بعد بھی صوتیاتی تربیت کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکیں گے۔

ایک دفعہ انگلستان کے اساتذہ کو مخاطب کر کے مشہور ماہر **تعلیم المعلمین بنجامن ڈمویل** نے کہا تھا کہ:-

"صوتیات سے واقفیت استاد کے لئے جس درجہ اہم اور مفید ہے وہ اسی وقت اُستاد پر ظاہر ہو سکتی ہے جب کہ اُس نے اُس کو حاصل کر لیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے حضرات جو اس سائنس سے ناواقف ہیں خود کو اس کی علمی قدر و قیمت کے منکر بتاتے ہیں۔ یہ مشکل اس واقعہ سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ حضرات

سقراط کے مخالفین کی طرح ۔۔۔ اکثر اپنی جہالت سے ناواقف رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں صوتیات سے بہت کچھ واقفیت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ جانتے ہیں وہ البتہ زیادہ مفید نہیں۔
بدقسمتی سے یہ حضرات اکثر وہ ہوتے ہیں جن کی رائے دوسرے معاملات میں قابل وقعت ہوتی ہے۔ اور عوام کے عقیدے کا یہ رجحان ہوتا ہے کہ چونکہ ایک شخص ایک شعبہ میں اچھا ہے اس لئے دوسرے معاملات میں بھی اس کی رائے کی عزت کرنی چاہیئے۔" (دیکھو کتاب سائنس آف اسپیچ صفحہ اول)

(۶)

اُردو زبان کا صوتیاتی تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا۔ پیرس یونیورسٹی کے مشہور ماہر لسانیات اور میرے محترم اُستاد پروفیسر ڈاکٹر جیولس بلوک نے میری انگریزی کتاب "ہندوستانی صوتیات" پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں اس قابل افسوس واقعہ پر نہایت حیرت کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ خاص طور پر قابل تعجب ہے کہ 'ہندوستانی' جو تمام دنیا میں دیگر السنہ ہند کے مقابلہ میں سب سے زیادہ موضوع بحث وتحقیق بنی ہوئی ہے، اس قسم کے (یعنے صوتیاتی) تجزیہ وتشریح سے محروم رہے۔ تلفظ پر متعدد دفعہ اور اکثر قابلیت کے ساتھ اشارے کئے گئے تھے۔ مگر اس موضوع پر بحثیت مجموعی نظر نہیں ڈالی گئی حالانکہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے نہ صرف علمی مقاصد کے تحت بلکہ ماہرین لسانیات اور طلبۂ علم السنہ کے فائدہ کے لئے بھی۔" (دیکھو کتاب ہندوستانی فونیٹکس صفحہ ۵)
اس کے بعد انہوں نے چند جملے لکھے ہیں جن میں کمال مہربانی اور قدر افزائی فرمائی ہے پھر معملی تجربوں اور آلوں کے ذریعہ سے صوتیاتی تحقیقات کرنے میں جو فائدے مضمر ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ اس مضمون کی ترتیب کا بیشتر مقصد یہی ہے کہ اس نوع کی صوتیاتی تحقیق کو اُردو دانوں میں روشناس کراؤں اس لئے پروفیسر بلوک کی چند سطروں کا مفہوم یہاں اپنی زبان میں درج کرتا ہوں

(۷)

اس قسم کا طریقہ تحقیق نہایت ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلے کان یا قوت سامعہ کی تربیت کرنی چاہیئے۔ جو شخص اپنی بولی کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے اس میں ہونٹوں، زبان اور سانس وغیرہ کے تغیر و تبدل کا نہایت نفیس احساس پیدا ہوجانا چاہیئے۔ مگر بہتر سے بہتر تربیت یافتہ کان ایک ایسے شخص کا بھی ہوسکتا ہے جس میں کوئی مخصوص لسانی عصبیت ہو، یا جس میں توجہ، حافظہ یا معلومات کا فقدان ہو۔ اس لئے تالو کے نقشے یا لہویہ نگار (PALATOGRAM) فوٹو، فونوگرام اور استوانے (DRUMS) (جن پر آواز کا لہراو مندمج ہوکر آوازوں کی لمبائی، نفسیت، اور دیگر اجزا کا نہایت صحیح اور نفیس علم بخشتا ہے) ہر زبان اور ہر شخص کی نطقی خصوصیات کے ناپنے اور معین کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان ذریعوں سے جو نتیجے حاصل ہوتے ہیں وہ مستقل ہوتے ہیں اور محفوظ رکھے جاسکتے ہیں تاکہ کسی وقت بھی اسی قسم کے دوسرے نتیجوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جاسکے۔ اس طریقہ کار سے نظری غور و فکر کے بعد جو رائے قایم کی گئی ہو اس کی تنقیح کی جاسکتی ہے اور انفرادی اور سہوی غلطیاں پکڑی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ معملی تجربوں کے نتایج نئی باتیں معلوم کراتے ہیں اور نئے نئے مسائل اور نظریے بھی پیش کرتے ہیں۔

(۸)

اردو زبان کی آوازوں پر بحث کرتے وقت سب سے پہلے حروف علت کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے اس قسم کی کوشش ہمارے یہاں شاید ایک دو صاحبوں نے پہلے بھی کی تھی۔ مگر صرف نظری حد تک اور وہ بھی اصلیت سے بہت دور تھی۔ استوانوں پر آواز کے لہراؤ کا انضباط اور تالو کے نقشے عملی طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ کونسی آواز کسقدر لمبی ہے، اس کے تلفظ کرنے میں مقابلتہً کتنی دیر لگتی ہے؟ اس کا مخرج کیا ہے؟ اور اس کے بولتے وقت زبان منہ میں کن کن حصوں سے مس کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک لفظ ادا کو لیجئے۔ اس میں حرف صحیح د۔ کے آگے اور پیچھے دونوں طرف الف ہے۔ ان دونوں الفوں کے آپس میں فنی حیثیت سے جو فرق ہے صرف استوانے کے منضبطہ لہراؤ ہی سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ جس کے لئے دیکھیے شکل نمبر۔ ۱۔

اسی طرح سے تمام آوازوں کا لہراؤ اور تالو کے نقشے تیار کرنے کے بعد اردو حروف

شکل نمبر — ۱

اداا — ابتدائی اور آخری الف کی لمبائی کا مقابلہ۔

شکل نمبر — ۲
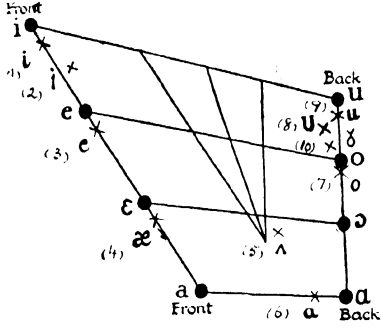
اردو حروف علت — یہ شکل ظاہر کرتی ہے کہ اردو حروف علت کے بولتے وقت زبان کیا حالت اختیار کرتی ہے۔ تفصیل بلحاظ اعداد یہ ہے۔ ۱-ی جیسے دہلی- ۲ — جیسے ملا ۳-ے جیسے کھیل ۴-ئے جیسے بھینس ۵ — جیسے سب ۶-ا جیسے اگور ۷-و جیسے تول ۸ — جیسے کھلا ۹-ؤ جیسے مورت -

شکل نمبر — ۳

جم-بجا-بج-ابتدائی درمیانی اور آخری حرف صحیح ج کہنے کے لئے زبان تالو کو جہاں تو کرتی ہے اسکا مقابلہ۔
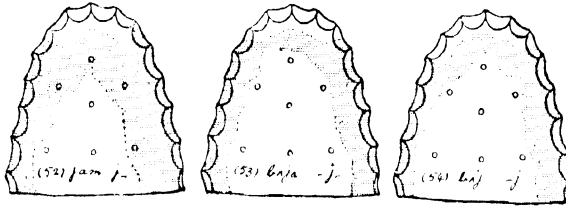
شکل نمبر — ۴

نام - منا - من-ابتدائی درمیانی اور آخری حرف صحیح ن کہنے کے لئے زبان تالو کو جہاں تو کرتی ہے اسکا مقابلہ
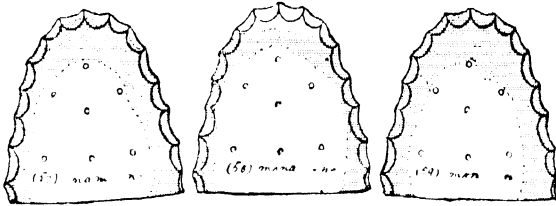
شکل نمبر — ۵

سب۔ بسا-بس-ابتدائی درمیانی اور آخری حرف صحیح س کہنے کے لئے زبان تالو کو جہان ترکرتی ہے اسکا مقابلہ۔
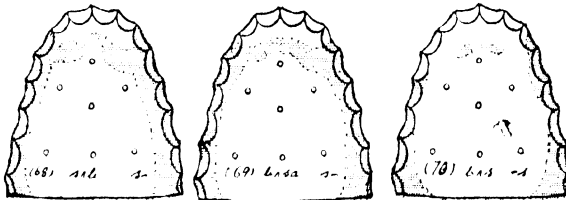
شکل نمبر — ۶

رام -

یہ اور اس کے بعد کی دو شکلیں حرف صحیح - ر - کی ابتدائی درمیانی اور آخری حیثیت ظاہر کرتی ہیں -

شکل نمبر — ۷

مرا -

شکل نمبر — ۸

مار -

شکل نمبر — ۹

رام - مرا - مار

ابتدائی درمیانی اور آخری حرف صحیح کہنے کے لئے زبان تالو کو جہان ترکرتی ہے اسکا مقابلہ -
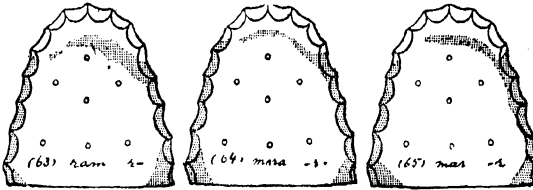
شکل نمبر — ۱۰

تمہیں -

بالائی خط نون غنہ کی آواز ظاہر کرتا ہے۔ اور زیرین خط کے متوازی حروف کی انفی خاصیت کا اظہار کرتا ہے -
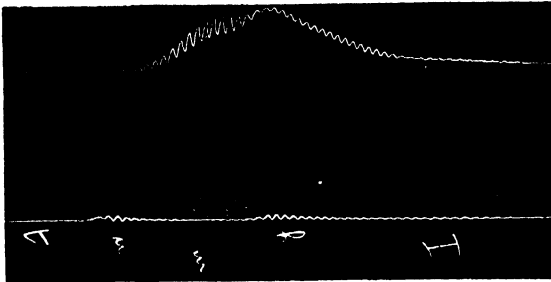
علت کا تجزیہ اور تقسیم کی گئی ہے اس کا فنی اندراج شکل نمبر ۲ میں دکھلایا گیا ہے ۔ یہ شکل ظاہر کرتی ہے کہ کسی حرف علت کے لئے زبان کیا حالت اختیار کرتی ہے ۔ مثلاً لفظ دہلی کی ۔ی ۔ کہنے کے لئے زبان بالکل آگے کی طرف اور اوپر کو بڑھ آتی ہے ۔ اور آگرہ کے الف کے لئے بالکل پیچھے اور نشیب میں چلی جاتی ہے ۔

اردو حروف علت کی شکل میں گول نقطے ظاہر کرتے ہیں کہ اصولی حروف علت کیا ہو سکتے ہیں اور چلیپے ظاہر کرتے ہیں کہ اُردو حروف علت اُن کے مقابلہ میں کس طرح ملفوظ ہوتے ہیں اصولی حروف علت سے مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کے حروف علت کو مدنظر رکھتے ہوے زبان زیادہ سے زیادہ کس نقطے تک بلند ہو سکتی ہے ۔ اسی نقطۂ انتہائی کو اصولی حرف علت کا نقطہ قرار دے لیا گیا ہے ۔ اور یہ میرے مکرم استاد پروفیسر ڈینیل جونس صدر شعبۂ صوتیات یونیورسٹی کالج لندن اور " معتمد بین الاقوامی مجلس صوتیات " کی ایجاد ہے ۔

(۹)

حروف صحیح کے ذکر میں اس امر کی طرف اشارہ کرنا اس چھوٹے سے ابتدائی مضمون میں شاید دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ایک ہی حرف صحیح مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے ادا ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر آپ کسی ایک حرف کو لفظ کی ابتدا ، درمیان اور آخر میں رکھ کر دیکھئے ۔ اور مصنوعی تالو (جو صوتیاتی تحقیقات کے لئے خاص طرح سے تیار کی جاتی ہے اور ہر طالب علم کے یہاں موجود رہتی ہے) منہ میں رکھ کر اُن تینوں لفظوں کو ایک ایک وقت کہئے جن میں کوئی ایک ہی لفظ ابتدا ، درمیان اور آخر میں آیا ہو ۔ جو نتیجہ برآمد ہوگا اس کے مطالعہ سے آپ حیران ہو جائیں گے !

مثال کے لئے میں اس مضمون میں تین حروف صحیح یعنے (۱) ج (۲) ن اور (۳) س کے لمو یہ نگار یعنے مصنوعی تالو کے نقشے پیش کرتا ہوں ۔ دیکھو شکل نمبر ۳ - ۴ - اور ۵ آپ معلوم کریں گے کہ لفظ جم ، یا نم یا سب کہتے وقت زبان تالو کے جس حصہ کو تر کرتی ہے بعینہٖ اُسی حصہ کو لفظ بجا ، امنا ، یا بسا کہتے وقت نہیں کرتی ۔ حالانکہ دونوں جگہ حروف ج ، ن ، اور س ہی کے لئے زبان کا عمل منقوش ہے ۔ مگر فرق یہ ہے کہ پہلے لفظوں میں یہ حروف ابتدائی حالت میں آتے ہیں ۔ اور دوسرے میں درمیانی حالت میں

اسی طرح ابتدائی اور درمیانی حالت کے حروف کا آخری حالت کے الفاظ یعنی بج، من یا بس کی ج، ن یا س سے کیا جائے تو واقف فن کے لئے کئی بصیرت افروز نتیجے پیش کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

(۱۰)

کارآمد نتیجے اخذ کرنے کے لئے صرف لہو یہ نگاروں ہی سے نہیں بلکہ اُستوانے کے انہی الفاظ کے لہراوی نقوش بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔ مثلاً الفاظ رام، مرا اور مارمیں لفظ رکی تینوں حیثیتوں پر غور کرنا ہو، اور ساتھ ہی درمیانی حروف علت سے ان پر جو اثر مترتب ہوتا ہے اُس کو ملحوظ رکھنا ہو تو شکل نمبر ۶، ۷، ۸ اور ۹ ملاحظہ فرمائیے۔

آخر میں ایک اور دلچسپ مگر اہم صوتی خصوصیت کی طرف اشارہ کردینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اردو زبان میں بہت سے حروف ایسے ہیں جو لکھے تو جاتے ہیں لیکن ان کا تلفظ وہ نہیں ہوتا جو ان حرفوں کا ہونا چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر حرف کی آواز مابعد کے حرف کی آواز سے متاثر ہوتی ہوتی ہے۔ یہ اثر زیادہ نہیں ہوتا اگر مصیت (VOICED) آواز کے بعد مصیت اور غیر مصیت (UNVOICED) کے بعد غیر مصیت آواز ہی آئے۔ لیکن اگر غیر مصیت کے بعد مصیت آجائے تو پہلی آواز میں بھی مصیتی خصوصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مثلاً اردو الفاظ اکبر، اخبار اور رات دن پر غور کیجئے۔ ان میں ک، خ اور ت غیر مصیت ہیں۔ اور ان کے بعد ہی کے حروف ب اور د مصیت۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ک خ اور ت تینوں پر مصیتی اثر محیط ہو جاتا ہے۔ وہ قریب قریب گ، غ اور د بن جاتے ہیں۔ اور اگر ہم اَک، اَخ، اور رات کہکر تھوڑی دیر وقفہ نہ کریں تو یہ الفاظ اگبر، اغبار، اور راد دن جیسی آواز دینے لگتے ہیں۔

اس عمل کو ادغام (ASSIMILATION) کہتے ہیں۔ یعنے ایک آواز کا دوسری آواز سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہونا یا دوسری میں ضم ہو جانا۔

(۱۱)

اسی سلسلہ میں ایک اور امر کا اظہار کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اُردو کی انفی آوازوں

اب تک کوئی تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ یہ نہایت دلچسپ مسئلہ ہے۔ شکل نمبر ۱۰ کا مطالعہ واضح کرے گا کہ اس میں دو خطوط دکھلائے گئے ہیں۔ اوپر کا خط انفی آواز سے متعلق ہے یعنے وہ ناک سے نکلی ہوئی آواز کا اندراج ہے۔ دوسرا خط مونہ کے مخرجی عمل کا اندراج ہے۔ یہ دونوں خطوط ایک ہی ساتھ اُستوانے پر منقوش کئے گئے ہیں۔ یعنے لفظ تمہیں کہتے وقت مونہ اور ناک دونوں پر اُن نلیوں کے سرے رکھے گئے تھے جو آلہ تک جاکر قلموں کے ذریعہ سے گردش کرتے ہوے استوانے پر نقش ڈالتے ہیں

یہ نقوش جہاں اُردو حرف م کی انفی شدت ظاہر کرتے ہیں یہ انکشاف بھی بخشتے ہیں کہ اُردو حرف ہ بھی انفی ہوسکتا ہے۔ یعنے جہاں اردو زبان میں ہ کی سادہ آواز موجود ہے ساتھ ہی انفی آواز بھی ہے۔ ماہرینِ صوتیات کے لئے یہ انکشاف خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کی اہمیت وہی سمجھ سکتے ہیں جو لسانی دلچسپی رکھتے ہیں اور کسی زبان کے صوتی تجزیہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

بادل

از

جناب عزیز احمد صاحب عزیز کلیہ جامعہ عثمانیہ

سکوت شب میں اے بادل گرج کر کہہ گیا کیا کیا؟ مظالم نو فلک کی شورشوں کے سہہ گیا کیا کیا؟
کہ آنکھوں سے تری اشکوں کا اک طوفان اُبل نکلا ترے اشکوں کے طوفان میں بتا سچ بہہ گیا کیا کیا؟

کہ آہیں کچھ ترے سینے سے نکلیں بجلیاں ہوکر
گریں دہقاں کے خرمن پر چلیں سوز نہاں ہوکر

تعطیل

(ایک ایکٹ کا ایک فارس)

از جناب عزیز احمد صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

(منظر:۔ ناصر کے مکان کا ایک کمرہ۔ بیچ میں ایک میز۔ میز پر چند کتابیں۔ آس پاس کچھ کرسیاں اور ایک آرام کرسی)

ناصر۔ کوئی ہے؟

ملازم (اندر سے) جی حضور

ناصر اِدھر آؤ (ملازم آتا ہے) دیکھو اگر کوئی ملنے کو آئے تو کہدینا میں گھر پر نہیں ہوں۔ آیا سمجھ میں؟ کہیں یہ نہ کہہ دینا کہ خود میں نے کہا ہے کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ .... سمجھے یا نہیں؟

ملازم جی آگیا سمجھ میں۔

ناصر اچھا تو جاؤ (ملازم جانیکے لئے مڑتا ہے کہ اتنے میں ناصر کا دوست شہباز اندر آتا ہے)

ملازم (روکتے ہوئے) ایں ایں آپ ناحق آرہے ہیں سرکار تشریف نہیں رکھتے۔

شہباز احمق، نالایق، بیوقوف۔ کیا تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ کیا بیٹھے ہوئے ہیں۔

ملازم انہوں نے خود مجھ سے کہا ہے کہ گھر پر نہیں ہیں۔ اب وہ جھوٹے اور آپ سچے تو لعنت ہے آپ کے ایسے دوستوں پر۔ اگر آپ کو سرکار یہاں نظر آرہے ہیں تو سمجھئے کہ اندھیری رات میں سورج دکھائی دے رہا ہے (جاتا ہے۔ ناصر ہنستا ہے)

شہباز اجی کیا کھنچے لگا رہے ہو۔ اس قدر بدتمیز اور بے سلیقہ نوکر تو قرۂ ارض پر کہیں نظر نہیں آتے۔ قسم خدا کی۔ آیا آپ کے قیال شریف میں ...... اگر آپ خود تشریف نہیں رکھتے تو کیا یہ آپ کا بھوت ہے یا کہ پریت ہے۔

ناصر اچھا اچھا بیٹھیے میر صاحب آپ تو آتے ہی گرم ہوگئے۔ مزاج شریف؟

شہباز قیریت سب قیریت۔ اور کوئی تازہ قیر

ناصر اس اثنا میں تو کوئی شخص مرا نہیں ۔ آپ قبر کس کی تعمیر کر رہے ہیں ؟
شہباز خبر نہیں بھائی قبر میں یہ نہیں پوچھتا کہ کون مرا اور کس کی خبر بنائی گئی ۔ میرا قصد یہ ہے کہ اخبار میں تازہ قبر کون سی تھی کوئی قاص بات ؟
ناصر کوئی خاص بات نہیں ۔
شہباز ۔ اس وقت آپ کیا پڑھ رہے تھے ؟
ناصر جی یونہی دیوان غالب کی ورق گردانی کر رہا تھا ۔
شہباز سبحان اللہ ۔ کیا کہنا ۔ کیا پاکیزہ کلام ہے ۔ یہ تو غالباً غالب ہی کا شعر ہے نا ؟ (گاکر)

وہ مرے اعمال روز و شب سے واقف ہے امیر   پیش خالق ادّعائے بے گناہی کیا کروں

(ناصر کے ایک دوست مرزا خرّم علی بیگ اندر داخل ہوتے ہیں)

خرم اجی آداب عرض ہے قبلہ ۔ اور مولوی شہباز صاحب بھی یہیں تشریف بگھار رہے ہیں ۔
شہباز ۔ آپ بھی طریخ تمدّن کی ترخی سے نا آشنا ہیں انگرکھا پہنکر خواہ مخواہ آنیکی کیا ضرورت تھی ؟
ناصر واقعی مرزا صاحب اس وقت آپ مرزا چھوب بیگ ستم ظریف معلوم ہو رہے ہیں ۔ (ناصر کے دو اور دوست داخل ہوتے ہیں اور کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

خرم آپ کا اسم شریف ۔
ایک اجی مجھے حیدر کرار کہتے ہیں ۔
خرم اور آپ کا اسم شریف ؟
دوسرا جی مجھے صفدر جرار کہتے ہیں ۔
حیدر جی صاحب سب کا نام تو آپ پوچھ چکے اپنا اسم شریف تو بتائیے ۔
خرم جی اس خاکسار کو پاک پروردگار کہتے ہیں ۔
شہباز ارے یہ بھی کوئی مذاخ ہے .... بھئی خدا کا تو خوف کرو (قرارت سے) لاحول ولاقوۃ الا باللہ ــ نعوذ باللہ من الذالک
حیدر ۔ (شہباز کی طرف اشارہ کرکے) اور آپ کی تعریف ؟
خرم جی آپ بھی ہفت عجائب عالم میں سے ایک ہیں ۔

ناصر۔ دیکھ رہے ہیں میر صاحب یہ سب لوگ آپ کو بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

خرم۔ جی میر صاحب کو تو خدا نے اپنے دست خاص سے بنایا ہے۔ کسی انسان کی کیا بساط کہ آپ کو بنائے ناصر صاحب اس وقت آپ کی زبان سے کفر کا کلمہ نکلا ہے تو یہ کیجئے۔ چار رکعت نماز ادا کیجئے صدقہ اتاریئے اور صدقے کی مٹھائی ہم سب کو کھلایئے۔ تب کہیں ہم اللہ میاں سے کہہ سن آپ کا قصور معاف کروائیں گے ورنہ یاد رکھئے کہ جہنم میں ستر ہزار برس تک جلتے رہیئے گا

ناصر درست۔ لیکن آپ جہنم کے داروغہ کب سے بنے؟

خرم جب سے آپ وہاں سے بھاگ کر آئے۔

شہباز خدا کی شان۔ چودھویں صدی کا اندھیر ہے۔ آپ لوگ مسلمان اور اسلامی چیزوں کا یوں مذاق اڑائیں۔ لعنت ہو آپ کے حال قراب پر خسم خدا کی مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب۔

خرم میر صاحب تعجب ہے کہ آپ اور ہم کو لا مذہب سمجھیں۔ ذرا اپنے ڈھیلے سوٹ اور ٹیڑھی ٹائی پر نظر ڈالئے پھر میرے انگرکھے اور میری نورانی صورت کو دیکھئے۔ اگر آپ نے اب تک شیطان کو نہیں دیکھا ہے تو میں آئینہ منگوائے دیتا ہوں۔ (آئینہ اٹھا کر دیتے ہوئے) اس میں جو صورت نظر آ رہی ہے وہ شیطان کا عکس ہے۔

شہباز خوب۔ یعنی کہ میں شیطان ہوں۔ اگر میں شیطان ہوں تو لعنت ہو آپ پر۔ آپ لوگوں کے قریب پھٹکنا بھی کفر ہے۔ وقنا ربنا عذاب النار۔

حیدر وقنا ربنا عذاب النار کہئے۔ آپ قرآن کو بھی غلط پڑھیں گے تو غضب ہی ہو جائے گا۔

شہباز تو میں بھی تو کہہ رہا ہوں کہ وخنا ربنا عذاب النار۔

حیدر پھر وہی وقنا ربنا عذاب النار۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تم بات ہی مت کرو۔

خرم سب سے بہتر یہ ہے کہ وقنا ربنا عذاب النار کے بجائے وقنا ربنا میر شہباز کہا جائے۔

شہباز۔ خدا کے لئے آپ سب لوگ میرا پیچھا چھوڑیئے۔ میں رقص کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

خرم سبحان اللہ۔ ضرور ضرور ناچیئے۔ آپ کی طلعت زیبا اور قد رعنا کے لئے رقص ہی بہت موزوں ہے

شہباز خدا کسی شریف آدمی کو تم جیسے ناماخول بدمعاشوں سے محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین۔ مگر اب

میں جاتا ہوں (اٹھتا ہے)

ناصر ارے نہیں میر صاحب کہیں ایسا تم نہ کیجئے گا آپ کے بغیر محفل سونی ہو جائیگی بیٹھیے بیٹھیے۔ ہاں کچھ تازہ کلام سنائیے۔

خرم ہاں۔ ہاں میر صاحب۔ واہ کیا کہنے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔

حیدر بیشک میر صاحب۔ تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز۔

شہباز یہ آپ کی شفقت و محبت ہے۔ ورنہ میں تاکسار کس خاطر ہوں۔

خرم یہ آپ کی خاکروبی ہے میر صاحب۔ ورنہ آپ شاعری کی الٹی گنگا بہانے میں جواب نہیں رکھتے۔

ناصر پھر تم شرارت کر رہے ہو خرم۔ ذرا بیچارے کو کچھ سنانے دو۔ ہاں میر صاحب ہم سب ہمہ تن گوش ہیں لیکن ذرا لے سے سنائیے گا۔

شہباز خیر آپ لوگوں کا اصرار ہے تو فرماتا ہوں۔ (شہباز جوتا اتارتا ہے)

خرم خیر ہے میر صاحب۔ آپ بجائے زبان کے جوتے سے شاعری کرنے پر آمادہ ہیں ؟

شہباز پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ خواہ مت خواہ دخل در معقولات (شہباز پاتابہ اتارتا ہے اور پاتابے میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالکر ظریف کی یہ غزل سنانا شروع کرتا ہے)

قیامت ہجر میں فرضی مریض غم کا مرجانا	یہ سب کیا ہے سلامت جھوٹ کے پل سے گزر جانا
دولتی سے سمند ناز کی غیروں کا مر جانا	یہی تو ہے طویلے کی بلا بندر کے سر جانا
رخ روشن کی چھری حسن کا گویا ٹھہر جانا	خیامت ہے کسی معشوخ کا سن سے اتر جانا
بھگانا دیکھ کر سرپٹ وہ اُن کو اپنے ناقے کا	میاں مجنوں کا چلانا کہ بی لیلیٰ ادھر آنا
تم آنا رت جگے میں گلگلے مضموں کے لیکر	ظریف اچھا ہے اردو شاعری کا طاق بھر جانا

ناصر واہ مولانا واہ۔ اس وقت طبیعت خوش ہوگئی اچھا صفدر صاحب آج بہت خاموش ہیں اتنی دیر سے اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں گویا موجود ہی نہیں۔

خرم میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

صفدر جی نہیں یونہی کچھ طبیعت سست تھی۔

ناصر اچھا صفدر صاحب۔ اپنا کچھ کلام تو سنائیے۔ میر صاحب نے تو ظریف کی غزل اپنے نام سے سنائی اب آپ اپنا نہیں تو غالبؔ کا ہی کلام سنائیے۔ مدت سے آپ کو گاتے نہیں سنا۔ ظریفؔ کی غزل کے بعد کوئی سنجیدہ غزل سننے ہی میں لطف آئے گا۔

خرم ہاں بھئی دیکھ کیا رہے ہو۔ شیطان کا نام لیکر سناؤ (یہ کہہ کر خرم آرام کرسی پر جاکر بیٹھتا ہے۔ لیکن کرسی اس کے بوجھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ گرتا ہے۔ قہقہہ) دیکھیے یہ شیطان کا نام نہ لینے کا نتیجہ ہے (دوسری کرسی پر جاکر بیٹھتا ہے۔ صفدر جیب سے کاغذ نکالکر سنجیدہ اور دلفریب آواز میں غزل سنانا شروع کرتا ہے)

ناصر (غزل ختم ہونیکے بعد) واہ صفدر صاحب واہ یہ تو پوری غزل مرصّع ہے۔ اور ہر شعر تعریف سے مستغنی

صفدر (مسکراکر) آپ کا بہت بہت شکریہ (کاغذ جیب میں رکھ کر پھر پہلے کی طرح خاموش بیٹھ جاتا ہے)

خرم اچھا میر صاحب کچھ اور فرمائیے۔

شہباز پھر آپ نے حماقت کے اقوال شروع کئے۔

ناصر اچھا میر صاحب آپ کو کس شاعر کا کلام سب سے زیادہ پسند ہے۔

شہباز ڈاکٹر اقبال کا اور وہ بھی خصوصیت سے پیام مشرق۔

خرم اور جناب ہم کو تو میر انیس کا کلام پسند ہے۔

حیدر خوب۔ بڑا تعجب ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ کو جانصاحب یا چرکین کا کلام پسند ہوگا۔

خرم یہ آپ کا حسن ظن ہے۔ مجھے تو صاحب میر انیس کا کلام سب سے زیادہ پسند ہے۔ حالانکہ آپ کے سر کی قسم میں نے ان کا صرف ایک ہی شعر عمر بھر میں دیکھا اور اسی ایک شعر سے میں ان کی شاعری کا قایل ہوگیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ شعر اُن کے اوائل عمر کا ہے اسی سے میں سمجھ لیا کرتا ہوں کہ قیاس کن زگلستان من بہار برا۔

ناصر بھئی معلوم تو ہو وہ کونسا شعر ہے۔

خرم (انتہائی سنجیدگی سے) اُردو ادب میں شاذونادر ہی اس پایے کے شعر نظر آتے ہیں۔

ناصر بھئی سناؤ گے بھی یا باتیں ہی کرتے چلے جاؤ گے۔

خرم اچھا سنئے۔

صد حیف زمانے سے سفر کر گئی بکری ... آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری

(سب کے سب ہنسنے لگتے ہیں)

آئیں لوگ ہنس رہے ہیں۔ دیکھئے لکھّی لات ماریگی تو سب دانت گرجائیں گے۔

شہباز لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ۔

ناصر ارے کوئی ہے۔

ملازم (اندر سے) جی سرکار آیا۔ (آتا ہے)

ناصر کھانا تیار ہے؟

ملازم جی ہاں۔

ناصر اچھا تو سب کا کھانا نکالکر چنو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔ (ملازم جاتا ہے) آج تعطیل بڑی اچھی گذری۔ کالج جانا ایک مصیبت معلوم ہوتا ہے۔ اگر حاضری کی بخ نہ ہوتی تو میری حاضری صفر فی صد ہوتی۔

خرم اس واسطے گنجے کو ناخن نہیں دئے جاتے۔

ناصر اچھا میر صاحب جب تک کھانا گلے ایک آدہ پھڑکتی ہوی غزل سنائیے۔

خرم ہاں ہاں میر صاحب بسم اللہ۔

شہباز آپ لوگ اصرار کرتے ہیں تو خیر سنئے۔ (ظریف کی یہ غزل گاتا ہے)۔

وحشت میں ہر اک نخشہ الٹا نظر آتا ہے مجنوں نظر آتی ہے لیلی نظر آتا ہے

اے مرغ سحر ککڑوں کوں بول کہیں جلدی تو بھی شب فرقت میں گونگا نظر آتا ہے

ڈاڑھی کو تری زاہد سب دیکھ کے کہتے ہیں وہ قصر تقدس کا چھجا نظر آتا ہے

خرم واہ میر صاحب واہ۔ آپ نے تو واللہ شاعری کی ٹانگ توڑ دی۔

شہباز پھر آپ نے بنانا شروع کر دیا۔ چہ قوش چرا بنودی۔

ملازم (آکر) کھانا تیار ہے۔

ناصر چلئے (سوائے ملازم کے سب جاتے ہیں)

ملازم اچھی دلگی سوجھی ہے۔ ان چھوکروں کو سوائے باتیں بنانیکے اور کچھ نہیں آتا۔ جمعہ کے دن مجمع رہتا ہے مجھے سات آٹھ آدمیوں کا کھانا پکانا پڑتا ہے۔ خدا کرے کہ سال بھر میں صرف ایک جمعہ پڑا کرے یا نہیں تو خدا کرے کم از کم جمعہ کو بھی کالج ہوا کرے۔ ابھی ہمارے سرکار نام خدا

صاحبزادے ہیں۔ کسی بات کی تمیز تو ہے نہیں اپنی دولت دوستوں کے پیچھے لٹا رہے ہیں۔
میرا بس چلے تو ان میں سے ایک ایک کا دس دس مرتبہ گلا گھونٹوں لیکن آج کھانا بھی میں نے ایسا خراب پکایا ہے کہ میاں جی یاد کریں گے (ناظرین سے مخاطب ہوکر) اور آپ لوگ بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ خالہ جی کا گھر سمجھ لیا ہے۔ کہ وہ لوگ پھر کھانا کھا کے آپ کو خوش کرنے یہاں آئیں گے بس اب ہاتھ منہ دھو رکھئے آیا خیال شریف میں اور اگر ایسا ہی شوق ہو تو بسم اللہ آئیے ناچنے کو دیئے گا ئیے۔

(پردہ)

محمود گاواں مرتبہ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ یہ سلطنت بہمنیہ کے وزیر باتدبیر صاحب سیف و قلم خواجہ جہاں محمود گاواں کی سبق آموز سوانحعمری ہے جو معتبر اور مستند ذرائع اور کتب تواریخ سے مدد لے کر مرتب کی گئی ہے۔ ضخامت (۵۵) صفحات طباعت دیدہ زیب۔

قیمت (۸/)

قاموس الاغلاط از مولنا سید مختار احمد و مولنا ذہین۔ اس کتاب میں پانچ ہزار کے قریب الفاظ کی تحقیق و تدقیق، ادبی اغلاط کی تصحیح و تنقیح ہے۔ اور ممتاز ادیبوں اور نامی گرامی شاعروں کے کلام کے حوالوں سے استناد کیا گیا ہے۔ تحقیق ادب میں یہ پہلی کتاب ہے جو اہل تحقیق ادب کے لئے مفید و کارآمد علمی تحفہ ہے۔ مجلد۔

قیمت (عہ)

ملنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) متصل ڈاکخانہ انگریزی حیدرآباد دکن

از

جناب اختر حسن صاحب اختر

ایک مرتبہ کسی دیہات میں مسلسل پندرہ روز تک دال کھانے کا اتفاق ہوا تھا، اُسی زمانہ میں اُس "روز کی دال" سے تنگ آکر ایک فی البدیہہ "ہجو ملیح" بھی دال کی شان میں ہوگئی تھی آج ایک مدت کے بعد دال کھاتے وقت بے اختیار وہ زمانہ یاد آگیا اور ذیل کا مضمون اسی "یاد ماضی" کا ایک دلکش نتیجہ ہے۔:

اگر ان سطور کو میں اُسی زمانہ میں سپرد قلم کرتا تو شاید اس کا لہجہ بھی "ہجو" کی طرح تلخ سے تلخ تر ہوجاتا مگر اس وقت اس "نا انصافی" کی جرأت نہ ہوئی۔:

"دال" کی دل خوش کُن لذتوں کو بھلا کر اس کے "در پے آزار" ہوجانا یقیناً ہندوستان پر، ہندوستان کے کسانوں پر اور ہندوستان کے "بیچارے باشندوں" پر ایک صریح ظلم ہے اگر قارئین میں سے کوئی اس "نادر روزگار" "غلہ کے موزوں" سے ناواقف ہوں تو اُن سے باادب استدعا کیجاتی ہے کہ وہ "اولین فرصت" میں دال کھانے کی زحمت گوارا فرمائیں کیونکہ ع

لُطف این "غلہ" نہ دانی بخدا تا "نخوری"!

"دال" سے آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ اُسی قاعدہ کی دال ہے جس کو اس "دور اردو" میں ہر ہندوستانی نونہال پانچ سال کی عُمر سے پڑھنا شروع کرتا ہے اور پڑھتا رہتا ہے جب تک اُس کو "منھ زبانی" یاد نہ ہوجائے کہ "الف سے انار، بے سے بکری، جیم سے جوتا اور دال سے دوات وغیرہ اور اب تو یہ وائسرائے اور گورنر جنرل قسم کے صاحب بہادر لوگ بھی اُردو سیکھنے کے خاطر کسی "بڑے مولوی صاحب" سے "اپنے پرائیویٹ روم" میں "پرائیوٹ طور" پر پڑھا تو کیا کرتے ہیں "اردو نازنین" کے نرم نرم الفاظ کو اپنے مغربی لہجہ میں بڑی بے دردی کے ساتھ چبایا کرتے ہیں! خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، ہاں! اس مضمون میں "دال" سے

ہمارا مدعا صرف اُسی دال سے ہے جو ہندوستان جنت نشان کے ہر حصّہ زمین میں بکثرت پیدا ہوتی ہے!

دال کا وجود اس کارگاہ ہستی میں بہت قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے جب وہ حضرت انسان ،، "من و سلوٰے ،، کھاتے کھاتے اکتا گئے تو آپ نے اللہ میاں سے چار چیزوں کی "فرمائش ،، کی جس میں یادش بخیر! ایک مُسور کی دال ،، بھی تھی! ہمارا " ذاتی خیال " یہ ہے کہ یہ "حسین وجمیل فرمائش ،، ضرور کسی ہندوستانی ہی نے کی ہوگی: بہر حال اس میں تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ "دال" بلا شرکت غیرے ہندوستان کا محبوب ترین غلہ ہے اور ہر ہندوستانی کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اس "خوش قسمتی ،، پر جتنا چاہے فخر وناز کرے!

یوں تو دال کی کاشت دنیا کے اکثر دوسرے حصوں میں بھی ہوتی ہے مگر قدرت نے کچھ ہندوستان ہی کو اس کے لئے زیادہ موزوں بنایا ہے چونکہ اس کے "نشوونما" پانے کے لئے "ذرا گرم ،، آب وہوا کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس سے بہتر سرزمین اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی۔

دال کی کئی قسمیں ہیں مثلاً چنے کی دال تور کی دال، مسور کی دال، ماش کی دال اور مونگ کی دال وغیرہ لیکن ان سب میں چنے کی دال بے حد مقبول، مفید اور کار آمد ہے! اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ہندوستان کا عظیم الشان شہنشاہ ــــ شاہ جہاں ــــ نظر بند کر دیا جاتا ہے اور اُس سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کھانے کے لئے کوئی ایک غلہ پسند کرلے تو وہ "چنے ،، کا انتخاب کرتا ہے!

اسی چنے کو چکی میں دلنے کے بعد دال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کا درخت نہایت "خوش وضع ،، اور خوش قد ،، ہوتا ہے کالی مٹی میں خوب پیدا ہوتا اور بہت ہی قلیل عرصہ میں وہ نام خدا جوان ہو جاتا ہے! "چنا ،، جب ہرا ہوتا ہے اور "بوٹ ،، کہلاتا ہے اس وقت بھی اس کو طرح طرح سے استعمال کرتے ہیں لیکن جب خشک ہو کر زرد اور مٹیالا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی شوکت وعظمت کا کیا پوچھنا ہاتوں ہات لیا جاتا ہے اور دل وجان سے اُس کی خدمت کی جاتی ہے!

چنے کی دال کو پیس کر آٹا بناتے ہیں جس کو "بیسن ،، کہتے ہیں اس بیسن کی سیکڑوں مزیدار چیزیں تیار ہوتی ہیں جن کو کیا امیر وکیا غریب سبھی بڑے شوق کے ساتھ کھاتے ہیں! بیسنی روٹیاں ،، بھی بعض لوگ بہت پسند کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ عجیب چیز ہوتی ہے! چنانچہ مرزا غالبؔ مرحوم فرماتے ہیں "قطعہ"

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے! | مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی!
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر! | جو کھاتے حضرتِ آدم یہ "بیسنی روٹی!

برکھارت میں جب بھورا بھورا ابر آسمان پر چھا جاتا ہے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگتی ہے تو ہندوستان کے خوش دل اور خوش باش گھرانوں میں "کڑھاو" چڑھایا جاتا ہے جس میں چنے کی دال نت نئے انداز کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے ......!!

اگلے زمانہ میں چنے کا بیسن بجائے صابون کے استعمال ہوتا تھا اور "گڑوا جلا ہے" سے لیکر "بہادر شاہ ظفر" تک اُس سے ہات بھی دھوتے تھے اور بدن بھی ملتے تھے!

لیکن اب ــــ اس دور ترقی میں "عمر خیام" قسم کے قیمتی صابون نے اس کی جگہ لے لی ہے

اللہ اللہ ع کیا زمانہ کا انقلاب ہوا۔

رمضان کی افطاری میں چنے کی تلی ہوئی اور کچی پکی دال کا موجود رہنا آج بھی از بس ضروری اور لازمی خیال کیا جاتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ بغیر چنے کی دال کے "افطاری" بے رونق اور بے لطف رہتی ہے! کہتے ہیں کہ چنا مقوی بھی بہت ہوتا ہے اسی لئے یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ "کھائے چنا رہے بنا" یہ گھوڑوں کو بھی اسی لئے کھلایا جاتا ہے اور ہندوستان کے بعض "گاما قسم" کے پہلوان بھی صبح سویرے "روزانہ" نہار منھ اس کو کھایا کرتے ہیں! اگر آپ کو "باوا شرف الدین یحییٰ منیری" والا سانپ کا عمل سیکھنا ہو تو ۲۷ رمضان کو روزہ کھولنے کے بعد بغیر پانی کی مدد کے ایکسو چپیس[125] کی تعداد میں اسی چنے کو نگلنا ہوگا اور اگر آپ کو ذرا اپنے "رخسار مبارک" کو بارونق بنانا ہو تو سوتے وقت مٹھی بھر چنے دونوں گالوں میں دبا لینا پڑیں گے۔ چند دنوں کے بعد اس کے اثر سے آپ خود نہ لطف اندوز ہوں تو سہی!

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا کہنا در اصل یہ ہے کہ اسی چنے کی ہندوستان میں سیکڑوں قسم کی نہایت لذیذ مٹھائیاں بھی تیار ہوتی ہیں جن پر غیر ملک کے لوگ بھی دم دیتے ہیں اور سیروں کھا جانے کے بعد بھی سیر نہیں ہوتے!

یہاں دکن میں چنے کے "پورن" کی پوریاں بنائی جاتی ہیں جو اپنی "صورت اور سیرت" دونوں اعتبار سے کسی "جنت کے میوہ" سے کم نہیں ہوتیں!

انہیں اپنی بے شمار خصوصیتوں کی وجہ سے چنے کی دال سب دالوں کی سرتاج تسلیم کی گئی ہے!

تور کی دال ہمارے ہندو بھائی بڑے شوق سے کھاتے ہیں یہ نہایت آسانی کے ساتھ پک جاتی ہے اور اس کے "تناول فرمانے" میں بھی کسی قسم کی کوئی دشواری لاحق نہیں ہوتی! اسی لئے

ہندوستان کی اس ہشیار قوم ،، نے تور کی دال کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور اس ذریعہ سے دولت جمع کرنا اپنا نصب العین قرار دے لیا ہے ، اسی تور کی دال کو "ارہر کی دال" بھی کہتے ہیں اور زیادہ فصیح لفظ یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ایک شاعر اس دال سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوے کہتا ہے ؎

دال ارہر کی اور چپاتی چار وقنا ربنا عذاب النار!

ہم کو اس امر کے اظہار میں قطعاً پس و پیش نہیں کہ جس طرح ہندو تور کے دیوانے ہیں مسلمان "ماش" کے شیدا ہیں اب اس پر چاہے "دہلی والے خواجہ صاحب" ہم سے خفا ہو جائیں یا وہ "عورت ذات ملا رموزی" ہم پر ناک بھوں چڑھائیں لیکن ہم تو اپنی "فاش گوئی" پر مطمئن اور شادماں ہیں !

اس دال کو بھی کئی طریقوں سے پکایا جاتا ہے اور مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً "دھوئی ماش کی دال" چوٹے بھری ماش کی دال ،، وغیرہ : اگر اس دال کے ساتھ کہیں مسکہ کا تازہ تازہ گھی بھی میسر آجائے تو کیا کہنا "دنیا کی ساری نعمتیں اور کائنات کی جملہ لذتیں اس کے آگے ہیچ ہیں ! دکن میں اس دال کا رواج کم سے کم تر پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کی شان میں یہاں والوں نے ایک مصرع طرح یوں موزوں فرما دیا ہے کہ ع "ہندوستانی دال کا پانی" !

اس فصیح و بلیغ مصرعہ میں جو "دال" کا لفظ آیا ہے اس کے لغوی معنے تو ہر اس دال کے ہونگے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے مگر اصطلاحی معنے صرف "ماش کی دال" کے ہیں اور اسی طرح "ہندوستانی" صرف وہی لوگ ہیں جو دہلی اور صوبہ متحدہ آگرہ واودھ کے رہنے والے ہیں اور "قسمت سے یہاں آکر بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہو گئے ہیں اور کسی طرح "ٹلنے" کا نام ہی نہیں لیتے ـــــ خدا رحمت کند این "مفلسان" پاک طینت را !

"دھوئی ماش کی دال" پر ایک لطیفہ یاد آگیا ـــ :

کسی زمانہ میں ہمارے محلہ میں ایم اسلم والے ایک مزاجی رہا کرتے تھے آپ کا وطن شریف "خاص دکن" تھا ! آپ "خوش قسمتی" سے نہایت سادہ مزاج اور سادہ لوح واقع ہوے تھے "ماش کی دال" بہت مرغوب خاطر تھی شام کا کھانا آپ ہمارے ہی ہاں تناول فرمانے کے عادی تھے اکثر فرمائش کرکے ماش کی دال پکوایا کرتے : ایک دن معلوم نہیں کیا خبط سمایا کہ آپ نے اپنے "دست خاص" سے اپنے دولتخانہ پر دال پکانے کا ارادہ کرلیا ، دیر تک غور کرنے کے بعد دال کو اوکھلی میں ڈالا اور کوٹنا شروع کیا ـــ یہاں تک

کہ وہ آٹا ہو گئی :

مرزا نے جب دال کا یہ رنگ دیکھا تو گھبرائے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے اور بڑے تعجب کے ساتھ فرمانے لگے "بھئی : یہ تمہارے ہاں ماش کی دال بغیر چھلکے کے کیسے پکتی ہے ، ذرا ہم کو بھی ترکیب بتلا دو ہم نے تو لاکھ کوشش کی دو گھنٹہ تک اوکھلی میں ڈالکر کوٹا مگر چھلکا الگ نہ ہونا تھا نہ ہوا" مرزا جی جب اپنا طویل جملہ ایک سانس میں ختم کر چکے تو حاضرین میں ایک زبردست قہقہہ پڑا اور اس کے بعد طے یہ پایا کہ مرزا جی کی بیگم صاحبہ ایک دن ہمارے گھر تشریف لائیں اور دال پکانا سیکھ جائیں :

معلوم نہیں وہ کونسی عظیم الشان ہستی تھی جس نے دال اور چاول کے اختلاط سے ایک نئی چیز کی بنیاد ڈالی تھی جس کو عرف عام میں "کھچڑی" کہتے ہیں یہ کھچڑی اتنی مقبول ہوئی کہ صبح اُٹھنے کے بعد ہی ہر "شریف ہندوستانی" کے سامنے "ناشتہ" بنکر آنے لگی مگر افسوس ! جہاں ہندوستان سے اور بہت سی قدیم رسمیں اُٹھ گئی ہیں اب اس "ناشتہ کی کھچڑی" یا کھچڑی کے ناشتہ" کا رواج بھی کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ توس، کیک، چار، اور کچے انڈوں کے قدم جمتے جا رہے ہیں :

بہر حال ہم کو اس پر کافی اطمینان ہے کہ اگر کھچڑی ہندوستان سے معدوم بھی ہو جائے تو "ہندوستانی دال" کی قدر و قیمت کم نہیں ہو سکتی ۔ پر نہیں ہو سکتی !

اس میں بھی کچھ قدرت کی مصلحت ہی ہے کہ ہندوستانی دال کے بے انتہا شوقین واقع ہوئے ہیں ورنہ اس "گرانی اور غلامی" کے دور میں خدا جانے ہندوستان کا کیا حشر ہوتا اگر وہ اس "کم خرچ بالا نشین" زیور سے مزین نہ ہوتا :

معلوم نہیں یہ ہمارے افغانی بھائی دال سے کیوں چڑھتے ہیں، ان کا قول ہے کہ ہندوستانیوں نے دال کھا کھا کر اللہ میاں کی عادت بگاڑ دی ہے یہی سبب ہے کہ اب ان کو دال کے سوا اور کچھ نصیب نہیں ہوتا : "دال خور ہندوستانیوں" کا ان ولایتیوں نے کافی مضحکہ اُڑایا ہے چنانچہ کہتے ہیں اور بڑے طعن کے ساتھ کہتے ہیں کہ "غلہ را با غلہ می خورند و می گویند دال روٹی" ___ مگر خدا کی شان کہ یہی ولایتی جب ہندوستان کی سیاحت کو تشریف لاتے ہیں تو ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ اپنے "میزبانوں" سے دال کی فرمائش کیا کرتے ہیں منہ سے چاہے کوئی کچھ کہے ___ مگر یہ ہمارا تجربہ ہے ___ کہ دل میں اُس کی "باعظمت لذتوں" کے سب معترف ہیں :

غالب نے کہا تھا کہ ــــ جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے ــ"
لیکن ہم نے ایک مرتبہ دال کھاتے کھاتے "اسی فلسفہ" کو ذرا "بالفاظ دیگر" یوں بیان کر دیا تھا کہ

ع　　قورمہ سے یہ مری ماش کی دال اچھی ہے !

اگر اس کی صداقت کا آپ کو یقین نہ آتا ہو تو آپ ڈاکٹر اقبال سے بھی ہر وقت دریافت فرما سکتے ہیں !

معلوم نہیں کس بچارے "افلاس کے مارے" کا شعر ہے ؎

مُفلسی نے جو ستایا تو دکن یاد آیا!　　"ماش کی دال" جو دیکھی تو وطن یاد آیا!

آہ :ـ کیا بُری چیز غریب الوطنی ہوتی ہے ! خدا، دشمن کے بھی دشمن کو یہ روز نہ دکھلائے !

ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

یاد کر کے ہم "وطن" کو رو دیئے　　سامنے جب "ماش کی دال" آگئی!

ہائے کیا بے کسی ہے !!

ہم تو ہم ــــ یہ ...... گوشت، مچھلی، انڈے وغیرہ "نوش جان" فرمانے والے بھی جب ہندوستان آتے ہیں اور "دال بھات" کی لذتوں سے واقف ہو جاتے ہیں تو پھر عمر بھر کے لئے اُس کو فراموش نہیں کرتے ــــ نہیں کر سکتے! کسی "آوارۂ دیارِ ہند" کا قول دال کے بارے میں ہے ــ اور کتنا سچ ہے ـ کہ "جب یہ مُنھ کو لگ جاتی ہے تو ذرا مشکل سے چھوٹتی ہے" !

"دال" چھوٹے بچوں کو بہلانے کے لئے بھی بڑا "دلچسپ کھلونہ" تیار کرتی ہے ہمارے "بڑے بوڑھے" کہا کرتے ہیں کہ انھوں نے بارہا ــ جب کبھی ہم لڑکپن میں گھی کے لئے ضد کیا کرتے ـ "ماش کی دال" کا "اُبال" ہم کو دیدیا اور ہم اس کو گھی سمجھ کر خوشی خوشی کھایا کئے !

یورپ میں اور خاصکر انگلینڈ میں تو دال کا کال ہے یہ تو اکثر جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے "ذرا گرم ملکوں ہی میں پیدا ہو جایا کرتی ہے اور ہندوستان تو اس کا "مخزن" ہے ـ اب تھوڑے دنوں سے "کمپنی بہادر" کے سوداگر لوگ ہندوستان کے سونے چاندی، چارا اور کپاس وغیرہ کے ساتھ دالیں بھی بوروں میں بھر بھر کر انگلینڈ لیجانے لگے ہیں کیونکہ اکثر "ہندوستان پلٹ" انگریزوں کو اس کا ایسا مزا لگ گیا ہے کہ بغیر اس کے اب ان سے شراب تک نہیں پی جاتی، واقعی "دال بڑا مال" ہے۔

دال مونث ہے اور چونکہ ہندوستان کی "موہنی سرزمین" میں پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کا

مؤنث ہونا قدرتی ہے لیکن یہ "باہر والے" "اس جنس لطیف" کو ہمیشہ یوں استعمال کرتے ہیں کہ "کیا دال تیار ہوگیا" "کیا آج دال نہیں پکا"؟ وغیرہ خدا جانتا ہے کہ ان جملوں سے ہم کو کتنی اذیت پہنچتی ہے اور دل پر کیا گذرتی ہے جناب گاندھی کو وائسرائے کی معیت میں "چار نوش فرمانے" سے بھی غالباً اتنی زیادہ کوفت نہ ہوتی ہوگی ـــ مگر کیا کریں مجبوری ہے "قہر درویش بر جان درویش" ع صبر بگڑا ہوا اک نام ہے مجبوری کا!

ہندوستان کی دال نے اب اس قدر ترقی کر لی ہے۔ کہ دسترخوان سے بڑھکر اس کا عمل دخل زبان اُردو اور ادب اردو میں بھی ہوتا جا رہا ہے اور اس کی مناسبت سے متعدد "ضرب الامثال" اور "محاورے" عالم وجود میں آ گئے ہیں مثلاً "دال میں کالا" "دال گلنا" وغیرہ۔

ایک ہندی شاعر کسی شہر کے باشندوں کو "بے نمک کی دال" سے تشبیہ دیتا ہے، ملاحظہ ہو:

اُن کے شہرن کے منیّن میں وَ پھیا نکو ئیں! جلئے بن نون کی پہتی میں مجب نکو ئیں!

ایک غریب اور بھوکا شاعر دال نہ پکانے کی شکایت اپنی "پیاری بیوی" سے اس انداز میں کرتا ہے کہ جی بے قرار ہو جاتا ہے: سنئے اور سر دُھنئے! ؎

رُکھّی روٹی تو ہم نہیں کھیئے! پہتی کا ہے نہیں پکوتی ہو!

الغرض ـــ ہندوستان کی دال اپنی "بلند پایہ شخصیت" اور اپنی "عالمگیر مقبولیّت" کے لحاظ سے ایک ایسی "عجیب و غریب" چیز ہو گئی ہے کہ آج ہر ہندوستانی دل و جان سے اس کی قدر کرتا ہے اور محض اسی "دال" کو غیر اقوام کے "پنجۂ حرص و آز" سے محفوظ رکھنے کے لئے "سوراج"، "مہاتما گاندھی زندہ باد" اور "ہندوستان آزاد" کے نعرے بلند کر رہا ہے!

یہ ہیں کی رنگ برنگ والوں کا اثر ہے کہ ہر ملک اور ہر حکومت کو ہندوستان "سونے کی چڑیا" نظر آتا ہے اور ہمیشہ اس پر کسی نہ کسی غیر قوم کی آنکھیں لگی رہتی ہیں!

ہاں: اسی "دال" کے "آغوش تربیت" میں ہندوستان کی ایسی ایسی عظیم المرتبت اور فلک وقار ہستیاں پروان چڑھی ہیں جن کے شاندار کارناموں کو تاریخ میں زرّین حروف سے لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا اور رہتی دنیا تک اُن کی "رنگین یاد" کے "پُرکیف نقوش" اہل نظر کے دلوں سے محو نہ ہوں گے ـــ!

آج کل تو یہ بھی ہوتا ہے کہ جب اسی دال کو کھاتے کھاتے کوئی "ہندوستانی" کسی "ذرا بڑے" "عہدے" پر پہنچ جاتا ہے تو بڑے فخر و ناز کے ساتھ شاعرانہ انداز میں اپنی کامیابی کا اعلان اس طرح کرتا ہے کہ:

ع "دال کھاتے کھاتے" میں ڈپٹی کلکٹر ہوگیا!

بہرحال ـــ ہماری دلی دعا ہے کہ خداوند عالم! تمام ہندوستانی بھائیوں کو اور زیادہ ذوق و شوق اور سرگرمی کے ساتھ "دال کھانے" اور "ہندوستان کو آزاد کرانے" کی توفیق عطا فرمائے ـــ اور

ع ہمیشہ رہے دال کا بول بالا !

انگریزی افسانے

از

عبدالقادر سروری ام اے ال ال بی

"اورنٹیل کالج میگزین" (لاہور) کی رائے:-

"دنیا کے شاہکار افسانے" کے عنوان عام سے ایک سلسلہ مطبوعات سروری صاحب کی ادارت میں اشاعت پذیر ہو رہا ہے اس سے پہلے دو حصے "قدیم افسانے" اور "چینی جاپانی افسانے" شایع ہو چکے ہیں یہ تیسرا حصہ ہے جس میں چودہ منتخب برطانوی مصنفین کا ایک ایک مشہور مختصر افسانہ بہ ترتیب زمانی درج ہے۔ بلا شک یہ کام اپنی نوعیت کا پہلا ہے" ہر ایک مصنف کے کچھ سوانح حیات بطور تعارف افسانہ سے پہلے شامل کر دئے گئے ہیں۔ بیشتر افسانے محی الدین صاحب نے انگریزی سے اردو میں منتقل کئے ہیں ترجمہ کی زبان صاف ہے اور مطالب کی وضاحت کی وجہ سے دلچسپی قائم رہتی ہے لطف زبان خوبی بیان کے لحاظ سے نیز اثر و تاثیر کے اعتبار سے ہمیں حمدی صاحب کا "بچے کا خواب" پسند آیا...... امید ہے کہ ہمارے وہ فسانہ نگار جو انگریزی زبان و ادب سے ناآشنا ہیں اس کتاب سے متمتع ہو نگے اور واقعہ نگاری اور جذبات پنہاں کی نقاب بر افگنی کی صفات سے اردو افسانہ کو بھی متصف کرینگے ہی کرینگے۔ قیمت عہ

جدید مطبوعات

زبان و ادب

فاوسٹ گوئٹے کے مشہور ڈرامے فاوسٹ (حصہ اول) کا پہلا ذمہ دارانہ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی، ایچ، ڈی۔ نے کیا ہے۔ اور یہ کتاب سلسلۂ انجمن ترقی اردو میں شائع ہوئی ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں گوئٹے سے پہلے کے جرمن ادب، گوئٹے کی حیات و شاعری اور فاوسٹ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے۔ قیمت (صہ)

مزاجی نسیم بک ڈپو سے اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ ایم، اسلم کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شایع ہوا ہے ایم، اسلم کے اکثر مضامین رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب اردو کے ادب لطیف میں اچھا اضافہ ہے۔ ابتدا میں تاثیر صاحب کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد خود مصنف کی "گذارشات" ہیں۔ کل ۲۶ مضامین ہیں۔ مکتبہ ابراہیمیہ سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔ قیمت (عمر)

سلمیٰ اس نام سے انصار صاحب ناصری نے آسکر وائلڈ کے ڈرامے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس سے قبل بھی ایک سے زیادہ مرتبہ سالومی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ قیمت (۶ عہر)

تفویض مرزا عظیم بیگ چغتائی نے یہ افسانہ معاشرتی زندگی کے موضوع پر لکھا ہے۔ ایک لڑکا خواب میں لڑکی بنجاتا ہے اور محلہ کے مولوی صاحب سے بیاہا جاتا ہے مولوی صاحب کی بی بی بنکر اس کو جو تجربے حاصل ہوتے ہیں اُن سے یہ قصہ بن گیا ہے۔ موضوع بہت ہی مزاحیہ ہے۔ خصوصاً مولوی صاحب کا کردار بہت اچھا کھینچا گیا ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔ قیمت (۶ ہر)

عزیز اللغات مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی نے اردو زبان کی ایک لغت مرتب کی ہے جو مطبع انوار احمدی الٰہ آباد سے شایع ہوئی ہے۔ الفاظ اور محاورے سب یکجا جمع کیے گئے ہیں۔ اور عزیز لکھنوی کے نام سے

یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ لغت بہت مفید اور کارآمد ہوگی۔ مجلّد ہے اور کتابت وطباعت اچھی ہے مکتبۂ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔ قیمت [illegible]

پردۂ مجاز | یہ منشی پریم چند کا چوتھا طویل ناول ہے۔ منشی صاحب مختصر افسانوں میں اُردو زبان میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے قلم کے طویل ناولوں کی بھی ادب کو بہت ضرورت ہے۔ ابھی صرف حصۂ اول شایع ہوا ہے۔ جو مکتبۂ ابراہیمیہ سے مل سکتا ہے۔ قیمت [illegible]

سوانح عُمری

اکبر الہ آبادی | اکبر الہ آبادی کی حیات طالب الہ آبادی نے ترتیب دی ہے۔ ساڑھے چار سو سے زیادہ صفحات پر اکبر کے متعلق جس قدر معلومات ہوسکتے تھے، جمع کیے گئے ہیں۔ کلام پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ کتاب غیر مجلد اور مجلد دونوں طرح شایع ہوئی ہے۔ قیمت [illegible]

محمد علی | مولانا محمد علی مرحوم کے حالات زندگی عشرت رحمانی کے قلم سے حال ہی شایع ہوے ہیں جس میں مولانائے مرحوم کی سوانح حیات عملی کارگزاریوں اور سیاسی مصروفیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور آخر میں مولانا کے انتقال پر اُردو صحافت نے جو ماتم کیا اس کا کچھ اقتباس بھی ہے۔ جا بجا تصویریں بھی ہیں۔ قیمت [illegible]

تاریخ

امیر تیمور گورگان | امیر تیمور کی سوانحمری ہے۔ مولوی عنایت اللہ صاحب ناظم دار الترجمہ نے ترجمہ کیا ہے اصل کتاب ہیرلڈ لیمب نے لکھی تھی، جو حیاتِ صاحبقران پر بڑی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے قیمت ([illegible])

سائنس

پرندے اور اُن کی زندگی | پرندوں کے موضوع پر یہ کتاب ابھی ابھی شایع ہوئی ہے۔ اردو میں عام فہم سائنس کی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ اس کے مصنف مسٹر موہن لال سیٹھی لکچرار ملتان کالج ہیں۔ اس کا مطالعہ پرندوں کی پرورش سے متعلق معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر پرندے کی تصویر اصلی رنگ میں دی گئی ہے۔ حیاتیات کی اکثر اصطلاحات کے ترجمے بھی کئے گئے ہیں۔ کتاب دار الاشاعت پنجاب کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ قیمت [illegible]

اُردوئے قدیم

(طبع ثانی کی بعض اہم فروگذاشتیں)

"اردوئے قدیم" مولفہ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب پانچ سال کے بعد دوبارہ طبع ہوئی ہے یہ کتاب جیسا کہ اس کے سرورق سے واضح ہے ۱۹۲۷ء سے عثمانیہ یونیورسٹی کے امتحان ایم، اے میں داخل ہے۔ اور مصنف کی نظر ثانی کے بعد اس کو اب مطبع نولکشور لکھنو نے شائع کیا ہے۔

ادب ریاضی نہیں ہے جس کا ہر ایک مسئلہ یقینی اور قطعی ہو۔ آئے دن جب جدید تحقیقات سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے تو رائے میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکیم صاحب کی تالیف کے بعد اس مبحث پر کئی ایک کتابیں لکھی گئیں اور بیسیوں مضامین رسالہ مکتبہ، معارف، جامعہ، نیرنگ خیال وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں جن میں دکھنی ادبیات کے متعلق کافی مواد پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد جب ہم اس کتاب کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اڈیشن بھی ہنوز ترمیم و اصلاح طلب ہے۔ کئی امور کے قابل اضافہ ہونے کے قطع نظر بعض ایسی اہم فروگذاشتیں ہوئی ہیں جن کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً جب کتاب جامعہ عثمانیہ کے ام، اے کے نصاب میں شامل ہے۔

اس مضمون سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اعتراضات کئے جائیں محض علمی صحت کے خیال سے ان اُمور پر نظر ڈالی جاتی ہے تاکہ جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں غلط حالات داخل نہ ہو جائیں۔

(۱) سلطان محمد اور عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کے ضمن میں بتایا گیا ہے:-

"اردو کا کلام ایک انتخاب میں جمع ہے جسے ۱۰۷۹ھ ہجری میں اردستانی نے حیدرآباد میں مرتب کیا اور اس کا ایک مطلا نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے" صـ ۶۲

اور فٹ نوٹ میں ایتھے (ETHE) کے نمبر (۴۰۰۸) کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ یہی بیان اور نمبر طبع اول میں بھی موجود ہے (صفحہ ۵۵) اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ نمبر کے متعلق کوئی غلطی کاتب یا مطبع کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتی ۔

یہ بیان حقیقت سے بہت دور ہے انڈیا آفس میں سلطان کا کوئی دیوان موجود نہیں ہے ایتھے (ETHE) کی مولفہ کتاب فارسی مخطوطات کی کٹلاگ ہے اس میں کل (۳۰۴۳) مخطوطات کا ذکر ہے نہیں معلوم حکیم صاحب نے نمبر (۴۰۰۸) کہاں سے اخذ کیا ہے

ہم نے اپنے قیام لندن کے زمانہ میں انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس کے متعلق پوری تلاش ختم کردی مگر دیوان یا کلیات نہ ملنا تھا نہ ملا اور ملتا کس طرح جبکہ وہاں اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے ۔

(۲) ابراہیم عادل شاہ کے جگت گرو سے ملقب ہونے کی وجہ "بساتین السلاطین" سے حسب ذیل بیان کی گئی ہے :-

> "ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی خاصکر سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اس عہد کے تمام گویّے اسے جگت گرو کہا کرتے تھے ۔" صفحہ ۴

مولف بساتین السلاطین نے جو وجہ اس لقب کی بیان کی ہے اس کو اُسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایا جائے :-

> درمیان عالم بہ جگت گرو مشہور گردیدہ ایں لفظ در اصل دکھنی است مردم بصورت وسیرت آن بادشاہ حمیدہ خصال پسندیدہ افعال بجان راضی وخوش حال بودہ درباب او این لفظ باستعمال آوردند ومعنی آن شاہ جہان است ۔ صفحہ ۳۰ (انڈیا آفس اور صفحہ ۲۷۹ مطبوعہ نسخہ)

اس سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ اصل وجہ اس لقب کی مہارت سرود ہندی تھی یا کوئی اور ۔

(۳) دیباچہ طبع ثانی میں حکیم صاحب نے تحریر فرمایا ہے :-

> سنہ ۱۹۲۶ء اور سنہ ۱۹۲۷ء میں پروفیسر بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے اُردو مخطوطات کی توضیحی فہرستیں شائع کیں تو ہمیں توقع ہوئی کہ ان کی وجہ سے قدیم

اُردو تصنیفات کے متعلق ہماری معلومات میں بعض نئی باتوں کا ضرور اضافہ ہوجائے گا اور اردوئے قدیم پر نظرِ ثانی کرنے میں ان سے تھوڑی بہت مدد ضرور ملے گی۔ لیکن ان کتابوں کے دیکھنے کا جب اتفاق ہوا تو معلوم ہوگیا کہ ان میں دکھنی ادب کی زیادہ تر ان ہی کتابوں کا ذکر ہے جن سے ادب اردو کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے مدت سے واقف ہیں اور ان میں سے اکثر کتابوں کا تذکرہ اردوئے قدیم میں آچکا ہے " (صفحہ ۳)

یہ فہرستیں جس قدر تلاش اور کاوش سے مرتب کی گئی ہیں اور ان میں جو کچھ مواد پیش کیا گیا ہے اس کی قدر نہ کرنا ناانصافی ہے۔ حکیم صاحب کی خود اس تالیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

یہاں جو امر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کی تحریر کے مطابق یہ فہرستیں کوئی جدید معلومات پیش نہیں کرتیں مگر صرف قطب شاہی عہد کے حسب ذیل شعرا جن کے کارناموں کا ذکر ان میں موجود ہے۔ "اردوئے قدیم" کے اوراق پر کہیں جگہ نہیں حاصل کرتے۔

(۱) غلام علی مصنف پدماوت (۲) غلام علی خان لطیف مصنف ظفر نامہ (۳) سیوک مصنفہ جنگ نامہ (۴) احمد مصنف مثنوی مصیبت اہل بیت (۵) خواص مصنف قصہ حسینی۔

اگر حکیم صاحب کم از کم بلوم ہارٹ کے معلومات کو اردو کا لباس پہنادیتے تو ہمیں "اردوئے قدیم" میں صرف عہد (قطب شاہی) ہی کے کئی ایک شعرا کے نام اور کارنامے زیادہ نظر آتے۔ اس طرح دکھنی ادب کے ذکر میں قابل قدر اضافہ ہوتا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا اور طرفہ یہ کہ ان فہرستوں ہی کو ناقص بتایا جارہا ہے۔۔۔۔

(۴) رستمی کے تخلص کے متعلق اصلاح کی گئی ہے مگر نفس مضمون کے متعلق صرف بلوم ہارٹ کے معلومات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے اصل مثنوی دیکھی نہیں ورنہ ایسی فاش غلطی نہ ہوتی مثنوی کے نظر سے گزرنے کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جو نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے وہ بھی صرف بلوم ہارٹ کا پیش کردہ ہے ورنہ ایسی ضخیم اور اہم مثنوی (جس کے چوبیس ہزار شعر ہیں) کا ضرور نمونہ دیا جاتا۔ جو رزمیہ مثنوی ہونے کے لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر تھی۔

پھر ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے قدیم تصنیفات کے جو حوالے دیے ہیں ان میں خاور نامہ کے ساتھ ڈاکٹر محمد قاسم صاحب کے کتب خانہ کا حوالہ دیا ہے۔ حکیم صاحب کو اپنے مکان سے قریب تر کتب خانہ سے

استفادہ کا موقع یقیناً ملا ہوگا۔ (۵) اردوئے قدیم میں شعرا کے حالات کے ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے مگر یہ امر حیرت انگیز ہے کہ عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کی مشہور ثنویوں مثلاً (۱) قطب مشتری (۲) سیف الملک و بدیع الجمال (۳) خاور نامہ (۴) علی نامہ (۵) شریعت نامہ وغیرہ کسی کا کوئی نمونہ نہیں ہے حالانکہ ان میں کی ہر ایک ثنوی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے نمونوں کا نہ ہونا کتاب کو بہت بڑی حد تک ناقص اور نامکمل رکھتا ہے معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب نے ان ثنویوں کو دیکھا نہیں ہندوستان میں ان میں سے اکثر کا کوئی نسخہ نہیں ہے اول الذکر چاروں ثنویاں قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کی زبردست ثنویاں ہیں جو دکھنی ادب کی جان قرار دی جا سکتی ہیں یا ان ہی کے نمونوں کا نہ ہونا کس قدر حیرت انگیز ہے!!

(۶) مندرجہ حاشیہ کتابوں کے ساتھ ڈاکٹر محمد قاسم صاحب ماہر سمیات کے کتب خانہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ چونکہ ان کتابوں کا کوئی نمونہ درج نہیں کیا گیا ہے اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے ان کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

(۱) سیف الملک و بدیع الجمال
(۲) خاور نامہ
(۳) علی نامہ
(۴) بہرام وگلدام
(۵) مخزن عشق

ہم نے ڈاکٹر صاحب سے ان کتابوں کے متعلق دریافت کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا غالباً ان کے کتب خانہ میں موجود ہیں مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کا کتب خانہ نہایت وسیع ہے اور اس کی کوئی فہرست نہیں ہے اس لئے جب تک کوئی کتاب دیکھی نہ جائے اس کے متعلق حوالہ دینا صحیح نہیں ہو سکتا ہر مؤلف کا فرض ہے کہ پوری تحقیق کے بعد اپنے معلومات مندرج کرے۔

(۷) علی نامہ کی تاریخ تصنیف کو قیاساً نپالہ کی فتح ۱۰۷۱ھ کے بعد قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ فتح اس سے پہلے ہوئی ہے علی نامہ میں اس کے بعد کے دوسرے قصیدے بھی شامل ہیں چنانچہ اس میں ملناڑ کی فتح کا قصیدہ شامل ہے اور یہ فتح ۱۰۷۴ھ میں ہوئی ہے (تاریخ علی عادل شاہ مصنفہ نور اللہ) اس سے واضح ہے کہ علی نامہ ۱۰۷۴ھ کے بعد تصنیف ہوا ہے برٹش میوزیم کے ایک مخطوطہ سے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ ظاہر ہوتا ہے۔

لکھا سنہ کا میں جس جو یو کرا وس ہزار ایک ہور ستر یہ تھے چھ برس

(۸) ابن نشاطی کی ثنوی پھول بن کی تاریخ تصنیف ۱۰۷۶ھ قرار دی گئی ہے حالانکہ اس کے صحیح تر نسخوں سے ۱۰۶۶ھ واضح ہوتا ہے جن میں تاریخ تصنیف کا شعر اس طرح ہے:۔

اتھا تاریخ لایا نون یو گلزار۔ اگیارہ سو کون کم تھے تیس پر چار

اسی طرح ابن نشاطی کی دوسری تصنیف طوطی نامہ کو قرار دیکر اس کی تاریخ بھی ۱۰۷۶ھ بتائی گئی ہے

حالانکہ اس طوطی نامہ کا کہیں وجود نہیں ہمارا خیال ہے کہ ابن نشاطی نے یہ مثنوی نہیں لکھی۔

(۹) ولی ویلوری کے نام کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے اس کا نام جیسا کہ اردوئے قدیم میں درج ہے محمد فیاض نہیں تھا بلکہ میر ولی فیاض تھا۔ اس کی تصدیق نہ صرف رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی مملوکہ روضۃ الشہدا سے ہوتی ہے بلکہ ان کے خاندانی شجرہ میں بھی یہی نام پایا جاتا ہے جس کو راقم نے ان کے رشتہ دار کے یہاں دیکھا ہے۔

سدہوٹ کے قیام کے بعد انھوں نے اپنی جاگیر جیٹ پیٹ (علاقہ مدراس) میں اقامت کی اور وہیں انتقال کیا۔ ارکاٹ کے محلہ اسد پورہ میں ان کا مزار ہے۔

(۱۰) دور مغلیہ میں صنعتی کا ذکر کیا گیا ہے (صفحہ ۹۶) مگر اس کی زبردست مثنوی "عشق صادق" کا ذکر نہیں ہے جو انڈیا آفس میں ہے اور اس کا ذکر بلوم ہارٹ کی فہرست میں موجود ہے۔

نصیر الدین ہاشمی۔

ہندی اردو مالا

مؤلفہ پنڈت ہری ہرشا ستری۔ پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ مطبوعہ چندرا کانت پریس گولی گوڑہ حیدرآباد

قیمت (۸/)

یہ کتاب اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جو اردو داں طبقہ میں ہندی رسم الخط اور بولی کا تعارف کرانے اور اس کی تحصیل میں آسانی پیدا کرنے کے لئے کلیہ جامعہ عثمانیہ کے لائق پروفیسر سنسکرت اور ہندی پنڈت ہری ہر شاستر[ی] ترتیب دے رہے ہیں۔ پنڈت جی کی مرتبہ پہلی "ہندی اردو مالا" مقبولیت کی نظروں سے دیکھی گئی اور اس کی بدولت ہندی بھاشا کا پڑھنا اور لکھنا آساں ہو گیا۔

اس دوسری کتاب کی ترتیب ظاہر کرتی ہے کہ یہ بھی فائدہ مند ثابت ہو گی اس میں پہلے تو چند ضروری اصول پیش کرکے ہر حرف کا ملاپ مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ یہ چیز مبتدیوں کے لئے نہایت کارآمد ہے۔ اس کے بعد چند سبق ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھے گئے ہیں اور ان میں جو مشکل الفاظ آئے ہیں اُن کے معنی ہر سبق کی ابتدا میں لکھدئے ہیں۔ اور چند سبق محض ہندی میں لکھے ہیں تاکہ طلبہ کو پڑھنے کی کافی مشق ہو سکے۔ اور آگے سنسکرت کی تعلیم میں بھی اس سے مدد حاصل ہو۔

اس کتاب میں جتنے مضمون پیش کئے گئے ہیں سب مولک یعنے اپجی ہیں اس کے لئے مرتب کو کافی محنت

اور توجہ کرنی پڑی ہوگی۔ پنڈت جی کا خیال ہے کہ اس سلسلہ کے تیسرے حصہ کے لئے اونچے درجہ کے شعرا کا کچھ خاص شیریں کلام بھی انتخاب کیا جائے۔ یہ بہت مفید ثابت ہوگا اور اس کے بغیر ہندی سیکھنے والے معیاری زبان اور اس کے شعرا سے واقف نہ ہوسکیں گے۔

آج کل ہندوستان میں زبانوں کی طرف کافی توجہ کی جارہی ہے یہ مسئلہ اردو داں طبقہ کے لئے روز بروز زیادہ اہم بنتا جاتا ہے۔ تمام ملک کے لئے ایک مشترکہ قومی زبان قرار دینے کی تجویز ہر جگہ مقبولیت حاصل کرچکی ہے مگر کوئی گھڑی ایسی نہیں آئی جب کہ رسم الخط کی گتھی سلجھ سکتی۔ یہ کام ابھی ایک عرصہ تک دشوار نظر آتا ہے بحالت موجودہ یہی ضروری ہے کہ ناگری رسم الخط استعمال کرنے والے اُردو خط سے واقفیت حاصل کریں۔ اور اردو داں ناگری سیکھیں۔ اس کے بغیر باہمی اتحاد وارتباط ترقی نہیں کرسکے گا۔ اور بیگانگی کی خلیج طوفانی رفتار کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔

ان خیالات کے مدنظر اردو داں طبقہ کو پنڈت ہری ہر شاستری کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس اہم ضرورت کی طرف توجہ کی اور اپنے مقصد میں کامگار رہے۔ اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی تھی جس کی مدد سے ہندی بھاشا اس قدر آسانی کے ساتھ سیکھی جاسکتی ہو۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری

فہرست مضامین مجلہ مکتبہ

(جلد ہفتم)

۱۔ مضامین

۲۔ افسانے

مجلہ مکتبہ

۲- منظومات

انتقادیں

تصاویر

تصنیفات حضرت سلطان جہاں بیگم مرحومہ

حضرت نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ سابق فرمانروائے بھوپال نے عورتوں کی اصلاح و ترقی اور ان میں تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کی ترویج کے لئے جو عظیم الشان کوششیں فرمائیں اور جس طرح کی شاندار اسلامی اور علمی و تعلیمی خدمات انجام دی ہیں ان سے کون ناواقف ہے۔ آپ کی مفید تصنیفات جو سلیس اور دلکش انداز بیان میں ہوتی ہیں، خاص طور پر خواتین کے لئے مفید ہیں عورتوں کے حقوق، بچوں کی پرورش اور تربیت، معاشیات خانہ داری، تیمارداری وغیرہ کل ضروریات نسوانی پر آج تک کسی نے اس جامعیت اور توجہ سے قلم نہیں اٹھایا جو آپ کی خاص خصوصیت ہے آپ کی یہ تمام مفید کتابیں جو صحت اور اہتمام سے چھپی ہیں، ہمارے ہاں سے مل سکتی ہیں:-

سیرت مصطفیٰ | سلیس اور سادہ اردو میں آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک جو صحیح روایات پر مبنی ہے اور خاص طور پر عورتوں کے مطالعہ کے لئے تیار کی گئی ہے قیمت (عہ)

سبیل الجنان | ارکان اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اور دیگر شعائر اسلامی پر عورتوں کے مطالعہ کے لئے ایک دلچسپ اور اور بسیط کتاب ہے۔ قیمت (عالہ)

عفت المسلمات | پردے کی نسبت شرع شریف کے نقطہ نظر کی تشریح کے بعد مشرق اور مغرب کے حالات حاضرہ کی روشنی میں عالمانہ نقد و نظر قیمت (عہ)

اسلام میں عورت کا مرتبہ | اسلام نے عورت کو کیا مرتبہ دیا اور ان کی عزت و احترام کی نسبت کیا ہدایات دی ہیں ان پر ایک دلکش تقریر جو لیڈیز کلب بھوپال میں کیگئی ہے قیمت (۵/)

مقصد ازدواج | اس کتاب میں ناکتخدا لڑکوں اور لڑکیوں کو شادی کے اصل مقاصد اور حسن معاشرت کے نکات عقلی اور اسلامی نکتہ نظر سے پیش کئے گئے ہیں قیمت (۱۲/)

فرائض النسا | معاشیات خانہ داری، مکان اور اس کا سامان، ملازمین، صفائی، لباس، غذا، پانی، تیمارداری، بچوں کی پرورش و تربیت غرض عورت کے فرائض زندگی کے ہر پہلو کو سلیس پیرایے میں اور اختصار کیساتھ پیش کیا گیا ہے قیمت (عالہ)

ہدیۃ الزوجین | یہ نکاح میاں بیوی کے حقوق، تعداد ازدواج وغیرہ پر شرعی احکام کی روشنی میں ایک مفید رسالہ ہے قیمت (۱۰/)

حفظ صحت | عورتوں کے لیے جسم و جان کی حفاظت اور ابتدائی طبی امداد کی معلومات قیمت (عہ)

ہدایات تیمار داری | بیماری کی تیمار داری علاج سے زیادہ ضروری اور مشکل ہے اس موضوع پر ضروری علومات کا مجموعہ قیمت (۵/)

تربیت الاطفال | اس کتاب میں بچوں کی تربیت کے اُصول اُن کے مشاغل کا انتخاب، ذہنی اور اخلاقی تربیت و اصلاح اور اعلیٰ جذبات کی ترقی اور بری عادتوں سے بچاؤ کی تدابیر بیان کی گئی ہیں۔ قیمت (۱۰/)

بچوں کی پرورش | چھوٹے بچوں کی پرورش، ان کی غذا، لباس اور بیماریوں کے علاج پر ایک بے مثل کتاب جو کئی اردو اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ قیمت (عالہ)

تندرستی | اس کتاب میں حفظان صحت کے تمام اُصول، امراض متعدی سے حفاظت کی تدابیر اور تیمار داری کے طریقے اور علاج معالج متعدد انگریزی کتابوں سے اخذ کرکے لکھے گئے ہیں قیمت (عہ)

مطبخ کنگ جارج | اس میں بتایا گیا ہے کہ غذا اور ترکیب غذا میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے اور ایسے کھانے جو عموماً بیمار کے واسطے مفید ہوں کیونکر تیار ہوتے ہیں اور حالت بیماری میں ہم اپنے مریضوں کے لئے کس طرح اور کس قسم کی زود ہضم غذا تیار کرسکتے ہیں قیمت (عالہ)

علم زراعت | نباتیات پر ایک ابتدائی رسالہ جس میں پودوں کی پرورش اور کاشتکاری کے طریقے بیان کیے گئے ہیں قیمت حصے اول و دوم (عہ/ ۹/)

سلک شہوار | اگر آپ تعلیم نسواں کی ترقی کے بارے میں بیگم صاحبہ بھوپال کے خیالات وضاحت سے معلوم کرنا چاہیں تو یہ کتاب پڑھیے جو موصوفہ کی اس موضوع پر تمام تقاریر کا مجموعہ ہے قیمت (عہ)

مہذب زندگی | اس میں اسلامی احکام و ہدایات اور مسلمانوں کی تاریخی حکایات کو درج کیا گیا ہے تاکہ ہر ایک ہونہار ابتدا سے کچھ نہ کچھ اپنے مذہب کے اخلاقی احکام سے اور بزرگوں کے اخلاق و عادات حسنہ سے واقفیت حاصل کرے قیمت (۱عہ)

مدارج الفرقان | جس میں قرآن مجید کے متعلق بچوں، عورتوں اور عام معلومات کے لئے چند ضروری مضامین درج ہیں قیمت (۵/)

باغ عجیب | اس کے تین حصے ہیں جن میں (۳۳) مختلف کہانیاں ہیں جو تمام تر اخلاقی نصیحتوں سے معمور ہیں قیمت حصہ اول دوم سوم (۱۰/) (عہ) (۱۰/)

فرائض باغبانی | یہ مختصر رسالہ اُن کیلئے بیحد مفید ہے جنہیں باغات کا شوق ہے اور باغات کی پیداوار سے دلچسپی ہے اس میں جنوری سے ڈسمبر تک جو جو کام ہر مہینے میں ہونی چاہئیں ان کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے ضخامت (۱۱۰) صفحات قیمت (۵/)

المشتہر — مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) متصل صدر ڈاک خانہ انگریزی حیدرآباد دکن

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔ یہ علمی وادبی رسالہ ہے جس میں علم وادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم از کم چار جز ہوگا۔

بنظر احتیاط پرچہ سرٹفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ/) فی پرچہ ۶/ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کیلئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی کیلئے (عہ/۱۲) ہے اگر زیادہ مدت کیلئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں (۱۲½) فیصدی سے (۲۵) فی صدی تک کمی ہوسکے گی۔

ترسیل زر مضامین اور جملہ خط وکتابت منتظم مجلہ مکتبہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے

باھتمام

محمد نظام الدین مددگار منیجر مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد

صرف ٹائٹل مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد

ڈھائی سو روپیہ

کے

پانچ انعام

مجلہ مکتبہ

کے قلمی معاونین کو سال بھر کے بہترین مضامین کے لیے حسب تفصیل ذیل عطا کئے جائیں گے

۱ - ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے، بی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ — صہ — **مختصر ڈراما** — ایک ایکٹ کا اچھی اور ہندوستان کی معاصرت کے مطابق ہو۔

۲ - مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ۔ ال ال ۔ بی ۔ پروفیسر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ — صہ — **تاریخی مقالہ** — ریاست حیدرآباد اور خاصکر گولکنڈہ کی سلطنت سے متعلق ہو۔

۳ - مولوی عبد القادر صاحب صدیقی ام اے، پروفیسر کلام کلیہ جامعہ عثمانیہ — صہ — **تنقیدی مضمون** — اردو کے کسی مصنف یا شاعر پر تحقیقی اور انوکھے رنگ میں۔

۴ - مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل، دفتر دیوانی فینانس ۔ ریاست حیدرآباد — صہ — **تحقیقی مضمون** — تاریخ اسلام سے متعلق

۵ مدیر مکتبہ — صہ — **مختصر افسانہ** — حیدرآباد کی زندگی کے کسی پہلو پر

نوٹ:۔ (۱) تاریخی اور تنقیدی مضامین نہایت تحقیقی ہوں اور ڈرامے اور افسانے بالکل اچھے۔ (۲) کوئی مضمون رسالہ کے تیس صفحوں سے زیادہ طویل نہ ہو۔ (۳) جو مضامین انعام کے اہل قرار دئے جائیں گے ان کا اعلان ماہ آبان ستمبر میں ہوگا۔ (۴) انعاموں کی تقسیم ماہ آذر نومبر میں عمل میں آئے گی۔ (۵) مضامین کی مجلس مبصرین مطبوعہ کے علاوہ فی الحال حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہوگی:۔

(۱) **ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم** ام اے، پی ایچ ڈی پروفیسر فلسفہ۔ (۲) **ڈاکٹر میر سیادت علی خان** ام اے ال ال بی ڈی فل بی سی ال پروفیسر قانون۔ (۳) **مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری** ام اے بی اس سی آنرز (مینچسٹر) پروفیسر کلیہ انجینیرنگ جامعہ عثمانیہ

کی

خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کریں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے "مجلّہ مکتبہ" بلاقیمت حاضر ہوگا یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے اُن کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلّہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ اُن کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اسی طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

رجسٹرڈ نشان سرکار آصفیہ (۶۵)

دار الاشاعت انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن
کا

رجسٹرڈ نشان سرکار انگلشیہ (......)

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر عبد القادر سروری ام اے ال ال بی

جلد ۸	بابتہ ماہ دی ۱۳۴۱ ف	فہرست	مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۲ء	شمارہ ۲

آذر کے رسالہ سے قارئین کرام نے اس فرق کو محسوس کیا ہوگا جو معیار کی بلندی اور ارتقائے ترتیب ظاہر کرتا ہے
اب ہم ماہ دی کی اشاعت پیش کر رہے ہیں اور اس میں بھی آپ وہی خصوصیتیں موجود پائیں گے ۔
اس وقت تک مجلہ مکتبہ نے ملک کو، اردو ادب کو، اور ساتھ ہی مکتبہ ابراہیمیہ کو جو فائدے پہنچائے ہیں وہ اگرچہ بظاہر نمایاں نظر نہیں آتے لیکن کسی حقیقت شناس اور دور بین نظر سے یہ امر مخفی نہیں کہ "مکتبہ" ہی حیدرآباد کا وہ واحد رسالہ ہے جو ایک مدت سے مستقل طور پر نکلتا چلا آرہا ہے ۔ اور اگرچہ بعض پست مذاق اور علمی اہمیت نہ رکھنے والے رسالوں کی طرح اس نے کسی وقتیہ شان و شوکت اور جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا لیکن ملک و ادب کی خدمت کرنے کی اپنی قدیم روش کو اس نے آج تک باقی رکھا ۔ حیدرآباد میں ایسے کتنے رسالے ہیں جو سنجیدگی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں ؟
"مکتبہ" نے نہ صرف کئی ایسے قدیم دکنی شعرا اور مصنفین کو اردو دانوں میں روشناس کر دیا جن کے متعلق سوائے مکتبہ کی پرانی جلدوں کے اور کہیں معلومات حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ متعدد نوجوان مضمون نگاروں کو تیار کیا اور ان کی قدر افزائی کی آج خدا کے فضل سے مکتبہ کے قلمی معاونین میں نہ صرف تنقیدی و تاریخی مضامین لکھنے والے ہیں بلکہ افسانہ نگار اور ڈراما نویس بھی ۔
ملک و ادب کی خدمت کے ساتھ ہی خود مکتبہ ابراہیمیہ کو "مجلہ مکتبہ" نے فائدے سے محروم نہیں رکھا جہاں جہاں رسالہ جاتا ہے ۔ مکتبہ ابراہیمیہ، اس کے بک ڈپو، اس کی مطبوعات کی اشاعت و تشہیر عمل میں آتی ہے لیکن یہ کام اس واقعہ کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ رسالہ ہی کی وجہ سے اہل ذوق حضرات پر ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ مکتبہ کا مقصد در اصل پاک اور سنجیدہ ہے اور وہ ملک اور علم و فن کی سچی خدمت کرنا چاہتا ہے ۔

مجلہ کی اس اشاعت کے اکثر مضامین اپنی نوعیت میں قابل قدر ہیں "حضرت نظام الملک آصفجاہ" پر

اگرچہ اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے لیکن ان کی ہستی کے متفرق پہلو ایسے ہیں کہ ان پر جس قدر لکھا جائے کم ہے۔
جو حضرات اس موضوع سے تحقیقی دلچسپی رکھتے ہوں وہ دیکھیں گے کہ نوجوان مضمون نگار کی یہ کوشش نئی معلومات اور کدوکاوش سے محروم نہیں ہے۔ ہاشمی صاحب کا مضمون "انڈیا آفس کے چند دکھنی دیوان" اس سلسلہ مضامین کی آخری کڑی ہے جو ایک عرصہ سے ہندوستان کے مختلف علمی صحیفوں میں مسلسل شایع ہو رہے ہیں۔

چیخوف کے ایک بلند پایہ افسانہ کا ماخوذ ترجمہ جناب اعظم خان صاحب کے قلم سے شایع ہو رہا ہے۔ ترجمہ کی فضا کو اس قدر اپنا لیا ہے کہ لطف دوبالا ہو گیا اور افسانہ کی "روح عمل" اپنی اصلی حقیقت کے ساتھ باقی ہے۔ اس قسم کے ماخوذ ترجمے ملک کے ادبی مذاق کو بڑھانے میں بہت مدد دے سکتے ہیں۔ ہماری زبان کے وہ نئے انشا پرداز جنھیں افسانہ لکھنے کے لئے کوئی اچھی خاکہ حاصل نہ ہوتا ہو، وہ دوسری زبان کے افسانوں کو اس طرح اپنی معاشرت کے مطابق بنا کر اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا کر سکتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے نہ صرف اُن کی تخلیقی قوت ترقی پائے گی بلکہ اردو ادب میں بھی افسانوں کا اضافہ ہوتا رہے گا۔

نورالہدیٰ صاحب کا مضمون "سینما" اپنی قسم کی یہ ایک خاص چیز ہے جس میں سینما پر صرف ایک حسن کارانہ فن ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ سینماٹوگرافی کے علمی پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اختصار کے ساتھ ہر چیز کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس قسم کے مضامین اردو کی وسعت کے لئے صرف مفید ہی نہیں ضروری بھی ہیں۔ اگر یہ مضمون مقبول ہوا تو ہم اس قسم کے دیگر مضامین بھی شایع کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان مضامین کے علاوہ دو غزلیں ہیں جن میں سے ایک علی حسین صاحب زیبا کی فکر کا نتیجہ ہے۔ اور اس کی "سادگی" اور "پرکاری" ناظرین کو بہت پسند آئے گی۔

اسی سلسلے میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جدید نظم و نثر کے ساتھ ساتھ قدیم نظم و نثر کے ایسے نمونوں کے پیش کرنے کا التزام بھی اس رسالہ سے شروع کر دیا گیا ہے جن کا مطالعہ یہ واضح کرتا رہے گا کہ ہماری زبان کے قدیم سرمایہ میں اُن جواہر پاروں کی کمی نہیں جو جدید ترین ادبی ذوق کے معیار سے کسی طرح گرے ہوئے نہیں ہیں۔ اس قسم کے جواہر پاروں کے انتخاب میں ہمیں ڈاکٹر سید محی الدین قادری کے وسیع مطالعے اور ذوق انتخاب سے مدد ملتی رہے گی۔ اگر دیگر اہل ذوق حضرات بھی اردو کی قدیم نظم و نثر کی کتابوں سے مختصر اعلیٰ ادبی ٹکڑے انتخاب کر کے روانہ فرمائیں تو مکتبہ شکریہ کے ساتھ انہیں شایع کرے گا۔ اس رسالے میں دیوان زادہ حاتم سے "مثنوی قہوہ" حاصل کی گئی ہے۔ اور آئندہ رسالے میں ڈاکٹر نذیر احمد

فسانۂ مبتلا کا ایک پارہ "نینی تال کی سیر" پیش کیا جائے گا۔

اردو دنیا کی خبروں میں خاص طور پر قابل ذکر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اردو اکاڈمی کی بنیاد ہے۔ جامعہ ملیہ ملک و قوم و ادب کی جو قابل قدر خدمتیں انجام دے رہی ہے ان میں اردو اکاڈمی کے قیام سے بہت مدد ملے گی۔ اور کتابوں کی اشاعت اور تعداد اشاعت میں چند در چند سہولتیں پیدا ہو جائیں گی۔ اردو اکاڈمی کی رکنیت کا سالانہ چندہ چوبیس روپے ہے، جس کے معاوضے میں چوبیس روپے کی کتابیں اور سال بھر کے لئے "جامعہ" اور "پیام تعلیم" ہر رکن کو اکاڈمی کی طرف سے ملا کرے گا۔ اردو سے ذوق رکھنے والوں کو اس ادارے کی سرپرستی میں حصہ لینا چاہیئے۔ اسی سلسلے کی ایک دوسری خبر بھی غالباً دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ اس سال کلیہ جامعہ عثمانیہ کے "یوم کلیہ" کے سلسلے میں جو متفرق علمی اور ادبی سرگرمیاں ظاہر کی گئیں اُن میں کامیاب مشاعرے کا انعقاد اور "جلسہ معاشرتی" کا ڈرامہ سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ مشاعرہ مہاراجہ صدر اعظم بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اور کالج کے شاعر طلبہ کے علاوہ حیدرآباد کے دیگر سخن گو حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ طلبہ میں زیبا، علیم اور باقی اور مہمانوں میں نواب عزیز یار جنگ، سائل، جوش اور لبیب کی غزلوں اور نظموں نے ناظرین کو بیحد محظوظ کیا۔ مشاعرہ اپنی خوبی ترتیب، رونق اور اجتماع کی وجہ سے خاص طور پر کامیاب رہا۔ مگر ناظرین مکتبہ جس خبر کو خاص دلچسپی سے پڑھیں گے وہ ہمارے نائب مدیر جناب عزیز احمد صاحب کے مختصر اور جامع ڈراما "وہ کالج کے دن" کی غیر معمولی کامیابی ہے۔ یہ ڈراما کئی وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کے اداکار کالج کے طالب علم تھے جو اگرچہ فن اداکاری سے ناواقف تھے۔ لیکن ان کے ادبی اور علمی ذوق و تربیت نے اس کو توقع سے زیادہ کامیاب بنایا۔ صدر کلیہ مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری قابل مبارکباد ہیں کہ ان کے ذوق ڈراما اور علمی دلچسپی نے نہ صرف ایک اچھے ڈراما نگار کی کوشش کو عملی جامہ پہنا کر اس کی ہمت افزائی کی بلکہ کلیہ کی ادبی دلچسپیوں میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ ہمیں توقع ہے کہ کلیہ کے ارباب حل و عقد اب ایک ڈراما سوسائٹی قائم کر کے اس اعلیٰ ذوق کے ارتقا میں مدد دیں گے۔ اس ڈرامے کے دیکھنے کے بعد یقین ہو گیا کہ جامعہ عثمانیہ کے طالب علم جہاں خالص علمی اور تحقیقی کوششوں میں کامگار رہے ہیں۔ فنون لطیفہ میں بھی مہارت حاصل کرنے میں پیچھے نہیں ہیں۔ موسیقی اور اداکاری کی مہارت کا انہوں نے اس موقع پر جس قدر اظہار کیا ہے وہ آئندہ کے لئے بہترین توقعات پیدا کرنے کا باعث ہے۔ ڈاکٹر سیادت علی خان نے اس ڈرامے میں ایک پارٹ لیکر ایک طرف تو ڈراما نگار کی عزت افزائی کی اور دوسری طرف ثابت کر دکھایا کہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر طلبہ کا ہاتھ بٹانے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ہم آخر میں عزیز احمد صاحب کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ اسی طرح اپنے ڈراموں سے اردو ادب کی خدمت کرتے رہیں گے۔

از

جناب قاضی ابن مظہر رہبر فاروقی

جب مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب عظیم مشرق و مغرب کی طرف بے انتہا بڑھا چلا جا رہا تھا، تو اس سے راستے ہی میں کئی شاخیں پھوٹ پڑیں اس کو روکنے کے لئے اُس وقت دنیا میں کوئی ایسی قوت یا حکومت موجود نہ تھی، جو سدّ راہ ہو کر اس کی روانی اور تیزی میں تفرقہ ڈال دے۔ اس طرح وہ تبدیل ہوتے ہوتے، مشرق و مغرب کی گشت لگا کر، آخر ہندوستان میں آ کر تھما۔ اور مغلیہ خاندان کی شکل اختیار کر کے، صدیوں ہند کی شاہنشاہت کی جس کے نام آور سلاطین کی شان و شوکت کے آگے آسمان کی بھی رفعت ہیچ تھی۔ اور جن کی حکمرانی کا غلغلہ تمام عالم میں ایک زبردست ہیبت ڈالے ہوئے تھا۔

عُروج و زوال کے اُصول کے تحت، جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب قریب غروب تھا تو اس وقت، خداوند عالم نے خاک ہند سے ایک قائدِ اعظم، یعنی حضرت آصف جاہ اول کی ذات والا صفات کو کھڑا کر کے بندگان خلق کی خدمت لی۔ آپ کے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ صرف یہ مضمون اُس ارادہ کا ایک موہوم سا خاکہ ہے جو ہم اس حیثیت سے اِس موضوع پر قلم اُٹھانا چاہتے ہیں۔

حضرت آصف جاہ اول علیہ الرحمۃ کے جد امجد، خواجہ عابد قلیچ خان اور والدِ ماجد شہاب الدین، غازی الدین خان بہادر، فیروز جنگ اول ہیں۔ جو عالم گیری دربار میں منصب ہفت ہزاری پر معزز و ممتاز تھے، آپ ایک بہادر سپاہی اور اُمور مملکت میں ایک بہترین مدبّر ہونے کے علاوہ حلقۂ طریقت میں بھی ایک خدا رسیدہ، درویش صاحب کمال تھے علامہ میر غلام علی آزاد نے تذکرۂ "خزانہ عامرہ"، میں حضرت خواجہ عابد[1] کے متعلق لکھا ہے کہ، منصب

---

[1] خواجہ اسماعیل کے فرزند تھے، جو اپنے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کے باعث، سمرقند میں نہایت ممتاز و محترم مانے جاتے تھے۔ اب تاریخ

ہفت ہزاری وصدارت کل سے سرفراز تھے۔ آپ سمرقند سے آئے اور شاہ جہانی عہد میں منسلک ملازمت ہوکر اجمیر وملتان کی صوبہ داری سے سرفرازی پائی۔ شہنشاہ عالم گیر کے ساتھ دکن تشریف لائے اور محاصرۂ گول کنڈہ میں شریک رہے۔ اتفاق سے اس جنگ میں ایک گولی آپ کے دست راست پر لگی جس سے شدید زخم آیا، اور ہاتھ ضائع ہوگیا۔ میدان جنگ سے اپنے خیمہ میں تشریف لائے، اور جراح کو ہاتھ کی مرہم پٹی کے لئے طلب فرمایا، جراح فوراً حاضر ہوا۔ آپ اس وقت قہوہ نوشی میں مصروف تھے جراح حسب الحکم زخمی ہاتھ کی ٹوٹی ہڈیوں کو نکالتا رہا، اور آپ بلا تکلف دوسروں سے باتیں کرتے ہوئے قہوہ نوش فرماتے رہے عالم گیر نے فی الفور عمدۃ الملک اسد خاں کو حضرت کی مزاج پرسی کے لئے بھیجا، جب خانِ موصوف خیمہ میں داخل ہوئے، تو اس ماجرے کو دیکھ کر دنگ ہوگئے۔ غرض یہ کہ زخم کاری لگا تھا، اس لئے تیسرے دن ٢٤ ربیع الاول ١٠٩٨ھ کو اپنی جان، ملک و مالک پر نثار کردی۔ کیا کوئی دوسرا خاندان ایثار ووفاداری کی ایسی نادرالوجود مثال پیش کرسکتا ہے۔ یہ حسن اتفاق دیکھئے کہ جس سرزمین کے لئے آپ نے اپنی جان قربان کی، وہ آج ان کے مبارک جانشینوں کی بلا شرکت غیرے قبضۂ تصرف میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ملکیت کو ابد الآباد تک سلامت رکھے، اور دشمنوں کی نظر بد سے بچائے۔

حضرت آصف جاہ کے والد، شہاب الدین خان المخاطب بہ نواب غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ اول شہنشاہ عالم گیر کے نہایت درجہ مورد الطاف تھے، چنانچہ کئی دفعہ عالم گیر نے آپ کی جاں نثاری اور وفاداری کی تعریفیں کی ہیں جس کے عالم گیری عہد کے اوراق تاریخ شاہد ہیں۔

ایک مرتبہ آپ کو آشوب چشم کا مرض لاحق ہوا اس کی خبر عالم گیر کو ہوئی، تو آپ کے نام ایک عیادتی خط لکھ کر سعادت خان کے ہاتھ روانہ کیا جس سے اورنگ زیب کے اُنس ومحبت کا اظہار ہوتا ہے۔

"من می خواستم کہ برائے عیادتِ آن دولت خواجہ بیایم۔۔۔۔۔ وازمیوہ ہائے نورس انچہ ہم می رسد انگور است اما اطبائے یونان برائے آن عمدہ مخلصاں مزاج دان مضر می گویند۔ لہذا ماہم برخود ناگوار کردیم۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٥) میں عام طور پر "عابد قلیچ خان" کے نام سے مشہور ہیں۔ خواجہ صاحب کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں۔ اپنے خاندانی زرثئے یعنی علم وفضل میں کمال حاصل کیا، اور سمرقند سے بخارا آگئے، یہاں ابتدائً قاضی، پھر شیخ الاسلام بنائے گئے۔ وطن سے دل برداشتہ ہوکر باعزت عہدوں کو ترک کرکے ہندوستان آئے۔ ١٦٧٧ء میں حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد "چین قلیچ خاں" کا خطاب دربارِ عالمگیری سے حاصل فرمایا۔ ١٦٨١ء میں شاہنشاہ کے وزیر اعظم بھی بنائے گئے۔

اور ایک مرتبہ معرکۂ بیجاپور میں عالم گیر نے آپ کو گلے لگا کر یہ کہا "حق سبحانہ تعالیٰ از تردد فیروز جنگ شرم اولاد تیموریہ نگہ داشت آبروئے اولاد او تا دور قیامت خدا نگہ دارد" کہتے ہیں کہ بیجاپور کے حملہ میں عالم گیری فوجوں کو رسد نہ ملی جس سے فوج میں پریشانی پیدا ہو گئی، اورنگ زیب کو جب اس کی خبر ہوئی تو فیروز جنگ بہادر کو طلب کر کے فراہمی رسد، اور پرزور حملہ کا حکم دیا۔ اس دلیر سپہ سالار نے قوت و جوانمردی دکھلائی کہ دشمنوں کے پیر میدان جنگ سے اکھڑ گئے، مال و دولت، اور رسد کافی ہاتھ لگی۔ فتح و نصرت کے نقارے بجنے لگے جب ان کی صدا عالم گیر کے کانوں میں گونجی، تو خدائے قدوس کی درگاہ میں نہایت خلوص دل سے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ اور اپنے عزیز ترین سپہ سالار کے لئے بھی دعا کی۔

آپ نے اس طرح نیک نامی کے ساتھ زندگی بسر فرمائی۔ آخر عمر میں شاہ عالم نے گجرات کی صوبہ داری پر مامور کیا تھا اور وہیں ۱۱۲۲ھ میں بہ مقام احمد آباد راہیٔ خلد بریں ہوئے۔ آپ کی میت احمد آباد سے دہلی لائی گئی۔ اور یہاں اجمیری دروازہ کے قریب سپرد خاک کئے گئے۔ حسب فرمان شہنشاہ عالم گیر آپ کا عقد سعد اللہ خان کی لڑکی "سعید النسا بیگم" سے ہوا، جو شاہ جہاں کے وزیر اعظم تھے جن کی ہر دل عزیزی بادشاہ کی نظر میں اس قدر تھی کہ جس وقت ان کا انتقال ہوا، تو بادشاہ جنازہ کے ہمراہ رہا۔ راستہ میں چوبداران میت کے آگے آگے یہ مصرع پڑھتے جاتے تھے۔

"وزیر معظم ز دنیا گذشت"

اور پیچھے شاہ جہاں کی زبان پر یہ مصرع :-

"بہ ہنگام پیری عصایم شکست"

رواں تھا۔ اسی مقدس باپ کی بیٹی سے وہ فرزند تولد ہوا، جو اپنے عہد کا ہند میں فرد فرید تھا اور اس کے علاوہ جس کی قسمت میں دکنی آصفیہ سلطنت کی بنیاد رکھنی تھی، اس گوہر شب چراغ کی ولادتِ مسعود ربیع الثانی کی چودہ تاریخ سنہ ۱۰۸۲ھ میں ہوئی۔ فرزند دلبند کی ولادت سے ماں باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، فیروز جنگ بہادر، دوڑے اور اپنے محسن آقا کے دربار میں اس مسرت کی اطلاع دی۔ معصوم نومولود کو عالم گیر نے "قمر الدین" کے نام سے موسوم کرنے کا حکم دیا، اور کسی نے اسی زمانہ میں آپ کی تاریخ ولادت "نیک بخت" کہی۔ ابھی آپ نے اپنی معصوم زندگی کے چھٹے سال ہی میں قدم رکھا تھا کہ منصب سے سرفراز ہوئے۔ عالم گیر جیسی مردم شناس ہستی کے سامنے یہ مقدس صاحبزادہ پیش ہوا تو فرمایا کہ "آثار بزرگی در ناصیہ اش ہویدا"

جب آپ نے بچپن سے عملی زندگی میں قدم رکھا اور انیس سال کی عمر کو پہنچے تو اورنگ زیب نے ۱۰۹۱ھ میں جدّی خطاب "چین قلیچ خان" اور صوبہ داری بیجاپور و منصب پنج ہزاری سے سربلند فرمایا۔

نواب مغفرت مآب نے دور عالمگیری میں متعدد خدمات انجام دیں تسخیر کرناٹک میں آپ نے نہایت جان فشانی دکھلائی۔ شاہ عالم بہادر شاہ، اور اعظم شاہ کی آپس کی خانہ جنگیوں کے وقت اپنے آپ کو ان سے علیحدہ رکھا حالانکہ اس وقت آپ بحیثیت صوبہ دار بیجاپور، شہزادہ اعظم کے ماتحت تھے۔ جنگ کے اختتام کے بعد، بہادر شاہ، کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور "اودھ" کے صوبہ دار بنائے گئے۔ بہادر شاہی دربار سے، خطاب "خان دوران بہادر" عطا ہوا۔ اس وقت گورگانی خاندان کا قصر حکمرانی قریب انہدام تھا۔ عام اُمرائے کہ خود اُس قصر کے وارث انتہائی بے دردی کے ساتھ اُس کے ڈہانے میں مشغول تھے۔ غرض یہ کہ تیموریہ خاندان کی عظیم الشان سلطنت انحطاط پر تھی۔ اُمرا سرکش اور باغی ہو گئے تھے۔ درباریوں کی سازبازانہ کارروائیوں اور فرقہ بندیوں کو دیکھ کر حضرت نے صوبہ داری لکھنؤ سے کنارہ کشی اختیار فرمائی۔ اور ہندوستان کے جنوبی گوشے کو کُنج عافیت جانا۔ اور سرزمین دکن کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرما کر تقریباً پانچ سال تک یاد الٰہی میں مصروف رہے۔

جب ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کا انتقال ہوا، اور دلّی کی سلطنت جہاندار شاہ کے حصے میں آئی تو اس بادشاہ نے آپ کو مجبور کر کے گوشۂ تنہائی سے باہر نکالا، اور ایک معزز عہدہ پر مامور کیا۔ بادشاہ کو بازاری آدمیوں کے اعزاز و برتری میں زیادہ انہماک تھا، اس لئے تمام اُمرائے سلطنت ناراض ہو گئے۔ اس عرصہ میں فرخ سیر نے حملہ کیا، آگرے کے قریب جنگ ہوئی جہاندار شاہ مارا گیا، اور ہندوستان کی شہنشاہیت کا تاج، فرخ سیر کے زیب سر ہوا، تو آپ کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ دربار شاہی میں طلب کر کے "خطاب نظام الملک بہادر فتح جنگ" و منصب ہفت ہزاری کے ساتھ صوبہ دارِ دکن و فوجدار کرناٹک مقرر کیا۔

۱۱۲۷ھ میں امیر الامرا سید حسین علی خان نے فرخ سیر کی ناراضی کی وجہ سے صوبہ داری دکن کا فرمان حاصل کیا اور نواب نظام الملک کو طلب کر کے مراد آباد کی فوجداری کی خدمت سپرد کی۔ تین چار سال تک آپ یہیں رہے۔ ۱۷۱۸ء میں وزیر اعظم سید عبد اللہ خان کو معزول کرنے میں مدد دینے کے لئے، دہلی طلب کئے گئے۔ کیونکہ بادشاہ وقت و اُمرا، سادات بارہہ سے حد درجہ تنگ آ چکے تھے۔ جب آپ دلی پہنچے تو بادشاہ کی بزدلی کے باعث یہ سازش ناکام ہو گئی۔ پھر چندے یہیں قیام فرمایا۔ یہاں تک کہ سیدوں نے بادشاہ کو اندھا کر کے قید کر دیا۔ اور آخر میں قتل کر ڈالا اور یکے بعد دیگرے، رفیع الدولہ و رفیع الدرجات، بادشاہ بنائے گئے۔ بادشاہ گردوں نے اس زمانہ میں آپ کو پٹنہ کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ جب سیدوں نے روشن اختر محمد شاہ کو بادشاہ بنایا تو شاہ موصوف نے حضرت نظام الملک کو مالوہ کی صوبہ داری عنایت فرمائی۔ کچھ دنوں بعد حسین علی نے آپ کے خلاف الزامات لگائے تو حضرت آصف جاہ نے اُن کا

دنداں شکن جواب روانہ فرمایا۔ اس کے بعد حسین علی نے بادشاہ سے مالوے کی صوبہ داری بھی طلب کی تاکہ وہ دکن کا اچھی طرح انتظام کر سکے۔ اس کے معاوضے میں آپ کو ملتان و آگرہ، الہ آباد، برہانپور کی صوبہ داری عطا کرنے کا انتظام ہوا۔ اسی دوران میں بادشاہ کے خطوط سیدوں کے استیصال کی نسبت پہنچے تو ۱۱۳۲ھ میں مالوے سے دربار شاہی کو جانے کے عنوان سے دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ طالب خان سے قلعہ آسیر اور محمد انور خان قطب الدولہ سے شہر برہانپور صلح کر کے حاصل فرمایا۔ اسی سنہ میں سرزمین دکن پر حضرت مغفرت مآب کا قبضہ ایک صوبہ دار کی حیثیت سے ہو گیا۔

سیدوں کو ان حالات کا علم ہوا تو بڑے پریشان ہوئے حسین علی کا بھتیجا عالم علی خان اس وقت صوبہ داری دکن کی نیابت پر فائز تھا۔ سب سے پہلے تیرہ ہزار سپاہ لے کر مقابلہ کے لئے نکلا۔ نواب نظام الملک نے اُسے برہان پور سے تیس کوس کے فاصلے پر شکست دی اور یکم اگست ۱۷۲۰ء کو عالم علی خان مارا گیا۔ اس کی فوج کے تمام بڑے بڑے افسر حضرت آصف جاہ سے مل گئے۔ ان میں مبارز خان صوبہ دار حیدر آباد بھی شامل تھا۔

ان فتوحات کی خبریں دہلی پہنچیں تو حسین علی بہت گھبرایا۔ اور بادشاہ کو لے کر پچاس ہزار فوج کے ہمراہ دکن کی طرف روانہ ہوا تاکہ خود نواب آصف جاہ سے مقابلہ کرے۔ جب حضرت کو اس کی خبر ہوئی تو آپ کے رفقاء کار نے حسین علی خان کے قتل کے منصوبے باندھے۔ اس معاملہ میں اعتماد الدولہ امین خان (جو نواب آصف جاہ کے قریبی رشتہ دار تھے) سعادت خان، حیدر خان، اور میر حیدر کاشغری شریک تھے۔ فتح پور سیکری سے پچیس کوس کے فاصلے پر مقام "تورہ" میں حسین علی خان بادشاہ کے ساتھ آکر قیام پذیر ہوا جب بادشاہ سے مل کر اپنے خیمہ کی طرف جا رہا تھا تو راستے ہی میں میر حیدر کاشغری نے ایک درخواست پیش کی حسین علی اس کے پڑھنے ہی میں مصروف تھا کہ کاشغری نے نہایت سُرعت کے ساتھ تلوار کے ذریعے اُس کا کام تمام کر دیا۔

اسی اثنا میں عبد اللہ خان قطب الملک وزیر اعظم آگرہ سے دہلی جا رہا تھا کہ راستے ہی میں اُسے اپنے بھائی کے قتل کی خبر ملی۔ فوراً گورنر دہلی کو حکم لکھا کہ ابراہیم بن رفیع الشان کو تخت سلطنت پر بٹھلا دے! اور خود مع فوج جرار بھائی کے انتقام کے لئے کوچ کیا شاہ پور کے قریب پہنچا تھا کہ محمد شاہ کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ فریقین میں زبردست معرکہ آرائی کے بعد عبد اللہ خان زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ اور چند دن کے بعد انتقال کر گیا۔

سادات بارہہ کی قوت کے استیصال کے بعد محمد شاہ کی طرف سے اس کارنمایاں کے صلے میں التفات شاہانہ کا اظہار ہوا تو دکن کے انتظامات کے بعد آپ رونق بخش، شاہ جہان آباد ہوئے۔ اس عرصہ میں وزیر اعظم محمد امین خان

اعتماد الدولہ کا انتقال ہو چکا تھا، ۱۱۳۴ھ میں پیش گاہ سلطان سے صوبہ داری دکن کے علاوہ منصب وزارت عظمیٰ سے سرفراز ہوئے۔ آپ دارالسلطنت ہی میں تھے کہ گجرات میں حیدر قلی خان کے بغاوت کی اطلاع ملی۔ بغاوت فرو کرنے کے لئے دکن سے کوچ کیا۔ باغی کی تنبیہ و تادیب کرکے اپنے چچا نواب حامد خان صلابت جنگ کو نیابت صوبہ گجرات پر مقرر فرما کر واپس لوٹے۔

نواب نظام الملک کی وزارت نے وہی شاہ جہانی اور عالمگیری زمانے کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔ ادھر یہ لایق وزیر کی سرگرمی تھی تو اُدھر بد قسمتی سے محمد شاہ عیش و عشرت کا دل دادہ ہو گیا، اُسے سلطنت کے کاروبار سر انجام کرنے بجائے شراب و کباب کا شغل تھا۔ اس خطرناک حالت میں دشمنوں نے اپنے اپنے مفاد کی خاطر سلطنت کو خوب لوٹا، بادشاہ اور وزیر میں بدظنی پیدا کروادی اور محمد شاہ سے مبارز خان کو دکن کی صوبہ داری کا فرمان دلوا دیا۔ حالانکہ وہ حضرت آصف جاہ ہی کی بدولت منصب پنج ہزاری اور خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ جب آپ نے بادشاہ کی عیاشی اور دربار کی بری حالت دیکھی تو محمد شاہ سے شکار کی اجازت لے کر دکن کی طرف رُخ کیا۔ اُجین پہنچے تو مرہٹے اِن کی آمد کی خبر سُن کر منتشر ہو گئے۔ باغیوں اور سرکشوں کا قلع قمع کرکے دہلی واپس جانے کی فکر میں تھے کہ مبارز خان صوبہ دار حیدرآباد کی بغاوت کی اطلاع ملی۔

دکن آنے کے بعد مبارز خان کو صلح کا پیغام بھیجا، اس کے انکار کرنے پر بہ مقام شکر کھیڑہ (برار) فریقین کا مُقابلہ ہوا۔ خوب گھمسان لڑائی کے بعد ۲۳ محرم ۱۱۳۷ھ کو مبارز خان مارا گیا۔ جملہ صوبہ جات دکن نواب آصف جاہ کے قبضۂ اقتدار میں آئے۔ اور اسی سنہ میں نواب نظام الملک بہادر مملکت دکن پر بحیثیت خود مختار قابض و متصرف ہوئے۔ نیک دل نواب نے اس کے بیٹوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اور بعد میں بہت سارو پیہ پیسہ دے کر ان کی دلجوئی کی اس اثنا میں خبر ملی کہ مبارز خان کا بڑا بیٹا احمد خان گولکنڈے میں محصور ہو گیا ہے۔ نظام الملک بہادر نے اسے بھی حُسن تدبیر سے رام کیا۔

اس جنگ کے اختتام کے بعد آپ انتظام مملکت میں ہمہ تن مصروف ہوئے اور مرہٹوں سے صلح کر لی ۱۱۴۹ھ میں مرہٹوں نے دہلی پر حملے کرنے شروع کر دئے اور اُدھر نادر شاہ اپنے حملے کی الگ دھمکی دے رہا تھا ان سب واقعات کا یہاں درج کرنا طولِ قصہ ہے۔ اس وقت محمد شاہ کی آنکھ کھلی، اور گھبرایا۔ فوراً نواب نظام الملک کو طلب کیا، آپ بلا کسی رنج و غم کے فطری جوشِ اطاعت میں دہلی روانہ ہو گئے، یہاں آنے کے بعد ۱۱۵۰ھ میں محمد شاہ نے خطاب "آصف جاہ" سے ممتاز کیا۔ آپ کی تشریف آوری کی تاریخ محمد افضل نامی شاعر نے لکھی۔ رباعی

صد شکر کہ ذاتِ دین پناہی آمد　　رونق دہِ ملکِ پادشاہی آمد
تاریخ رسیدنش بگوشم ہاتف　　گفت، آیتِ رحمتِ الٰہی آمد

مرہٹوں کی تادیب کے لئے بادشاہ نے اکبرآباد اور مالوہ کی صوبہ داری عنایت کر کے ان کے مقابلے کے لئے روانہ کیا نواب آصف جاہ بہادر نے بندیلہ کے راجہ کو ہمراہ رکاب لے کر بھوپال میں رونق افروزی کی، باجے راؤ باجے راؤ، بھی مع فوج کثیر مقابلہ کے لئے پہنچا۔ سواد بھوپال پر فریقین میں نہایت سرگرم معرکہ آرائی ہوئی، لیکن نادر شاہ کے حملہ کی خبر سن کر نواب صاحب صلح کر کے دلی لوٹے۔ بادشاہ کے نااہل ہونے پر، حریف کی مقاومت کے لیے مغلیہ فوج کے تین سپہ سالار مقرر ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک نے اپنی اپنی جدا رائے سے ساری فوج کٹا دی حضرت آصف جاہ نے صورت حال کو سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر جہاں کئی بگاڑنے والے تھے، وہاں ایک کی سعی اور تدبیر سے کیا کام بن سکتا تھا؟ ۱۷۳۹ء میں کرنال کے قریب عظیم الشان جنگ ہوئی۔ بادشاہ نے گھبرا کر صلح کرلی۔ نادر واپس لوٹنے کی تیاری ہی میں تھا کہ، برہان الملک نے اسے دہلی جانے کی ترغیب دی، اور کہا جاتا ہے کہ دلی والوں نے خواہ مخواہ نادر کے قتل کی افواہ اڑائی۔ جب یہ خبر اس کے کانوں تک پہنچی تو غصہ میں آکر، فوج کو قتل عام کرنے کا حکم دے دیا۔ دلی کے گلی کوچے جب خون سے رنگین ہو گئے، تو عجب قیامت برپا ہو گئی، اس موقع پر حضرت آصف جاہ (خدائے تعالیٰ آپ کو جنت نعیم میں خاص جگہ دے) تلوار گلے میں لٹکائے، نادر شاہ کے روبرو حاضر ہوئے اور شہر کی حالت کی تصویر اس شعر کے ذریعے پیش کی ؎

کسی نماند کہ اُو را بہ تیغ ناز کشی　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

تو نادر شاہ یہ کہتے ہوئے کہ "بریش سفیدت بخشیدم" قتل عام کو فی الفور روک دیا۔ نادر پر آپ کی عقلمندی اور حسن تدبیر کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ چلتے وقت آپ سے کہا کہ

"میں نے تجھ سا آدمی ہی نہیں دیکھا، تو تو بادشاہی کے قابل ہے جا، میں نے تجھے بادشاہ کیا، اگر کوئی تیری اطاعت سے سرتابی کرے گا، تو میں اس کی کھال کھینچ ڈالوں گا۔" (جس کا خود آپ نے بھی ذکر فرمایا ہے) آپ کی غیرت و مروّت نے یہ اجازت نہ دی کہ اپنے آقا کے تخت پر متمکن ہوں اس لئے سچی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس امر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نادر شاہ آپ کی اس وفاشعاری کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس کے بعد بھی چار سال تک دلی ہی میں رہ کر امور وزارت کو سرانجام فرماتے رہے۔ اس عرصہ میں دشمنوں نے دکن میں آپ کے فرزند ناصر جنگ کو باپ سے منحرف کروا دیا۔ حضرت نظام الملک نے سلطنت کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لئے بادشاہ سے

رخصت حاصل کی اور ۲۰ جمادی الاولی ۱۱۵۴ھ کو ستر ہزار کے لشکر کے ساتھ دکن کی طرف کوچ کیا۔

آپ کے ہمراہ رکاب، محمد ابوالخیر خان، خواجہ قلی خان، منوس خان، جمیل بیگ خان، رحیم اللہ خان اور تسلیم خان وغیرہ بھی تھے۔ کار آزمودہ اور باتدبیر باپ کے سامنے بیٹے کی کیا ہستی تھی، شکست کھائی۔ اور قندھار کے قلعہ میں (جو ضلع ناندیڑ میں ہے) مقید کر دیئے گئے۔ ۱۱۵۶ھ میں کرناٹک کی جانب توجہ مبذول فرمائی، کیوں کہ یہاں کا گورنر صفدر علی خاں، اپنے ایک سلبی بھائی مرتضیٰ خان کے ہاتھ مارا گیا تھا۔ ملک میں بدامنی اور شورش برپا تھی، اس لئے فوج کشی کر کے امن و امان قایم کیا انورالدین خان شہامت جنگ کو کرناٹک کی نظامت پر اور اپنے نواسے ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کو بالاگھاٹ کی گورنری پر مامور فرمایا۔

۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو حملہ کی مدافعت کے لیے پھر دوبارہ دہلی سے آپ کی طلبی ہوئی۔ اس وقت آپ بیمار تھے، اور ملک میں قحط الحالی سے رعایا، پریشان تھی، اس کے علاوہ آپ کا سن شریف (۸۹) سال کا بھی ہو چکا تھا، لیکن آقا کے حکم کے سامنے آپ ان سب مصیبتوں کو گوارا فرما کر، دہلی کے قصد سے روانہ ہوے۔ برہان پور میں پہنچے تھے کہ محمد شاہ کی موت، اور احمد شاہ کی تخت نشینی کی خبریں ملیں۔ وہیں سے مراسم تعزیت و تہنیت ادا کر کے دریائے نربدا کی طغیانی اور شدید بارش کے ایام میں دکن کی طرف لوٹے (کیونکہ ناندیڑ میں بغاوت کی اطلاع ملی تھی)، برہان پور کے راستے ہی میں ۴ جمادی الآخر ۱۱۶۱ھ میں دنیا کے بکھیڑوں سے تنگ آکر متوجہ بہشت ہوے۔ آپ کی رحلت کی دو تاریخیں "خلد منزلت" اور "متوجہ بہشت" بھی ہیں۔ نعش کو اورنگ آباد روانہ کیا گیا، جہاں حضرت برہان الدین اولیا رح کے مزار کے بائیں جانب آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ اسی سنہ میں ہندوستان کے اور دو نام آوروں نے بھی وفات پائی، چنانچہ حضرت آزاد بلگرامی نے اس سانحہ پر یہ قطعہ تاریخ لکھا ؂

سہ دُرِ مملکتِ ہند از جہان رفتند — فتاد حیف سہ دریگانہ از کف دہر
برائے رحلتِ این ہر سہ یافتم تاریخ — نماند شاہ زمان با وزیر و آصفِ دہر

کسی نے یہ مصرعۂ تاریخ بھی خوب لکھا ہے :۔

"موت شاہ و وزیر و آصف جاہ"

آپ کے چھ صاحب زادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں جن کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) نواب فیروز جنگ ثانی (میر محمد پناہ، امیرالامرا غازالدین خان) جو دہلی میں نواب آصف جاہ کی

طرف سے نائب تھے۔

(۲) نواب ناصر جنگ (میر احمد خان نظام الدولہ)

(۳) نواب صلابت جنگ (میر محمد خان امیر الممالک)

(۴) نواب میر نظام علی خان (اسد جنگ آصف جاہ ثانی)

(۵) نواب بسالت جنگ (میر محمد شریف خان برہان الملک)

(۶) نواب میر مغل علی خان (ناصر الملک ہمایوں جاہ)

(۱) خیر النسا بیگم (۲) پادشاہ بیگم (۳) مکرمہ بانو بیگم (۴) خجستہ بانو بیگم عرف نہان بیبادر بیگم صاحبہ (۵) محسنہ بیگم (۶) مہ بانو بیگم۔

حضرت مغفرت مآب نواب نظام الملک آصف جاہ اول علم وفضل زہد وتقویٰ میں بلند پایہ رکھتے تھے بہترین سپہ سالار دوراندیش اور مدبر انسان تھے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو تمام نیک صفات سے مزین فرمایا تھا۔ علمی قابلیت میں عہد عالمگیری کے امرا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے تحریر وتقریر دونوں میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ عربی، ترکی فارسی ہندی زبانوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ فتوحات آصفیہ کے مولف کا بیان ہے کہ آپ نے ترکی زبان احمد یار خان المخاطب بہ ترکی خان سے سیکھی۔ فارسی کے خوش گو اور بلند فکر شاعر تھے شاکر تخلص اختیار فرمایا تھا، بعد میں آصف تخلص سے بھی شعر گوئی فرمائی ہے۔ صاحب مرآۃ الصفا لکھتے ہیں کہ مرزا عبد القادر بیدل سے فارسی کلام کی اصلاح لیا کئے آپ کے دو دیوان ہیں، جو طبع ہو چکے ہیں، اور اب بھی حیدرآباد کے موجودہ روزناموں صبح دکن اور رہبر دکن میں اکثر آپ کا کلام اعلیٰ حضرت بندگان عالی (خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ) کے حکم سے شائع ہوتا رہتا ہے، اس لئے یہاں کلام کا نمونہ پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مغفرت مآب نہایت سیدھی سادی زندگی بسر فرماتے تھے صرف جشن کے موقعوں پر آپ کے دربار کی آرائش کی جاتی تھی معمولی سواری پر تشریف فرما ہو کر باہر نکلتے، اور سادہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔

حضرت آصف جاہ مذہب کے بڑے پابند اور شریعت کے دلدادہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے دربار دہلی کے رنگ رلیوں اور خلاف شرع امور کو دیکھ کر، گوشہ نشینی اختیار فرمائی حضرت موصوف حقوق العباد کے بڑے زبردست حامی تھے عدالت وانصاف اور رعایا کی بہبودی آپ کے خاص مقاصد تھے آخری ایام زندگی میں جو کبر سنی کا زمانہ تھا، اور تقریباً پورے جنوبی ہند کے مالک ہونے کے باوجود کبھی بھی مذہب کی طرف سے غفلت نہیں برتی۔ اور

اپنی (۳۰) سالہ دورِ حکومت میں کبھی کسی شخص کے قتل کا حکم صادر نہ فرمایا۔

آپ کے عہد میں وزرائے سلطنت اپنے اپنے کاروبار کے ذمہ دار ہوتے تھے ہر ایک ضرورت کے لئے علیٰحدہ محکمہ قائم تھا سررشتہ مال کے ذریعے ملک کی ضلع بندی عمل میں آئی، تعین لگان کے لئے محکمہ بندوبست کا بھی وجود عمل میں لایا گیا تھا، سررشتہ مذہبی علیٰحدہ قائم تھا۔ اور ایک محکمہ بھی تھا، جہاں مداخل و مخارج کا گوشوارہ مرتب کیا جاتا تھا۔ سررشتہ آبپاشی اور تعمیرات کے ثبوت میں عہد آصفی کے تالاب اور عمارتیں شاہد ہیں چنانچہ ۱۱۴۱ھ میں شہر برہان پور کی حصار تعمیر کروائی، نظام آباد، فرداپور وغیرہ آباد کیا، اور نیز شہر حیدرآباد کی بھی حصار از سر نو ترمیم کروائی۔

تجارت کی گرم بازاری کے لئے امن و امان قائم فرمایا اجناس کا نرخ مقرر کر کے رعایا کی آسانیوں میں اضافہ فرمایا بیمار جانوروں کے گوشت کو فروخت کرنے سے منع کیا۔ ۲ ہزار کی رقم جو تاجروں وغیرہ سے وصول ہوتی تھی اُس کو بند کروادیا شہر کے نظم و نسق کے لئے ایک کوتوال کو مقرر فرمایا۔ صوبہ داروں کی مدت ملازمت دو سال یا تین سال رکھی، تاکہ اُن کو بغاوت و سرکشی کا موقع نہ ملے دفتر تعلیمات و طبابت جو رعایا کی بہتری کے اہم جز ہیں مذہبی اُصول پر قائم کروائے۔ ہر سال رقم کی ایک کثیر تعداد مکہ معظمہ وغیرہ کو روانہ کی جاتی تھی۔ سالانہ اور دیگر مواقع پر خیرات کے لئے ایک معتد بہ رقم مختص کر دی گئی تھی۔

نظام فوج بھی عمدہ اصولوں پر مبنی تھا، فوجیوں کو ہر سال رخصت ملا کرتی تھی، تاکہ وہ اپنے اہل و عیال سے ملنے کے بعد تازہ دم ہو کر، ملک و مالک کی خدمت کے لئے آسانی سے تیار ہو جائیں۔ ان ہی خوبیوں کے باعث حضرت آصفجاہؒ کی سخاوت و علم پروری، انصاف و دادرسی کا شہرہ دور دور تک پہنچا۔ ایران و ہندوستان اور عرب وغیرہ سے بڑے بڑے باکمال آپ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے تھے یہی وجہ تھی کہ آپ کا دربار علمائے کرام اور اولیائے عظام کا مرجع و ماویٰ بن گیا۔ اور آپ کو بھی ان لوگوں سے خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ جب حضرت آصف جاہ شہنشاہ دہلی سے دکن کی صوبہ داری کا فرمان لے کر روانہ ہوئے تو جاتے ہوئے لال قلعہ کے قریب حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی (علیہ الرحمہ) کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرتِ شیخ سے طالب دعا ہوئے تو شیخ موصوف نے دعا کی اور ایک رقعہ اپنے مُرید خلیفہ حضرتِ شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے نام لکھا (جو حسب الحکم اپنے مرشد کے یہاں مقیم تھے) نواب نظام الملک بہادر حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ سے ملے، مرشد کا خط دیا۔ اور دعا چاہی، آپ اس وقت کھانا کھا رہے تھے، ایک روٹی پیلے کپڑے میں لپیٹ کر آپ کے حوالے کی۔ آپ اس کو لے کر روانہ ہو گئے۔ ہمیشہ اس تبرک کو اپنے ساتھ رکھتے اور جہاں جاتے فتح و نصرت سے واپس ہوتے تھے۔ حضرت آصف جاہ نے اس تبرک کو اپنے لئے نشان اقبال سمجھا،

اس کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کے لئے، اپنے جھنڈے پر اس روٹی کا گول نشان بنوا دیا اور پیلے رنگ کا جھنڈا نشان آصفی قرار پایا چنانچہ اب تک یہی عمل درآمد ہے۔ سر افسر الملک مرحوم سابق سپہ سالار افواج آصفیہ کے زمانے میں اس میں کچھ تبدیلی کی گئی۔ اوپر اور نیچے کی طرف دو سبز پٹیاں جھنڈے کی تزئین کے لئے لگا دی گئیں اور روٹی والے حصے کے بیچوں بیچ تاج آصفی کی شکل اُتاری گئی۔

مثنوی در تعریف

قہوہ

حسب الارشاد نواب عمدۃ الملک امیر خان بہادر فی بحر ہزج مسدس محذوف مفاعیلن مفاعیلن فعولن

اردو شاعری پر جو ایک پامال اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں مستقل موضوعوں پر طویل نظمیں کم لکھی گئی ہیں۔ دراصل اردو شاعری سے اک گونا واقفیت کا نتیجہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مصحفی کے بعد سے اردو شاعری کی ہمہ گیری اور تنوع سکڑ کر صرف غزل اور اس کے متعلقات تک محدود ہو گیا تھا۔ اور یہ ایک ستم ظریفی سے کم نہیں کہ اس قسم کا اعتراض کرنے والوں کی دسترس جس اردو شاعری تک ہے وہ زیادہ تر اسی دور تغزل سے متعلق ہے یہی زمانہ قریب تر تھا اور اسی زمانہ کے شاعروں کا کلام شایع بھی ہوا۔ اس سے پہلے جو خدایان سخن دہلی، لکھنو اور اس سے بڑھ کر گجرات اور دکن میں اردو شاعری کا کوس لمن الملک الیوم بجا گئے اور اردو زبان کی اساسی خدمت کر گئے ان کے کلام ہماری بدقسمتی اور اتفاقات زمانہ کی توجہ سے نہ صرف غیر مطبوعہ ہی رہے بلکہ اکثر و بیشتر تلف بھی ہو گئے تاہم اس وقت جو کچھ جواہر پارے مخطوطوں کی شکلوں میں منتشر نظر آجاتے ہیں ان کا مطالعہ اہل ذوق کو نہ صرف محظوظ بلکہ اس امر پر متاسف بھی کرتا ہے کہ کیوں اردو شاعری کی وہ روش قایم نہ رہ سکی۔

گولکنڈہ کے وجہی اور غواصی اور بیجاپور کے رستمی اور نصرتی کی اعلیٰ درجہ کی رزمیہ و بزمیہ شاعری تو بہت دور کی چیز ہے دہلی ہی کے ابتدائی باکمالوں مثلاً مظہر

وآبرو، اور فغاں و حاتم کا ایسا کتنا کلام ہے جس کو ہمارے ذوق نے محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے تو ہم بالکل تاریکی میں ہیں۔ لیکن یہ کچھ کم خوش قسمتی کی بات نہیں کہ شاہ ظہور الدین حاتم کا منتخبہ کلام جس کو انہوں نے "دیوان زادہ" کے نام سے اپنے دوسرے طویل دیوانوں سے منتخب کیا تھا برٹش میوزیم میں محفوظ مل گیا جس کو ہمارے دوست ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے بڑی پامردی کے ساتھ نقل کرلیا اور اب ایک بسیط مقدمہ تنقیداور بیاض قدیم تذکروں اور مخطوطوں میں حاتم کا جو کلام ملتا ہے اس کے مقابلہ کے ساتھ شایع کرنے والے ہیں۔ یہ دیوان اردو زبان کے تمام دیوانوں میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں ہر غزل کے ساتھ ان کا محل وقوع سن تصنیف اور بحر وغیرہ بھی خود حاتم نے درج کردئے ہیں۔ اس موقعہ پر ہم اس دیوان کی مسلسل نظموں میں سے ایک مثنوی "قہوہ" شایع کرتے ہیں یہ نواب عمدۃ الملک کی فرمایش پر لکھی گئی تھی۔ شاہ ظہور الدین حاتم نواب موصوف کے باورچی خانہ کے "بکاول" تھے۔ اور اس عہدہ کے تعلق سے ان کی یہ نظم خاصہ کی چیز سمجھی جاسکتی ہے۔ (مدیر)

جہاں میں سرد مہری سے خزاں ہے ‌‌ جو ہم سے گرم ہے تو قہوہ داں ہے

بجا ہے اس کی مجھ سے گرم جوشی ‌‌ کہ جانے ہے مری پیمانہ نوشی

جہاں دیکھو تہاں ہر آن قہوہ ‌‌ ہے بزم عیش کا سامان قہوہ

قبول بارگاہِ بادشاہاں ‌‌ جلوسِ دست صاحب سنگاہاں

ہے شا کی رات اور دن نیند اس کے ‌‌ عداوت ہے اسے نسیاں کے ساتھ

انیس روح و جان، و راحتِ دل ‌‌ جلیس بزم رونق بخش محفل

برائے حرمت افزائے تواضع ‌‌ تواضع اس کی ہے جائے تواضع

ہے نور دیدۂ مردم، پیالہ　　سواد سرمۂ چشم غزالہ

بجا ہے چھوڑ کر مسند نشینی　　یہاں ہو قہوہ پر فغفور چینی

سبھوں کے ہاتھ مجلس میں پیالہ　　چمن سا کھل رہا اک دست لالہ

مجھے اس آن گل لالہ کی دھن ہے　　کہ پیالہ آب ہے اور داغ بن ہے

مرا اک مونس دل بن رہا ہے　　سو اس کا بھی کلیجا بھن رہا ہے

وہ پورا عشق کا سلطان رہے گا　　کہ سینہ چاک و دل بریاں رہے گا

ہے سب رنگوں میں قہوہ کا عجب رنگ　　گہے طاوسی و گاہے ہے شبرنگ

بلوریں یوں لگے قہوے سے اب جام　　گلے ملتی ہے گویا صبح اور شام

مجھے ہر دن یہ چاروں جام بس ہیں　　دو پیالے صبح اور دو شام بس ہیں

بلوریں سات پیالے پیالہ داں میں　　ہے جس کی روشنی ہفت آسماں میں

مثال عقد پرویں ایک جا ہیں　　جو کہیے سبعہ سیارے بجا ہیں

بجا ہے اس کی اہل بزم کو چاہ　　ہمیشہ گر نہ ہو، تو گاہ، بے گاہ

کہ اس کو دل جلوں سے راہ ہیگی　　ہر اک صحبت کی کب پرواہ ہیگی

نہیں ہوتا بجز اشراف کے یار　　صدا ہے صحبت پاجی سے بیزار

جہاں میں زندگی حاتم دو دم ہے　　ادھر قہوہ ادھر حقے کا دم ہے

انڈیا آفس میں چند دکھنی دیوان

جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب

یورپ کے دکھنی مخطوطات کے متعلق ہمارے متعدد مضمون معارف، جامعہ، نیرنگ خیال وغیرہ میں شایع ہو چکے اس سلسلہ کی گویا آخری کڑی ہے کیونکہ اب ہماری تالیف موسومہ "یورپ میں دکھنی مخطوطات" پریس میں جا چکی ہے توقع ہے کہ دو ایک ماہ میں وہ مکمل ہو جائیگی۔ اس کے بعد پھر غالباً کسی ایسے مضمون کی ضرورت نہ ہوگی۔"

یورپ کے کتب خانوں میں اردو زبان اور ادب کا جس قدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہے اس سے ہم یہاں کما حقہ واقف نہیں ہیں۔ مطبوعہ کیٹلاگون سے ایسے صحیح معلومات نہیں ہو سکتے جن کے استفادہ کے بعد مخطوط کے مالہ و ماعلیہ سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ یہ تو ایک طرف یہاں یہ بھی تو معلوم نہیں کہ یورپ کے کن کن کتب خانوں میں اردو کا مواد مل سکتا ہے۔

انگلستان کے جن کتب خانوں میں اردو مخطوطے موجود ہیں ان کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

(۱) انڈیا آفس (۲) برٹش میوزیم (۳) رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن (۴) کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی۔ (۵) کتب خانہ کنگ کالج کیمبرج (۶) کتب خانہ کاپر کالج کیمبرج (۷) کتب خانہ کرائسٹ کالج کیمبرج (CHRIST COLLEGE) (۸) بوڈلینن لابریری اکسفورڈ (۹) ایٹن کالج ایٹن (۱۰) کتب خانہ ادنبرا یونیورسٹی (اسکاٹلینڈ)

فرانس میں پیارس کے قومی کتب خانہ (ببلیاتک دی نیشنل) اور مارسلز کے کتب خانہ میں اردو کا مواد مل سکتا ہے۔ جرمنی کا حال مجھے تفصیل سے معلوم نہیں مگر جہاں تک میرے معلومات ہیں وہاں کے دو ایک کتب خانوں میں اردو مخطوطات موجود ہیں۔

ان کتب خانوں میں اردو کے قطع نظر صرف دکھنی مخطوطات اس قدر ہیں جس پر تفصیل سے کام کرنے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوگی اور صرف ان کی فہرست ہی خاصی طویل ہو سکتی ہے۔

دکن میں ابتداً مثنویوں کا رواج تھا دیوان بہت کم لکھے گئے ہیں عہد قطب شاہی و عادل شاہی کے

کسی شاعر کا کوئی دیوان یورپ میں نہیں ہے۔ مولف اردوئے قدیم نے اپنی تالیف میں سلطان محمد قطب شاہ کے دیوان کا ایک مطلا نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ایتھے (ETHE) کے نمبر (۲۰۸۰) حوالہ دیا ہے (صفحہ ۹۲ طبع ثانی)

یہ صراحت بالکل غلط ہے انڈیا آفس میں سلطان محمد قطب شاہ کا کوئی دیوان نہیں ہے۔ ایتھے کی کیٹلاگ فارسی مخطوطات سے متعلق ہے جس کا آخری نمبر (۳۰۰۳) ہے۔ نہیں معلوم مولف مذکور نے کس بنا پر اس کا ذکر کیا ہے ہم نے اپنے زمانہ قیام میں پوری تلاش ختم کردی مگر کوئی دیوان سلطان محمد کا دستیاب نہیں ہوا۔ اس سے واضح ہے کہ اردوئے قدیم کی صراحت اصلیت سے بہت دور ہے۔

زمانہ مابعد میں دیوانوں کا خاص طور پر رواج ہوا اور طویل مثنویوں کے بجائے غزلوں کے دیوان مرتب ہونے لگے۔ چنانچہ عہد آصفیہ (۱۱۳۶ھ) کے کئی ایک دیوان یورپ میں موجود ہیں۔

سلطنت مغلیہ کے زوال پر حضرت آصفجاہ اول نے (۱۱۳۶ھ) میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے پیشتر دکن سے صدہا شاعر۔ ادیب جلوہ نما ہوکر اپنی گل فشانی سے باغ اردو کی فضا کو مہکا چکے تھے اس کی چمن بندی میں وجہی سے لیکر ولی تک باغ بانی کے فرائض بجالا چکے تھے۔ مگر شمالی ہند کے لئے ہنوز یہ عہد عہد طفولیت تھا تو اسنجان اردو کی ابتدا تھی ولی اورنگ آبادی کے پیروی کا سلسلہ جاری ہوا تھا فارسی کو خیرباد کہہ کر اردو شاعری کو لبیک کہا جارہا تھا۔

آصفجاہ بڑے ذی علم اور علم دوست تھے۔ آپ کی علمی قدر دانی ضرب المثل بنی گئی تھی آپ کا سادہ مگر بارعب دربار باکمالوں کا ملجا و ماوی تھا۔ آپ کے ہمراہ دہلی کے علمار وفضلا روشعرا رکا ایک کثیر مجمع دکن آیا اور دکن ہی کو وطن بنا لیا! اور یہاں کے ذی علم اصحاب آپ کے چشمۂ فیض سے فیض یاب ہوکر نہال ہوگئے آپ کی اس قدر دانی نے علم وہنر کی ترقی میں چار چاند لگا دیئے۔ آپ خود بڑے شاعر تھے آپ کا فارسی کلام آپ کی قادر الکلامی کا شاہد ہے کلام الملوک ملوک الکلام کی پوری تفسیر کرتا ہے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی بھی فرماتے ہیں:-

کالی نہ کہو کوئی میرے دلبر کو حسد سے　　　مجھ دل کن کلینی پہ دعائے یمنی ہے

آپ کے صاحبزادے ناصر جنگ بھی فارسی کے پرگو شاعر تھے ضخیم دیوان شایع ہوچکے ہیں۔ اردو میں فرماتے ہیں:-

---

[۱] ۱۱۶۱ھ میں مسند نشین ہوئے اور ۱۱۶۴ھ میں شہید ہوئے۔

یار خورشید جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا ذرہ ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

امرائے دربار دکن کو بھی شاعری کا ذوق تھا کئی ایک امرا اپنے وقت کے بہترین شاعر تھے جن میں سے ایک صمصام الملک[1] میر عبدالحی خان بھی جو ناصر جنگ کے زمانہ میں دیوان تھے فرماتے ہیں :-

نہیں کھلتا بہار و باغ سوں دل یہی عقدہ مجھے مشکل رہا ہے

میں مدت کے بعد ایک دم جو سویا دیکھوں تو مجھ کنے ہے صنم گویا

اسی طرح مہاراجہ چندو لعل پیشکار اردو کے زبردست شاعر تھے شاداں تخلص تھا۔ غرضکہ سلاطین آصفیہ کی علمی قدر دانی اور علمی سرپرستی نے اردو کی ترویج میں خاص حصہ لیا اور صدہا ایسے باکمال شاعر ہوئے جنھوں نے ملک سخن سے دادلی اور اپنے کلام کو یادگار زمانہ چھوڑ گئے۔ اس عہد کے شعرا کی تفصیل مختلف تذکروں[2] وغیرہ سے مل سکتی ہے۔

قدر دانان یورپ سے ناممکن تھا کہ وہ دکن کے علمی ذخیرہ سے استغنا کرتے چنانچہ دکھنیات کا بھی ذخیرہ یورپ میں لایا گیا اور اپنے کتب خانوں کو ان سے زینت دی۔ ان کی پوری تفصیل ہماری زیر طبع کتاب "دیورپ میں دکھنی مخطوطات" میں مل سکتی ہے یہاں انڈیا آفس کے بعض دیوانوں کا ذکر کیا جاتا ہے امید ہے کہ دلچسپی کا موجب ہوگا۔

(۱) دیوان ولی۔ اس کے آٹھ نسخے انڈیا آفس میں ہیں۔ ان میں سے ایک تو ان کی زندگی میں مرتب ہوا ہے اور ایک ابو المعالی کے فرزند کا جمع کیا ہوا ہے یہ ابو المعالی وہی صاحب ہیں جن کے ہمراہ ولی نے دہلی کا سفر کیا تھا۔

ایک دوسرے دیوان کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے ولی کا نام ولی محمد تھا اور وہ دکن کے باشندے تھے۔ ان دیوانوں کے مدنظر کلیات ولی مطبوعہ انجمن ترقی اردو میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ ولی کے غیر مطبوعہ کلام کے متعلق ہمارا طویل مضمون رسالہ معارف کے تین نمبروں میں شائع

---

[1] سنہ ۱۱۴۲ھ میں تولد ہوے اور سنہ ۱۱۷۲ھ میں انتقال ہوا۔

[2] دیکھو چمنستان شعرا مولفہ لچھمی نارائن شفیق۔ تذکرہ موسوی خان اور تذکرہ شعرا دکن مولفہ عبدالجبار ملکاپوری اور "دکن میں اردو" مولفہ راقم۔

ہو چکا ہے اس لئے یہاں مزید صراحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ (۲) **دیوان سراج** بلوم ہارٹ نمبر (۲۱۹) ورق (۱۱) سطر (۱۱ تا ۱۵) سائز ۱۱ ¾ × ۷ ½ خط نستعلیق زشت

اس دیوان کے متعلق رسالہ اردو اورنگ آباد بابتہ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں بضمن اردو مخطوطات انڈیا آفس جو خلاصہ کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے :۔

(۲۱۹) **دیوان سراج** نسخہ ثانی (۲۲۰) } منظومات سراج الدین اورنگ آبادی ناقص صرف (۱۱) ورق غزلیات اور مخمسات کا مجموعہ ۔ آخر میں ایک مسدس شاہ ولایت کا ہے جن کا نام میر ولایت علی خان ہے بلا تاریخ (۱۵۱) ورق ''

اس صراحت سے ناواقف شخص بھی خیال کرے گا کہ انڈیا آفس میں دیوان سراج کے دو نسخے ہیں جن میں سے ایک ناقص ہے ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور نہ کیٹلاگ سے اس بیان کی تائید ہو تعجب ہے کہ ایسے بلند پایہ رسالہ میں ایک معمولی انگریزی عبارت کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا ۔

کیٹلاگ کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے :۔

۲۱۹ ۔ دیوان سراج
اشعار کا مجموعہ مصنف سراج غالباً سراج الدین اورنگ آبادی جو اٹھارویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں ۔

۲۲۰ ۔ ایک مجموعہ کلام ۔
غزل ۔ مخمس اور مسدس مصنف شاہ ولایت میر ولایت اللہ خان جو شاہ ولایت سے موسوم ہیں ۔ دہلی کے درویش تھے اور صوفیانہ کلام ہوا کرتا تھا ''

219 - "Diwan-i-Siraj - A collection of verses by Siraj, probably Siraj-ud-Din, Aurangabadi, who flourished in the 18th century A.D."

---

220 - "A collection of Ghazals, Mukhammas, and Musaddas, poems, by Shah Vilayat, Mir Vilayatullah Khan known as, Shah Vilayat was a darvesh of Delhi and writer mystic poetry."

اس صراحت سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انڈیا آفس میں سراج کے دو دیوان نہیں ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ سراج کا ایک ناقص انتخاب اور دوسرا شاہ ولایت کا دیوان ہے۔

سراج دکن کے ایک مشہور شاعر ہیں بہت پرگو تھے چار سال کی قلیل مدت میں ایک ضخیم دیوان مرتب کر دیا۔

یہ اورنگ آباد میں ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۷ھ میں انتقال کیا اپنی یادگار ایک کلیات ایک مثنوی بوستان خیال چھوڑی۔ کلیات۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں موجود ہے۔

انڈیا آفس کا نسخہ صرف ایک انتخاب ہے کاتب کا نام ظاہر نہیں ہوتا خط نہایت خراب ہے ولایتی اُودے کاغذ پر لکھا گیا ہے۔ ایک غزل کے ختم ہونے پر ساتھ ہی دوسری غزل شروع کر دی گئی ہے درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں ہے جس کے باعث نظم ہے یا نثر اور غزل کی ابتدا اور انتہا معلوم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

اس انتخاب میں (۵۴) غزلیں ایک مخمس درج ہے۔ اس کے کتابے آخر میں حسب ذیل عبارت درج ہے

"این کتاب بمقابلہ بالس (بلس) خان است"

پہلی غزل کا مطلع حسب ذیل ہے :-

اس لب لعل کو تم شکر شیریں کہو   اس کف دست کو گلدستہ رنگیں کہو

(۳) دیوان عزلت

اسپرنگر نے عزلت کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے "عزلت سید عبد الولی فرزند سعد اللہ جو نہایت قابل اور بزرگ آدمی تھے ان پر عالمگیر کو بہت اعتماد تھا۔ سورت میں پیدا ہوئے لیکن تذکرہ گردیزی کے قول کے مطابق ان کا خاندان بریلی کا تھا وہ فارسی اور عربی کے اچھے عالم تھے اور ۱۱۶۵ھ میں زندہ تھے بقول تذکرہ گردیزی۔ گلزار ابراہیم اور گلشن ہند عزلت کا خاندان لکھنو کے قریب کسی مقام سے متعلق تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد عزلت دہلی گئے جہاں انہوں نے کئی علماء سے ملاقاتیں پیدا کیں اور سب سے پہلے وہیں ان کو ریختہ شاعری کا خیال پیدا ہوا۔ دہلی سے وہ مرشد آباد گئے یہاں علی وردی خان نے ان کی مدد کی اپنے قدردان کی وفات کے بعد یہ مرشد آباد سے دکن گئے جہاں ان کا انتقال ہوا"

عزلت دکن اور شمال کے مشہور شاعر ہیں تقریباً ہر تذکرہ نویس نے ان کا ذکر کیا ہے۔

۱۱۴۰ھ میں ان کی پیدائش سورت میں ہوئی تعلیم اپنے باپ سے پائی سورت سے نکلکر اورنگ آباد ہوتے ہوئے دہلی گئے اور پھر مرشد آباد ہوتے ہوئے اورنگ آباد واپس آگئے۔ آصفجاہ ثانی کے زمانہ میں اورنگ آباد سے حیدرآباد آئے آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خان کی آپ پر خاص عنایت تھی خطاطی موسیقی۔ مصوری۔ اور شاعری میں کمال حاصل تھا۔ رنگین مزاج اور زندہ دل تھے صوفی مشرب فقیر بے ریا تھے ۱۱۹۸ھ میں انتقال ہوا۔ اپنی یادگار ایک مثنوی راگ مالا اور دیوان چھوڑا۔ مثنوی ہندی راگ اور راگنیوں پر لکھی گئی ہے۔

انڈیا آفس کا دیوان گویا منتخب کلیات ہے اس کے سرورق پر جو عبارت درج ہے وہ حسب ذیل ہے:

"منتخب کلیات فکر ہائے ہندی مشتمل ہمہ اقسام سخن از فقیر عزلت عفی العلی لولی نذر منیر الدولہ دام ظلالہٗ"

اس صراحت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عزلت نے اس کو منیر الدولہ کے نذر کے لئے خود مرتب کیا تھا۔ نہ معلوم یہ انڈیا آفس میں کس طرح پہنچ گیا۔ اس دیوان کے ابتدا میں ڈیڑھ صفحہ کا اردو میں دیباچہ بھی ہے اس کا انتخاب بھی پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس زمانہ کی نثر کا اندازہ ہو جائے:

"اے سینسار کے کرنہار سب خوبیاں اول سے ابد تئیں تجھے یعنی اپنے آپ ثابت ہیں۔ کہ ہماری زبان قاصر بیان ہے تیری بڑائی کا حق ادا نہ ہوسکتا ....

امابعد یہ عجز محمود دورد کے یہ فقیر سید عبدالولی عزلت پسر حضرت سید سعد اللہ قدس سرہٗ کا زبان بے جوہری سے عرض کرتا ہے کہ یہ کہتی جلی ہوئی دم آتشخانہ دیوان جہان فراموشوں کا یادگار رہے۔ اور اس کے سب مصرعے سوختگی مضامین سے بزم سخن کے کئے ہیں تا چراغ معنی کہ پروانہ صورتوں کی آنکھ ہمارے خیال میں اشکبار رہے اور اس کی ہر بیت بہار معنی کی

لہ محمد حیدر المخاطب حیدیار خان ۱۱۱۳ھ میں تولد ہوئے۔ آصفجاہ کے ہمراہ دہلی سے آئے اور مناصب جلیلہ سے سرفراز ہوئے صلابت جنگ نے منیر الدولہ بشر جنگ منیر الملک کے خطاب سے سربلند فرمایا۔ آصفجاہ ثانی کے زمانہ میں نظامت سوم خجستہ بنیاد سے سرفراز تھے ۱۱۸۹ھ میں انتقال ہوا۔ منیر الملک ثانی جو آصفجاہ ثالث اور رابع کے زمانہ میں دیوان تھے آپ کے پوتے تھے۔

جنوں میں مصرعوں کے دوہاتے سے گریبان بہار رہے ہیں اور ہر سطر ایک یونہ مضمون جنون زنجیر
کرنہ مہ سوجس کے یہاں سے خموشی کے نالے پکار رہے ہیں۔ درست فکر دے کہ ٹوٹے ہوئے
دلوں کے پسند کرے "

کلام کا کچھ نمونہ بھی ملاحظہ ہو :-

جلایا مصحف دل تو نے کیوں برق تغافل سے
جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانیکے کام آتا

منھ موڑ بت کدہ سے حرم کو چلا ہے شیخ
عزلت مگر ہے کعبہ ہی میں یہاں خدا نہ تھا

جہاں کی سرد مہری کے صبا پر فقر سے عزلت
ہنسی ہے ہو بہو جوں گل فراغت اس کو کہتے ہیں

مجھ سے عزیز پر میرے یوسف کی چاہ نہیں
الفت نہیں کرم نہیں سیدھی نگاہ نہیں

نگہ کی بوج سے جھک جا نزاکت اس کو کہتے ہیں
نہیں آتا تصور میں بھی وحشت اس کو کہتے ہیں

نہ پیچ و تاب ہوا سے ہے آب میں گرداب
کہ میری اشک کے آگے کرے ہے جیحوں رقص

(۴) **دیوان چندا** یہ مہ لقا بائی چندا کا دیوان ہے۔ چندا اپنے عہد کی باکمال طوائف تھی۔ ممکن ہے طوائف کے نام سے ذہن آج کل کی طوائف کی طرف منتقل ہو مگر ایسا نہیں تھا۔

چندا پیشہ ور طوائف نہیں تھی اس کے کیا رکٹر کا حال اس کے نظام الاوقات سے معلوم ہو سکتا ہے جس کو مصنف تاریخ دل افروز نے لکھا ہے :-

"وہ صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہوتی اور نماز کے بعد طلوع آفتاب تک داعیہ اور صحیفہ کاملہ کا مطالعہ رہا کرتا اس کے بعد قرآن شریف پڑھتی پھر ناشتہ ہوتا اس وقت تک دوپہر ہو جاتی اور وہ قیلولہ کے لئے بالاخانہ پر جاتی اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھتی اور اس کے بعد عصر تک تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتی اور نماز عصر کے بعد دیوان خانہ میں آتی اور خانگی حساب و کتاب امور خانہ داری کا انصرام کرتی اس کے بعد لائق اور قابل سخندان جمع ہوتے اور علمی صحبت قائم ہو جاتی۔ (کتب بینی کا بھی شوق تھا اکثر روضۃ الصفا او حبیب السیر کا مطالعہ ہوا کرتا اس کے علاوہ فارسی اور ریختہ دیوان بھی زیر مطالعہ رہا کرتے) جو نماز مغرب تک رہا کرتی نماز مغرب کے بعد کھانا ہوتا اور پھر عشار کی نماز ہوتی اور اس کے بعد اساتذہ فن موسیقی جمع ہوتے اور آدھی رات تک یہ محفل گرم رہتی۔ رمضان میں روزہ کے بجائے روز ایک سو بیس خوان غربار کو دیا کرتی تھی "

اس تفصیل سے اس کے اخلاق اور عادات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ چندا۔ علم دوست اور سخن فہم

اور شاعرہ تھی۔ اس کے علم کی قدردانی کا شوق اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اپنے اہتمام سے سلاطین آصفیہ کی تاریخ غلام حسین خان جوہر سے مرتب کروائی۔ یہ تاریخ دل افروز[1] سے موسوم ہے۔ اس تاریخ کے لکھنے کی وجہ مہ لقا کے الفاظ میں سنو:۔

"چوں حقوق تربیت و عنایت خاندان عالیہ آصفیہ خصوص نوازش و عنایت حضرت نواب غفران مآب (آصفجاہ ثانی) بریں عاجزہ بے مقدار بچندیں سرفرازی ہا ثابت محقق است لہٰذا دل فدویت چناں میخواہد کہ تاریخ در ماثر ایام سلطنت آنحضرت بعنوان اجمال کردہ شود در ذیل آن بعد از ذکر ارکان و اعیان و امرائے عہد ذکر ایں عاجزہ ہم طراز دامان یاد فرمائی و یادگاری ہا باشد۔"

(ص ۱۱ ب محفوظہ برٹش میوزیم)

---

[1] اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ نمبر (ADD 26260) کتاب ضخیم ہے بڑی سائز کے (۵۱۳) ورق ہیں مولف غلام حسین خان نے دیباچہ میں ان کتابوں کی تفصیل بھی دی ہے جس سے اس کو مرتب کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) روضۃ الصفا مولفہ محمد خداوندشاہ بن محمود (۲) روضۃ احباب مولفہ میر جمال الدین عطار اللہ (۳) نورس نامہ گلشن ابراہیم المشہور تاریخ فرشتہ (۴) تاریخ مرات العالم مولفہ بختیار خان (۵) تاریخ اقبال جہانگیری (۶) ماثر ان مرا مولفہ صمصام الدولہ (۷) اکبرنامہ مولفہ ابوالفضل (۸) تاریخ خافی خان (۹) چار چمن برائے چترمن (۱۰) سوانح دکن منعم خان (۱۱) تاریخ ہفت اقلیم احمد رازی (۱۲) کتاب شاہ نامہ (۱۳) تاریخ بہمنی (۱۴) تاریخ قطب شاہی (۱۵) زبدۃ التواریخ۔ (۱۶) حبیب السیر (۱۷) عالمگیر نامہ (۱۸) توزک تیموری (۱۹) شاہ جہان نامہ (۲۰) توزک آصفیہ (۲۱) نسخہ سعد اللہ خان۔

غلام حسین خان ایک ذی وجاہت اور صاحب رسوخ شخص تھا اس نے اپنے صراحت کی ہے

راقم حروف کہ مدتہا ملازم رکاب رفاقت امیر اعظم ارسطو جاہ بود و اکثر باریاب حضور پرنور میشود۔ صفحہ (۱۵۳) ب

شعروشاعری کا بڑا شوق تھا شیر محمد خان ایمان سے اصلاح سخن لیتی تھی۔ بڑے بڑے شعرا اس کے یہاں جمع ہوتے تھے اور مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ تیراندازی، گھوڑے کی سواری ورزش وغیرہ کھیلوں میں بھی یدطولیٰ رکھتی تھی۔

صاحب مال و دولت تھی۔ پانچ سو سپاہی صرف اردلی میں رہا کرتے دوسرے ملازم اس کے سوا تھے اس وقت کے بڑے بڑے امرا اس کے یہاں موسیقی کی محفل میں آتے تھے اور شعرا اس کی تعریف میں قصیدے پیش کرتے تھے۔ میر عالم نے بھی ایک مثنوی (۱۷۰۵) شعر کی اس کی تعریف میں لکھی ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اے مہر سپہر روشنائی — سرتا پائے نور دلربائی
اے مردم دیدہ محبت — سرتا قدمت طلسم الفت
شکل تو بفلک دل مصور — چشم تو مات جان محبر
اے ماہ لقائی ماہ پیکر — وی ماہ جبیں و ماہ منظر
از رشک جبیں بست یکساں — مہ داغ فروش خرد نقصاں
از دفتر حسن نازیست — یک صفحہ مسحب جبست
بکرہ زکرم تو اے وفا کوش — شرح ہجران کہ کردہ کوش

غلام حسین خان جوہر اور نصیر الدین خان قدرت نے ماہ لقا بائی کے متعلق جو صراحت کی ہے اس کا مختصر انتخاب بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جوہر لکھتا ہے:۔

دو با وصفکہ سامان ثروت و مواد حشمت موجود و مہیا است اما حسن اخلاق و تواضع ان زہرہ فلک خوبی چوں نور ہلال ہر روز تجلی افزا اوقات طرب اباشش باکتاب کمال استحضار فصحا و شعرا و حکما مصروف و مغرون و طبعش باموزونی چو عرض و جوہر باہم فطری مراحس ماصلحہ سخن توکس زسخن گوی چوں نم با آب وسرجوشی در شراب جلقی دیوان طبع رادش در زبان ریختہ ہندی مصداق طبع وقادادست و ریختہ ہا بزاکت مضمونش درمی درہ روزمرہ نیسہ استعداد ہرکاہ بکسو تماہے رنگین درخت زرین وجواہر ثمن ملبوس و محلع می شود ؎

(تاریخ دل افروز صفحہ ۱۵)
ابرٹش میوزیم

قدرت لکھتا ہے :-

"فی الحقیقت موزونیت سطور ونواش بدیدہ معنی نژادان سخن شناس معشوقیست مزلف وہر لفظ دلفریبش شاہدیست مخطط ابیاتش کاکل دار برصفحہ عارض معشوقان فتادہ والفاظ مطبوعش مانند خط وخال جهموشان بلطف آمادہ نرکستان چکیدہ تلاش مضمون نصاحت مشمون با ہزاران چشم در تماشاگاہ مدرکہ انسہ ہا بجندہ طوطی خیالات رسا دام لایحصلی میان بنند "

(از دیباچہ دیوان چندا انڈیا آفس)

بہرحال اس تمام تفصیل سے اس کے حالات اچھی طرح منکشف ہوجاتے ہیں ۔

چندا کا باپ مرزا سلطان بیگ سے آیا تھا محمد اعظم کی شاہزادگی کے زمانے میں صلابت خان اور بادشاہی دور میں بسالت خان کے خطاب سے سرفراز ہوکر بخشی فوج سے ممتاز ہوا تھا اس کی والدہ راج کنور بائی گجرات کی رہنے والی خواجہ محمد حسین خان کی دختر تھی ۱۱۸۰ھ میں چندا تولد ہوئی تھی ۔

انڈیا آفس کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں مرتب ہوا ہے اور ایک جشن کے موقع پر سرجان ملکم کو دیا گیا ہے چنانچہ دیوان پر حسب ذیل یادداشت درج ہے :-

"یہ کتاب ایک دربار کے جشن کے موقع پر جس میں چندا تمام طوائف کی صدر تھی بطرز نذر سرجان ملکم کو پیش کیا گیا تھا ۔ بتاریخ ۱۸ اکتوبر ۱۷۹۹ء "

دیوان کے ابتدا میں ایک دیباچہ سید نصیر الدین خان قدرت نے فارسی میں لکھا ہے جس میں اعلیحضرت آصفجاہ ثانی کی مدح اور ستایش اور دیوان وقت ارسطو جاہ کی تعریف کے بعد بتایا گیا ہے کہ مہ لقا بائی جو راجہ راو رنبھا کی ملازمت میں داخل تھی قدرت سے دیباچہ لکھنے کی خواہش کی ۔ دیوان راجہ صاحب کے حکم سے مرتب ہوا تھا اس کے ترتیب کے بعد نواب ارسطو جاہ نے اس کو دیکھ کر پسند فرمایا ۔ اس کے مرتب ہونے کی تاریخ ہوالطیف الاعظم (۱۲۱۳ھ) ہے ۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

ساقی دے مجھ کو جام مے ارغوان پھر — افسردہ دل میں آئے جو شعلہ سی جان پھر

قتل پر کس کے آج ہوئی ہے — توسن حسن پر سوار شراب

چشم کافر بھی ہے اور غمزہ خونخوار بھی ہے — قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے

ملتے ہیں توقع پہ تری غیر سے کم ہم — رکھتے ہیں ترے دور میں یہ چشم کرم ہم

معروضہ یہ چندا کو نت شاہ نجف سے — دیکھیں نہ کبھو گردش افلاک سے غم ہم

(۵) دیوان شاداں

مہاراجہ چندولال شاداں دکن کے مشہور علم دوست اور زبردست شاعر تھے ۱۱۷۵ھ میں تولد ہوئے اور ۱۲۶۱ھ میں انتقال فرمایا۔ آصفجاہ ثالث نواب سکندر جاہ اور آصفجاہ رابع ناصر الدولہ کے زمانہ میں پیشکاری اور دیوانی کے عہدہ جلیلہ پر متمکن تھے۔ آپ کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ ہر وقت شعر و شاعری کی محفل گرم رہا کرتی اس وقت کے نامی گرامی شعرا آپ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

انڈیا آفس کا دیوان آپ کی زندگی میں مرتب ہوا ہے کیونکہ اس کی کتابت ۲۷ ذیحجہ ۱۲۴۳ھ میں ہوئی ہے محمد علاء الدین حسن کاتب ہے اور حجم (۹۹) ورق کا ہے۔

اس دیوان میں ایک قصیدہ۔ ایک مخمس۔ بتیس رباعی اور بقیہ غزلیں ہیں۔ قصیدے کے ۵۱ شعر ہیں اور یہ آصفجاہ ثالث کی مدح میں ہے۔ اس کا مطلع ملاحظہ ہو:—

صبح بیدار ہوا میں تو یہ بولا اقبال — آیا ہوں رہنے کو میں تیرے ہی سر پر فی الحال

گریز ملاحظہ ہو:—

کس لئے اب کے بہار آئی بصد رنگینی — تب تو گلشن کے یہ طوطی سے کیا میں نے سوال

بولی طوطی کہ نہیں جانتا کیا تو یہ بات — کہ بہار آئی ہے اوس شاہ کی اور برس سال

دوسرا مطلع:—

اے خداوند رہے تجھ پہ خدا کا افضال — ذات تیری ہے اب ایسی کہ نہیں جس کی مثال

غزلوں کے بعض اشعار پیش کئے جاتے ہیں:—

بندہ ہوں دل و جان سے میں اپنے صنم کا — سایہ ہے میرے سر پہ تو اس کے ہی قدم کا

ہے کام یہاں عاشق صادق کا و گر نہ — اٹھتا ہے کسی سے یہ بھلا بار محبت

پردہ غفلت کا مگر آنکھ میں چھایا ہے تری — تو جو ہوتا ہے نہیں خواب سے ہشیار ہنوز

نہیں معلوم مجھ کو میں کدھر ہوں — تجھے دیکھا ہے جب سے بے خبر ہوں

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقت صبح صادق کو — اثر رکھتی اکثر جو دعائے صبح صادق ہو

پردہ چشم اٹھا دیدہ تحقیق سے دیکھ — جب یگانہ وہ ہوا کوئی نہیں بیگا

جدھر دیکھو ادھر جلوہ ترا ہے　　نہیں خالی ہر اک شئی میں بھرا ہے
شاداں کا دیوان طبع ہو چکا ہے ۔

انگریزی افسانے

از

عبدالقادر سروری ام اے ال ال بی

"اورینٹل کالج میگزین" (لاہور) کی رائے

"دنیا کے شاہکار افسانے" کے عنوان عام سے ایک سلسلہ مطبوعات سروری صاحب کی ادارت میں اشاعت پذیر ہو رہا ہے اس سے پہلے دو حصے "قدیم افسانے" اور "چینی جاپانی افسانے" شایع ہو چکے ہیں ۔ یہ تیسرا حصہ ہے جس میں چودہ منتخب برطانوی مصنفین کا ایک ایک مشہور مختصر افسانہ بترتیب زمانی درج ہے ۔ بلا شک "یہ کام اپنی نوعیت کا پہلا ہے" ہر ایک مصنف کے کچھ سوانح حیات بطور تعارف افسانہ سے پہلے شامل کر دئے گئے ہیں ۔ بیشتر افسانے محمد محی الدین صاحب نے انگریزی سے اردو میں منتقل کئے ہیں ترجمہ کی زبان صاف ہے اور مطالب کی وضاحت کی وجہ سے دلچسپی قائم رہتی ہے لطف زبان خوبی بیان کے لحاظ سے نیز اثر و تاثیر کے اعتبار سے ہمیں حمدی صاحب کا "دو بچے کا خواب" پسند آیا .... امید ہے کہ ہمارے وہ فسانہ نگار جو انگریزی زبان و ادب سے نا آشنا ہیں اس کتاب سے متمتع ہوں گے ۔ اور واقعہ نگاری اور جذبات پنہاں کی نقاب برافگنی کی صفات سے اردو افسانہ کو بھی متصف کرنے کی سعی کریں گے ۔ قیمت (عہ)

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) متصل صدر پتہ خانہ انگریزی

حیدرآباد دکن

طوقِ زرّیں

از

محمد اعظم صاحب متعلم کلیہ جامعۂ عثمانیہ

بے لطفی کے ساتھ میں نے "پریم پچیسی" سیٹ پر ڈالدی اور اپنے ہمسفر کی طرف (جس سے چند ہی منٹ ہوئے ملاقات ہوئی تھی) دیکھنے لگا۔

"کونسی کتاب ہے؟" میرے نئے ملاقاتی نے پوچھا

"پریم پچیسی۔ منشی پریم چند کے افسانوں کا——"

"جی ہاں میں جانتا ہوں۔ کیا رائے ہے آپ کی ان افسانوں کے متعلق؟" اُس نے مسکرا کر پوچھا تنقید و تبصرہ آج پندرہ برس سے میرے روزمرہ کے فرائض میں داخل ہے۔ میں اس کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا کافی احساس رکھتا ہوں۔ میں اس بحث کی طوالت سے بچنے کے لئے کہا "جناب منشی پریم چند مشہور تو بہت——"

"اجی حضرت! شہرت کی نہ کہیئے" میرے بڈھے ہمسفر نے بے صبری کے ساتھ میرا سلسلہ کلام قطع کیا۔ "آج تک میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ شہرت کیا بلا ہے۔ اگر کوئی شخص لفظ شہرت کی صحیح تعریف مجھے بتا دے تو جو انعام وہ مانگے میں دینے کے لئے تیار ہوں"

"تو آخر آپ کو اس تعریف کی ایسی کیا ضرورت ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"اس لئے کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ شہرت ہے کیا چیز تو پھر غالباً اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی سمجھ میں آجائے گا۔ آپ یہ دیکھئے کہ اپنی جوانی میں فقط مشہور ہونے کی خاطر میں نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں۔ میں ہر وقت پڑھتا رہتا۔ رات رات بھر جاگتا۔ ان اشغال میں مجھے کھانے تک کی سدہ نہ تھی۔ غرض مجھے ایک طرح سے شہرت کا مالیخولیا ہو گیا تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں خود فطرت نے بھی مجھ میں مشہور ہونے کی صلاحیت ودیعت کی تھی۔ آپ شاید اسے خودستائی سمجھیں اس لئے میں بدیہات —— سے

استدلال کرتا ہوں۔

آپ یہ دیکھیے کہ میں انجینیر ہوں۔ اپنی عمر میں میں نے کوئی دس تو نہایت عالیشان پل بنائے ہوں گے یہ آپ کا نیا پل۔ چادر گھاٹ کا پل اور حال میں بلہار شاہ لائن کے لیے جو گوداوری کا مشہور پل تیار ہوا یہ سب میری نگرانی میں بنائے گئے۔ حیدرآباد میں جتنے بڑے بڑے تالاب بنے مثلاً حمایت ساگر۔ عثمان ساگر محبوب نہر۔ پوچارم کا تالاب یہ سب میں ہی نے تیار کیے۔ نظام ساگر جو دنیا کا دوسرا پراجکٹ سمجھا جاتا ہے آج کل اس کی نگرانی میرے ہی سپرد ہے۔ یہ تو میرے عملی کارنامے ہوئے۔

اب نئے فن انجینیری کی مختلف شاخوں پر میری اب تک پندرہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ یہ وہ موضوع ہے کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اردو زبان میں آج تک اس پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ اب کہاں تک میں اپنے منہ آپ میاں مٹھو بنوں خلاصہ یہ کہ میرے کارنامے اُن لوگوں سے بدرجہا زیادہ مسلم ہیں جو آج آسمان شہرت کے درخشاں ستارے بنے بیٹھے ہیں اور حالت یہ ہے کہ میں بڈھا ہوگیا اور کوئی میرا نام بھی نہیں جانتا۔"

"یہ آپ کیسے سمجھے؟ ممکن ہے کہ خود آپ کو اپنی شہرت کا علم نہ ہو۔"

"اچھا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ کہیے کبھی آپ نے نعیم الدین انجینیر کا نام سنا ہے؟"

"نعیم الدین" میں نے سوچتے ہوئے دہرایا۔ نہیں صاحب مجھے تو کبھی یہ نام سننے کا اتفاق نہیں ہوا"

"چلیے چھٹی ہوئی۔ جب آپ ایک تعلیم یافتہ۔ خوشحال اور سن رسیدہ ہوکے میرا نام نہیں جانتے تو اور کس سے توقع ہوسکتی ہے؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شہرت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ ہی ہم نے نہیں اختیار کیا۔"

"وہ صحیح طریقہ کیا ہے؟"

"خدا جانے حضرت۔ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ فطری جوہر محنت۔ اختراع یہ سب چیزیں بیکار معلوم ہوتی ہیں۔ خود ہمارے لائن میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے فنی معلومات دیکھ کر ہنسی آتی ہے مگر حالت یہ ہے کہ جو اخبار اٹھائیے اس میں ان کا نام موجود۔ دیکھیے اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ جس زمانہ میں گنڈی پیٹ کے تالاب کی تعمیر میری نگرانی میں ہورہی تھی وہ مقام بالکل ویران تھا۔ اس تنہائی سے وہاں بہت جی گھبراتا اتفاق سے گنگا بائی نام ایک طوائف شہر کی گنجان آبادی میں بیمار ہوکر تبدیل آب و ہوا کے لئے وہاں آئی۔ 'جہاں روک نہیں وہاں ارنڈہی پرکمیشن ہوتا ہے'، دن رات اوڑھوں اور مزدوروں میں رہتے رہتے

میں اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اس طوائف ہی کی صحبت مجھے غنیمت معلوم ہوئی۔ کام سے چھٹی پاکر کبھی میں نے اس کے پاس دل بہلانے چلا جاتا کبھی وہ میرے پاس آجاتی۔ وہ اپنے آپ کو علم موسیقی کا ماہر سمجھتی تھی مگر ایک دفعہ اس کا گانا سننے سے معلوم ہوا کہ ماہر تو ماہر وہ موسیقی کے ابجد سے بھی واقف نہیں البتہ عورت ذرا طرحدار تھی خدا جانے وہ مجھ بڈھے سے کیوں اس قدر مانوس ہوگئی کہ تھوڑے ہی دن بعد ہر وقت میرے پاس گھسی رہنے لگی۔ مجھے بھی اس جنگل میں منگل غنیمت معلوم ہوا۔ خیر جناب! آمدم بر سر مطلب جب تالاب بنکر تیار ہوگیا تو اس کی افتتاحی رسم کے لیے تاریخ مقرر ہوئی۔ میرا حال یہ کہ سارے خوشی کے پھولوں نہ سماتا تھا۔ وہ بات پرانی پڑگئی اس لیے اب آپ سے کیا تکلف کروں مگر حقیقت یہ ہے کہ فن کے اعتبار سے عثمان ساگر میں جو خصوصیات ملحوظ رکھی گئی ہیں وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی اور تالاب کو میسر ہوں۔ جوں جوں افتتاح کی تاریخ قریب آجاتی میں خوشی کے مارے جامہ سے باہر ہوا جاتا تھا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ "افوہ! جب ہزار ہا آدمی امنڈ آئیں گے اور سب کی نگاہیں مجھ پر جمی ہونگی تو مسرت سے میرا کیا حال ہوگا"۔

خیر جناب خدا خدا کرکے جب وہ مبارک دن آیا تو بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ آیات قرآن پڑھی گئیں تقریریں ہوئیں۔ عہدہ داروں کو اٹ ہوم دیا گیا ہزار ہا آدمی کنٹے پر کھڑے تالاب کی موجوں کو دیکھتے رہے مگر کسی نے جھوٹے منہ بھی یہ نہ پوچھا کہ "یہ کس انجنیر کی محنت کا نتیجہ ہے؟"

میں اس سوچ میں کھڑا تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ سارے مجمع میں ایک ہلچل مچ گئی۔ میں سمجھا شاید لوگوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ اس عظیم الشان مہم کا سہرا میرے سر ہے اور اسی لیئے وہ میرے دیکھنے کے مشتاق ہیں مگر پلٹ کر جو دیکھتا ہوں تو ہماری گنگا بائی صاحبہ مع اپنے سازندوں کے خراماں خراماں چلی آتی ہیں اور شیدائیوں کا ایک جم غفیر ہے کہ گردنیں اٹھا اٹھا کے ان کی زیارت کا مشتاق ہے۔ قینچی کی طرح ہر طرف سے زبانیں چلنے لگیں کہ "دیکھو گنگا بائی یہی ہے۔

"یہی ہے وہ جو گانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ دلربا اداؤں کا سارا حیدرآباد شیدائی ہے جس کے تیر نظر بے پناہ ہوتے ہیں۔ جس کی تیغ ابرو کا ایک زمانہ گھائل ہے"۔ اتنے میں تھوڑی دور پر میرے طرف اشارہ کرکے کچھ آدمی یہ کہتے سنائی دئے۔

"دیکھو دیکھو یہی ہے وہ بڈھا خوش نصیب انجنیر جس پر یہ کافر ادا جان دیتی ہے"، میرے قریب ہی ایک صاحب کھڑے گنگا بائی کے حسن پر کچھ تنقید فرما رہے تھے مجھے جو اپنی طرف گھورتے دیکھا تو ایک والہانہ انداز

ہیں فرمانے لگے۔

"کیوں حضرت۔ کبھی آپ نے بھی اس کا گانا سنا ہے۔ واللہ عجب گلا پایا ہے انسان تو انسان میں سمجھتا ہوں جانور بھی اس کی آواز سے مست ہو جائیں۔"

میں نے بڑی مشکلوں سے اس کو روک کر پوچھا "اچھا جناب! کچھ آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ یہ تالاب کس نے بنایا؟"

"نہیں صاحب مجھے نہیں معلوم کسی انجینیر نے بنایا ہوگا۔"

"اچھا یہ تو فرمائیے کہ حیدرآباد میں بہترین انجینیر کون ہے؟" میں نے پوچھا "اجی جائیے حضرت۔ کدھر کی فضول باتیں لگائے ہیں آپ نے۔"

"اچھا جناب کم سے کم اتنا تو بتا دیجیے کہ یہ گنگا بائی صاحبہ آج کل ٹھیری کہاں ہیں۔" "نعیم الدین کوئی انجینیر ہیں ان کے بنگلہ میں ٹھیری ہوئی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجمع کو چیرتا پھاڑتا اپنے ساتھی سمیت آگے نکل گیا۔"

بڈھے انجینیر کی یہ داستان سن کر میں بے اختیار ہنسنے لگا۔

"ابھی سنئے تو حضرت! قصہ یہیں نہیں ختم ہوتا۔" اس نے کہا "دوسرے دن جب میرے پاس صحیفہ آیا تو بڑے اشتیاق کے ساتھ میں نے اسے کھول کر دیکھا کہ شاید میرا بھی کہیں ذکر خیر ہو۔ اس دن کے صحیفہ میں تمام خبریں تھیں کہ "مطلع ابر آلود ہے۔ ایک جھٹکہ والے نے ایک بنڈی کو ٹکر دی ایک شخص چوک اسپان کے کلال خانہ سے بیس روپے کے زیورات لیکر فرار ہوگیا یہ تمام خبریں تھیں مگر نہیں تھا تو میرا ذکر۔

مشیر دکن نے عثمان ساگر کی افتتاحیہ رسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"کل نہایت خوشگوار موسم میں ایک بڑے مجمع کے سامنے نواب صدر اعظم بہادر نے عثمان ساگر کی افتتاحیہ رسم ادا کی۔ فلاں فلاں عہدہ دار موجود تھے ...... جس وقت حیدرآباد کی مشہور مغنیہ مس گنگا بائی اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ اس رسم میں شرکت کے لئے آئیں تو سارے مجمع میں مسرت کی ایک برقی لہر دوڑ گئی .... وغیرہ وغیرہ"

بس جناب! اُس دن سے میں نے پبلک کی شہرت اور ایسے شہرت طلب دونوں پر لعنت بھیجی — کچھ ایک انجینیری پر ہی منحصر نہیں۔"

میرے نئے ملاقاتی نے تھوڑے سکوت کے بعد کہا "جس طرف دیکھئے باکمال لوگ گمنامی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں خود بعض ایسے شاعروں کو جانتا ہوں جن کا کلام داغ و امیر کو شرماتا ہے مگر

کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں ۔"

اب تک تو میرے انجینیر دوست ایسے میدان میں جولانی دکھا رہے تھے جس کا میں مرد نہ تھا اب جو وہ بڑھتے بڑھتے میری سرحد میں اتر آئے تو مجھ سے ' رہا گیا میں نے کہا " کچھ ہمیں بھی بتایئے ایسے کون سے موتی ہیں جو نااہل سنگریزوں کے انبار میں دب کر گمنام ہوگئے ۔"

" حضرت ! دو چار ہوں تو اُن کا ذکر کیا جائے ۔ اب میں آپ کو کس کس کے نام گناؤں " " جی کوئی ایک آدھ تو بتایئے ۔ ذرا ہم بھی آپ کے معلومات سے مستفید ہوں ۔"

" اچھا فرمایئے ۔ کبھی آپ نے خواجہ محمد باقر شیدا کا نام سنا ہے ؟ "

میں نے اپنے دماغ کے تمام گوشے چھان ڈالے مگر کہیں یہ نام نہیں ملا مجھے یقین ہوگیا کہ انجینیر کا ادبی ذوق بہت ناقص ہے ورنہ ممکن نہ تھا کہ داغ و امیر کا ہم پایہ کوئی شاعر حیدر آباد میں ہو اور مجھے اس کی خبر نہ ہو۔ میں یہ سونچ ہی چکا ہو رہا ۔ انجینیر غالباً میرے چہرہ سے میرے وہی خیالات تاڑ گیا ۔ اُس نے مسکرا کر کہا " آپ دل میں کہتے ہوں گے کہ بھلا اس بیوقوف انجینیر کو لیٹریچر سے کیا واسطہ ؟ "

" جی نہیں یہ بات نہیں " میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا " مگر تعجب ہے کہ ایسا نغز گو شاعر جیسا کہ آپ فرماتے ہیں یوں گمنام رہے ۔

اچھا ان کا کچھ کلام تو سنایئے ۔ میں بھی اردو ادب کا پرانا خادم ہوں تھوڑی دیر ہی دلچسپی رہے ۔"

" ارے میاں ۔ اس بڑھاپے کا برا ہو میرا حافظہ تو دو کوڑے کا ہوگیا ۔ ایک زمانہ تھا کہ مجھے ردیف وار خواجہ صاحب کی غزلیں حفظ تھیں یا آج ایک شعر پوچھو تو پورا یاد نہیں ۔"

" نہیں انجینیر صاحب ! ایک آدھ شعر تو فرمایئے ۔ ایسا بھی آپ کیا بھولے ہوں گے ؟ "

" بخدا ۔ یار ! میرا حافظہ ایسا ناکارہ ہوا ہے کہ کچھ نہ پوچھو ۔ شاید گھنٹوں سوچوں تو ایک آدھ شعر یاد آجائے "

" اچھا ۔ سوچکر وہ ایک آدھ شعر ہی سنایئے ۔"

بڈھا انجینیر ڈبہ کے چاروں طرف دیکھنے لگا ۔ وہ کبھی کھڑکی کے باہر گذرتے ہوئے جنگلوں کو دیکھتا اور کبھی مقابل کی سیٹ پر جو انگریز فوجی افسر اور اس کی بیوی بیٹھی تھی ان کی طرف ایسے مایوسانہ انداز سے دیکھنے لگتا گویا ان سے اس مشکل میں مدد کا طالب ہے ۔ آخر اس نے چھت کے برقی پنکھے پر نظریں جما دیں اور اس کی گردشوں میں محو ہوگیا ۔ کوئی پانچ منٹ اس حالت میں گذرے ہوں گے کہ یکایک اُس کے متفکر چہرہ

پر مسرت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "دیکھئے ایک مطلع یاد آیا ہے۔ یہ خواجہ صاحب کے بہت معمولی شعروں میں سے ہے مگر ذرا سنئے گا۔ فرماتے ہیں ؎

گل تصویر ہوں یا چشم تصویر عنا دل ہوں۔

دوبارہ اس نے نئے جوش کے ساتھ پھر اسی مصرعہ کو دہرایا ؎

گل تصویر ہوں یا چشم عنا دل ہوں۔
نہ میں ہنسنے کے قابل ہوں نہ میں رونے کے قابل ہوں

واہ واہ۔ میں تڑپ اٹھا۔ بوڑھے انجینیر کے ادبی ذوق کے متعلق میرے دل میں جتنے شبے تھے اس ایک شعر نے وہ سارے دھو دئے۔

"حضرت! یہ باقر صاحب ہیں کون صاحب؟" میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"جی یہ وہ صاحب ہیں جو اس حیدرآباد کی پانچ لاکھ آبادی کے درمیان تنگدستی اور افلاس کے خوفناک پنجہ میں پھنسے ہوئے ایڑیاں گھس گھس کر مرے ہیں" بڈھے انجینیر نے اپنے تمتمائے ہوئے گلوں پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ میں اس دردناک خبر سے پوری طرح متاثر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نظام آباد کا اسٹیشن آگیا اور میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"حضرت یہ تو بتاتے جائیے" بوڑھے انجینیر نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "کہ آپ کا نام کیا ہے اور آپ یہاں کیا کام کرتے ہیں۔"

"میں نظام کالج میں شعبہ مشرقی کا صدر ہوں" میں نے کہا "شاید آپ نے میرا نام سنا ہو عبدالعزیز؟"

"جی نہیں" بوڑھے انجینیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوق زرین ہمہ در گردن خر می بینم"

(ماخوذ از ہیجوف)

جناب سید صلاح الدین احمد عروج خلف عرش گیاوی

بظاہر شیشۂ دل گو نہاں معلوم ہوتا ہے
مگر اس جامِ جم میں اک جہان معلوم ہوتا ہے

لگا دی آگ کیا صیاد نے میرے نشیمن میں
چمن کے اک شجر میں کچھ دھواں معلوم ہوتا ہے

اسی رستے سے گذرے کیا ہمارے قافلے والے
مٹا سا نقشِ پائے رہرواں معلوم ہوتا ہے

نہیں کچھ وحشیوں کو دھوپ کی تکلیف صحرا میں
کہ سایہ ہر شجر کا سائباں معلوم ہوتا ہے

نہ قبروں کو کرو پامال تم گورِ غریباں ہیں
انہیں سے کچھ نشانِ رفتگاں معلوم ہوتا ہے

عروجِ خستہ کی ساری کہانی سن کے وہ بولے
کہ تو دلی کا کوئی قصہ خواں معلوم ہوتا ہے

جناب نورالہدیٰ صاحب متعلم کلیہ جامعۂ عثمانیہ

ناٹک یا سینما کوئی نیا ادب نہیں پیدا کرتے۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ ڈراما کو جس میں تذکرہ کو مطلق دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کے کردار مکالمہ کے ذریعہ سارا قصہ ظاہر کر دیتے ہیں، اچھے سے اچھے اور زیادہ سے زیادہ موثر پیرایہ میں پیش کریں تاکہ تفریح کی تفریح ہو اور وہ تمام چیزیں جنہیں ادیب بتلانا چاہتا ہے بقول "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کے دیکھنے والوں کی نظر کے سامنے پھر جائیں۔ چنانچہ سینما اور ناٹک سے ادب کو بھی ایک فائدہ ہے کہ اُن کے ذریعہ ادیب کے خیالات خشک الفاظ سے بڑھ کر چلتی جاگتی اور بولتی تصویریں بنکر ظاہر ہوتے ہیں۔

اسٹیج بھی ڈراما کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ جس طرح ڈراما نے قدیم زمانے کے دو شخصی مکالمہ سے ترقی کر کے موجودہ زمانے کے باقاعدہ پلاٹ کہنے والے ادبی شاہکاروں کی شکل اختیار کرلی ہے، اُسی طرح اسٹیج نے بھی کھلے میدان سے ترقی کر کے جس میں لباس اور منظر وغیرہ کی چاشنی نہ تھی اس زمانے کے عظیم الشان اسٹیج کی شکل اختیار کرلی ہے جس میں اداکاروں کے علاوہ سین۔ لباس اور روشنی سے بھی بہت مدد لیجاتی ہے۔

اُس زمانہ سے اب تک اسٹیج کا ارتقا بلا روک ٹوک اور بغیر مسابقت کے جاری رہا۔ موجودہ صدی کے اوائل میں اس کا ایک رقیب بھی پیدا ہوا جو اس پرانے زمانہ کی چیز پر بری طرح چھا گیا اور آج کل تو بولتے فلم اور رنگین فلم کی ایجاد کی وجہ سے مسابقت اور بڑھ گئی ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ اس ربع صدی کی لڑائی کا آخری فیصلہ ہو جائے اور اسٹیج دنیا سے ہمیشہ کے لئے اٹھ جائے۔

یہ دیکھنے کے لئے سینما اور اسٹیج دونوں میں سے ادب کو کس سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ادیب کے خیالات کو بروے کار لانے کے کس کے پاس زیادہ اچھے ذرایع ہیں۔

عام طور پر صرف سینما کے اچھے فلم بڑی جانفشانی اور بڑے صرفہ سے تیار ہوتے ہیں۔ مصنفین کو نہایت معقول

بلکہ نامعقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اداکاروں کو چھ ہزار پونڈ (تقریباً ۸ ہزار روپے) ہفتہ وار تنخواہ دی جاتی ہے۔ ڈائرکٹروں کو بھی تقریباً اتنا ہی معاوضہ ملتا ہے۔ فوٹوگرافر۔ انجنیر وغیرہ بھی بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں جس کی وجہ سے قدرتاً اچھے سے اچھے آدمی مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سینری اور لباس وغیرہ پر بھی بیدریغ پیسہ صرف کیا جاتا ہے ـــــ "بن حر" چھ ملین ڈالر میں تیار ہوا۔ "ہلس اینجلس" ۴ ملین ڈالر میں۔ "نوآز آرک" اور "دی کنگ آف جاز" دو ملین ڈالر میں اور سینکڑوں ۱ ملین ڈالر میں تیار ہوئے۔ یہ سارا خرچ۔ ساری کاوش اور ساری تیاری صرف ایک دفعہ یعنے نگیٹو تیار ہونے تک ہوتی ہے اس کے بعد اس نگیٹو سے نہایت کم خرچ پر بے شمار کاپیاں نکال لی جاسکتی ہیں جو دنیا کے طول وعرض میں بھیج دی جاتی ہیں اور سینما کمپنیوں کو نہایت آسانی سے فلم کی لاگت سے کہیں زیادہ آمدنی ہوجاتی ہے۔ برخلاف اس کے ناٹک کمپنی کا کھیل صرف اسی شہر کے لوگ دیکھ سکتے ہیں جہاں وہ تماشہ بتلا رہی ہے اور اس کو آمدنی بھی انہیں سے ہوتی ہے۔ اس لئے ناٹک کمپنی کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اداکاروں وغیرہ کو اتنا معاوضہ دے یا کھیل اس اہتمام سے تیار کرے۔ اگر وہ ایسا کرے بھی تو اس کو کسی صورت میں اس کا معاوضہ نہیں مل سکتا۔

اداکار ڈراما کو اسٹیج پر لانے کے لئے یا فلم بنانے کے لئے سب سے پہلے اداکاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سینما کمپنیوں نے بڑی بڑی تنخواہیں دیکر نہ صرف ناٹک کے اکثر نامور اداکاروں کو اسٹیج سے چھین لیا بلکہ اس غیر معمولی معاوضہ کی خاطر بعض دوسرے لوگ بھی جن کا پیشہ پہلے کچھ اور تھا اس طرف کھنچ آئے۔ اور ان میں سے بہت سارے آج نہایت کامیاب اداکار ہیں۔ اڈمنڈ لو اور لوئی ویہم پہلے یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے والیس بیری سرکس میں تھا۔ کے فرانسس سکرٹری کا کام کرتی تھی۔ تھلما ٹاڈ معلمہ تھی۔ کامن بارنس ناول نویس اور کارل ڈین انجنیر تھا۔

فلم کے خاص خاص کردار کا پارٹ کرنے کیلئے اداکاروں کا انتخاب اداکاروں کے انتخاب میں بھی سینما کمپنی بڑی کاوش سے کام لیتی ہے۔ اداکاری کی قابلیت کے علاوہ اس بات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جو شخص جس کردار کا پارٹ کرے اس کی شکل وصورت بھی جہاں تک ہوسکے کردار کے مطابق ہو یعنی تقریباً ویسی ہی ہو جیسی قصہ کی تصنیف کے وقت مصنف کے ذہن میں تھی۔ اس کے لئے بعض سینکڑوں بلکہ ہزاروں اداکاروں میں سے ایک کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سینما کے اچھے اور برے اشخاص صورت بیں حالت میں س کی تفسیر بنے ہوئے ہوتے ہیں اور ہر شخص کی پیشانی پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کیسا پارٹ کرسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب انگلستان کے ممتاز ناول نویس سرجے۔ ایم۔ بیری کے زندہ جاوید فسانہ "پیٹرپین" کا فلم تیار ہو رہا تھا اس وقت ہیرو کے دلچسپ کردار کے لئے اداکاروں کے انتخاب

کی بحث پیش آئی۔ سینکڑوں بچوں اور نوجوانوں کو مصنف کے آگے پیش کیا گیا مگر وہ سر ہلاتے رہے۔ بالآخر اس فلم کے ڈائرکٹر نے بٹی برانسن نامی ایک کمسن اداکارہ کو یہ مردانہ پارٹ سپرد کیا اور وہ ہیرو کا لباس پہن کر جب ایم بیری کے سامنے آئی تو وہ بول اٹھے کہ اس فسانہ کی تصنیف کے وقت ہیرو کا جو تخیل میرے ذہن میں تھا وہ بعینہ ایسا تھا ـــــــــ

ناٹک کمپنی کے پاس اداکاروں کی محدود تعداد ہوتی ہے اور ان کو انتخاب کا یہ موقع نہیں مل سکتا۔

سٹنگ اشخاص کے سوا اسٹیج یا پردہ سینما پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب سٹنگ کے تحت آجاتا ہے۔ اس لحاظ سے ناٹک کا سینما سے مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اسٹیج کی دنیا چند مربع فیٹ پر مشتمل ہے اور سٹنگ بنانے والا مجبور ہوجاتا ہے کہ اسی رقبہ میں کھیلے۔ برخلاف اس کے سینما میں جس سین کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام و کمال بنالیا جاسکتا ہے اس لئے کہ نہ تو جگہ کی قید رہتی ہے نہ رقم کی کمی ـــــ "بن حر" کی تیاری کے وقت اس سین کے لئے جہاں مسالہ اور بن حر کا چاریٹ ریس ہوتا ہے ایک عظیم الشان امفی تھیٹر بنایا گیا۔ یہ اس قدر بڑا تھا کہ رومنوں کی یادگاروں میں بھی اتنا بڑا امفی تھیٹر نہیں ہے۔ اس فلم کی بحری لڑائی کے لئے قدیم طرز کے سولہ سترہ جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا گیا۔ اس زمانہ کا ماحول پیدا کرنے کے لئے بیت المقدس وغیرہ جیسے شہر تعمیر ہوئے۔ سڑکیں بنیں اور ان پر ہزارہا اداکار اسی زمانہ کا لباس پہنے ہوئے پھرنے لگے تب جاکر کہیں وہ اثر پیدا ہوا جو بن حر میں تھا۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بعض سین سینما کمپنی میں نہیں تیار کئے جاسکتے۔ ایسی صورت میں کمپنی کا اسٹاف اپنے مقام سے ہزارہا میل کے فاصلہ پر پہنچ جاتا ہے۔ "سن آف دی شیخ" کا بڑا حصہ اری زونا کے ریگستان میں تیار ہوا۔ پیراماونٹ کمپنی کے کئی اداکار۔ فوٹوگرافر وغیرہ اسی بے پناہ ریگستان میں چھ مہینے تک سختیاں جھیلتے رہے تاکہ فلم میں عربی ماحول پیدا ہو۔ اس طرح افریقہ اسپیکس، اور ٹریڈر ہارن تمام و کمال افریقہ کے وحشت ناک جنگلوں میں تیار ہوئے۔

سٹنگ کا ایک اثر خود مصنف پر بھی پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر اسٹیج کے لئے ڈراما لکھا جائے تو لکھنے والا مجبور ہوجاتا ہے کہ اس میں صرف انہیں چیزوں کو لائے جو اسٹیج پر بتلائی جاسکتی ہیں۔ ہوائی جہاز۔ ریل گھوڑ دوڑ۔ اور اس قسم کی صدہا چیزوں سے اجتناب کرنا پڑتا ہے۔ گویا ڈراما نویس مجبور ہوجاتا ہے کہ ڈراما میں حیات کی صرف انہیں چیزوں کو پیش کرے جو اسٹیج پر آسکتی ہیں۔ برخلاف اس کے سینما اس کے لئے ہر قسم کا میدان کھول دیتا ہے اور وہ جو چاہے لکھ سکتا ہے چاہے اس کے قصہ میں دو یا زیادہ ہم شبیہ کردار ہوں۔ موٹر کی ٹکر ہو۔ ہوائی جنگ ہو یا جو کچھ ہو سب سینما میں نہایت اصلیت کے ساتھ بتلایا جاسکتا ہے۔ کیو واڈس۔ مسالینا۔ لاسٹ ڈیز آف پامپے آئی۔ نوازار کی

آل کوائٹ آزادی وشرن فونٹ وغیرہ جیسے کھیل کس اسٹیج پر بتلائے جا سکتے تھے اور اگر بتلائے بھی جاتے تو کیا وہ اثر پیدا ہو سکتا جو ان فلموں میں ہوا۔

سینما کیمرہ سینما کے پاس ایک اور زبردست ہتھیار ہے جس سے کام لیکر وہ اپنے منتخب اداکاروں اور قیمتی سٹنگ سے زیادہ سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا۔ یہ ہتھیار کیمرہ ہے۔ موجودہ زمانہ کا کیمرہ اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ بقول جان باری مور۔ "سوائے اخبار پڑھنے کے یہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔ تصویر کو تخصیص کے ساتھ بتلانا۔ اداکار کو اس کے اصلی قد سے چھوٹا یا بڑا کرکے پیش کرنا۔ ایک احول کو یا ایک پیئے ہوئے شخص کو اشیا جیسی نظر آتی ہیں ویسی بتلانا۔ تصور یا خواب وغیرہ کے سین پیدا کرنا غرض اس قسم کے صدہا کام اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔ چونکہ سینما کا سب سے اہم آلہ یہی ہے اس لئے اس کے کام کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

سین کو تخصیص کے ساتھ بتلانا سینما میں سین کو تخصیص کے ساتھ بتلایا جاتا ہے مثلاً ایک خون کے منظر کی اجمالی تصویر کے بعد قاتل و مقتول کی تصویر پھر قاتل کے چہرہ کی یا اس کی آنکھوں کی تصویر بتلائی جاتی ہے۔ ناٹک میں یہ کام ٹارچ لیٹ سے لیا جاتا ہے۔ اسٹیج کی روشنی گل کر دی جاتی ہے اور اداکار یا اس کے جسم کے کسی حصہ پر پیچھے سے یا فٹ لائٹ کے پاس سے یا ونگ کے اندر سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے سینما میں اس خاص چیز سے جسے بتلانا ہوتا ہے سینما کا پردہ بھر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے خاص اثر پیدا ہوتا ہے۔

مختلف زاویوں پر سے تصویر لینا سینما کا کیمرہ بہت کم سطح نظر کے برابر رکھا جاتا ہے یا تو اس سے اوپر رکھا جاتا ہے یا نیچے جس کی وجہ سے نہ صرف تنوع پیدا ہوتا ہے بلکہ بعض خاص اثرات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کیمرہ سطح نظر سے اوپر رکھا جائے تو اداکار او منظر اصل سے چھوٹے نظر آتے ہیں اور اگر نیچے رکھا جائے تو چیز اصل سے زیادہ بلند نظر آتی ہے۔ لجاجت، تمنا، بیچارگی کی اداکاری کی تصویر اوپر سے لیجاتی ہے۔ اسی طرح ایک بہادر کردار کی یا بادشاہ کی یا ملکہ کی تصویر اکثر دفعہ کیمرہ کو کسی قدر نیچے رکھ کر لیجاتی ہے جس کی وجہ سے منظر زیادہ بلند ہو کر زیادہ مہیب یا زیادہ شاندار ہو جاتا ہے۔

انگلستان کے شہرۂ آفاق اکٹر جارج آرس کا ایک فلم "ڈزرائیلی" تیار کیا گیا۔ جارج آرس نہایت باکمال اکٹر ہے۔ مگر اس کا قد انگلستان کے مشہور وزیر اعظم ڈزرائیلی کے قد سے چھوٹا تھا۔ سینما کمپنی نے نہایت آسانی سے اس کے اس نقص کو دور کر دیا گیا اور جب فلم تیار ہو کر انگلستان آیا تو اسٹیج والے قائل ہو گئے کہ وہ جارج آرس کو اس طرح نہ پیش کر سکے

ناٹک میں تماشائی صرف ایک ہی زاویہ نگاہ سے منظر کو دیکھ سکتا ہے اور اسٹیج پر اداکاروں یا منظروں کو اس طرح مختلف زاویوں سے بتلانا ناممکن ہے۔

پکسنگ | پکسنگ کے معنے متعدد مناظر کو وقت واحد میں تبلانے کے ہیں۔ اس کے ذریعہ خواب۔ تصور اور اس قسم کے دوسرے اثرات پیدا کئے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں میگنی فی سنٹ فلرٹ" نامی ایک فلم حیدرآباد میں تبلایا گیا جس میں پکسنگ سے خاص کیفیتیں پیدا کی گئی تھیں ۔۔۔۔۔ پیرس کے شبانہ جلسوں میں شریک ہونے کی تیاری کا ایک سین یوں بتلایا گیا تھا۔ پہلے ایک حسین عورت کا چہرہ پردہ پر نمودار ہوا جو ہونٹوں پر روج لگا رہی تھی۔ اس کے بعد ایک سے دو چہرے پیدا ہوئے۔ دو سے تین ہوئے اور تھوڑی دیر میں سارا پردہ اسی قسم کی شکلوں سے بھر گیا جو یہی کام کر رہی تھیں ہر جگہ جلسوں میں جانے کے لئے بناؤ سنگھار ہو رہا ہے۔ اسی طرح اس فلم کے ایک اور سین میں شراب نوشی کا منظر یوں شروع کیا گیا ـــــ پہلے پردہ پر ایک ہاتھ آتا ہے جو جام میں کاک ٹیل ڈال رہا ہے۔ جونہی شراب ساغر میں پڑتی ہے سارا پردہ کاک ٹیل کے شیشوں اور ساغروں سے بھر جاتا ہے ـــــ یہ اور اس قسم کے سینکڑوں اثرات جو ہر روز ہر فلم میں نظر آرہے ہیں اسٹیج پر کسی صورت میں ممکن نہیں۔ یہ چیز اس قدر عام ہو گئی ہے کہ اس کی ندرت جاتی رہی اور سینما دیکھنے والے اس پر غور بھی نہیں کرتے۔

لائٹ | ناٹک اور سینما میں لائٹ سے خاص کام لیا جاتا ہے۔ کئی مناظر ادب کئی اداکار حقیقت میں اتنے خوبصورت یا مہیب نہیں ہوتے جیسے کہ نظر آتے ہیں۔ مریمؑ یا عیسیٰؑ کا پارٹ کرنے والے اداکاروں کی اتنی مقدس صورت نہیں ہوتی اور نہ خونی کا پارٹ کرنے والے کی ایسی ڈراؤنی ـــــ یہ سب روشنی کو خاص خاص زاویوں پر سے اداکار پر یا اس کے کسی حصہ جسم پر ڈالنے کے کرشمے ہیں۔ اسٹیج پر بھی اس سے ایک حد تک کام لیا جاتا ہے مگر اتنا نہیں جتنا کہ سینما لے سکتا ہے اس لئے کہ فلم کی تیاری کے وقت یہ بالکل ممکن ہے کہ جس زاویہ سے چاہیں روشنی ڈال سکتے ہیں اور اسٹیج پر حاضرین کی نشستوں وغیرہ کی وجہ سے بعض جگہ سے لائٹ ڈالنا یا اداکار کے چہرہ پر صرف نیچے سے لائٹ ڈالنا ممکن نہیں ـــــ یہ چیز ایسی ہے کہ بغیر تصویر کے صرف الفاظ کو دیکھ کر ہر وہ شخص جو لکھ سکتا ہے اس طرف راغب ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف اس کا فائدہ ہوتا ہے بلکہ ایک نئے مصنف کا اضافہ ہوتا ہے۔

سینما اسپریشن کا ذریعہ ہے | سینما ہر شخص کے آگے تخیل۔ حقایق۔ اور واقعات کی ایک دنیا کھول دیتا ہے جس سے ہر اس دیکھنے والے کو جس میں ادبی جوہر موجود ہے ایک قسم کا اسپریشن ملتا ہے۔ ہمارے حیدرآباد کے ایک نوجوان انشاپرداز ایک مقامی سینما میں ایک فلم کو دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس قصہ کو ملکی پیرایہ

پہنا کر اپنا لیا ــــ اس طرح سے نہ معلوم دنیا کے کتنے اور نوجوان ادیب سینما سے مستفید ہو رہے ہوں گے۔

خاتمہ | سینما کا وجود میں آئے ربع صدی سے کچھ ہی زیادہ زمانہ گزرا ہے۔ اس قلیل عرصہ میں اس نے بے جان روکھی پھیکی تصویروں سے آج اس کی جو حالت ہے وہاں تک ترقی کر لی ہے۔ اس دوران میں اس نے بائیبل اور الف لیلہ سے لیکر "آل کوائٹ آن دی وسٹرن فرنٹ" تک مشکل سے کسی ادبی شاہکار کو جس کا فلم بن سکتا تھا بخشا ہے۔ سر اونٹس کا ڈان کوک زوٹ، شکسپیر کے اکثر ڈرامے سوفٹ کا گلیورس ٹراولس۔ ڈومالس کلاں کا تھری سکٹیئرز، دوماس خورد کا کیملی، گوئٹھے کا فاوسٹ، ٹالسٹائے کا وزیر کشن، پرسی دن کا ذریعہ اس کو سمجھنا مشکل ہے اس لئے اسی پر اس کو ختم کیا جاتا ہے۔

بولتے فلم | سینما میں دو طرح کی کمی بری طرح محسوس ہوتی تھی۔ ایک اس کی خاموشی دوسرے اس کی بیرنگی۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ خاموشی بعض جگہ بہت پر اثر ہوتی ہے لیکن دوسرے موقعوں پر مثلاً مذاقیہ فلموں وغیرہ میں جب کہ مکالمہ زیادہ ہوتا ہے خاموش فلم بڑی مصیبت کا باعث ہوتے تھے۔ ہر منٹ میں کئی کئی دفعہ تصویر غائب ہو جاتی تھی اور عبارت نمودار ہوتی تھی اور ابھی لوگ اسے پوری طرح پڑھنے بھی نہیں پاتے تھے کہ غائب ہو جاتی اور چند سکنڈ کے بعد دوسری عبارت آجاتی۔ اس طرح عبارت بار بار تصویروں کے تسلسل میں حائل ہو کر بے لطفی پیدا کر دیتی تھی۔ مگر اب چند سال سے بولتے فلم کی ایجاد کی وجہ سے یہ کمی بھی پوری ہو گئی۔ ہر چیز کی ابتدائی حالت خراب ہوتی ہے۔ بولتے فلم کی آوازیں بھی پہلے پہل بہت سارے نقائص موجود تھے۔ مگر اس تین چار سال کے عرصہ میں بولتے فلم نے حیرت ناک ترقی کر لی ہے۔ جو لوگ مراکو، یا پیرا ماؤنٹ، آن پیریڈ، دیکھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ آواز سے سینما میں کس حد تک کام لیا جا رہا ہے۔ اور یہ کہ انسانی اور غیر انسانی آواز کی نقل کس قدر مطابق اصل ہو رہی ہے۔

یہاں بھی سینما کو اسٹیج پر دو طرح کی فوقیت حاصل ہے۔ ایک تو یہ کہ بولتے فلم میں اداکاروں اور دوسری چیزوں کی آواز کو اصل سے گھٹا بڑھا کر بتلایا جا سکتا ہے جس سے خاص اثر پیدا ہوتا ہے۔ مراکو میں اذاں یوں بتلائی ایک تاریک تھا جس میں کئی منارے او گنبد بھی تھے چنانچہ کہیں کہیں پھٹ پھٹ کر روشنی گر رہی تھی فضائے بعید میں ایک منارہ اور تھا جس میں ایک موذن آتا ہے اور نہایت موثر لہجے میں اذاں دیتا ہے۔

وہ اڑنی سما نوبت کی دھیمی صدا کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ

کا لطف آگیا۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ایک سنسان مقام میں بہت دور سے اذاں کی آواز آرہی ہے۔ اس کا ایک دفعہ اتنا اثر ہوا کہ حاضرین پر جن میں ۹۰ فیصدی یوروپین تھے ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ یہ اثر اور اس قسم کے دوسرے اثرات اسٹیج پر کسی طرح ممکن نہیں۔

دوسری بات یہ ہے ناٹک کے اداکار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ صرف وجیہہ ہو بلکہ خوش آواز بھی ہو۔ حالانکہ ایسے بہت لوگ ہیں جو وجیہہ بھی ہیں۔ اداکاری کی بہت اچھی قابلیت بھی رکھتے ہیں مگر خوش آواز نہیں ہیں۔ اسٹیج ان سے کام لینے سے عاجز ہے۔ سینما ان لوگوں سے کام لے سکتا ہے اس لئے کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ تصویر کسی کی لیجائے اور بولے کوئی اور۔ یہ دونوں چیزیں اس خوبصورتی سے ملادی جاسکتی ہیں کہ کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا کہ ہونٹ کسی کے ہلے اور آواز کسی اور کے دہن سے نکلی۔ اس میں نہ صرف ان تمام اداکاروں سے کام لینا ممکن ہوگیا جو گانا وغیرہ نہیں جانتے تھے بلکہ یہ بھی ممکن ہوگیا کہ ایک ایسا اداکار جو انگریزی نہیں جانتا ایک انگریزی ڈرامہ میں پارٹ کرے۔ بولتے کارٹون اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ یہ ترکیب اس قدر کامیاب ثابت ہوئی کہ رایو ریٹا کے اشتہار میں کمپنی کو ایک غیر جانب دار کمیشن کا ایک سرٹیفکٹ چھاپنا پڑا کہ اس فلم کی باب ڈانیلس کے کل گانے اصلی باب ڈانیلس کے منہ سے نکلے ہیں۔

رنگین فلم

دوسری کمی سینما فلم میں رنگ کی تھی۔ یہ کمی بھی ٹکنی کلر۔ ہارس کلر اور ملٹی کلر کے طریقوں پر رنگین فلم بنانے سے دفع ہو گئی ہے۔ اول الذکر طریقہ ایسا کامیاب ثابت ہوا کہ آج کل کے ہر اچھے فلم کا کم از کم ایک حصہ رنگین ہوا کرتا ہے اور ہر بڑی کمپنی ہر سال متعدد کل رنگین فلم بنا رہی ہے۔ اس باب میں بھی سینما کی حیرت انگیز ترقی موجود ہے۔ پیریس سے ’’کنگ آف جاز‘‘ کے اور کنگ آف جاز سے ویگا بانڈ کنگ اور پیراماؤنٹ آن پیریڈ کی رنگین فوٹوگرافی اچھی تھی۔ یعنے ایک سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے اور چوتھے فلم میں رنگ زیادہ روشن اور چمکدار ہوگئے۔

رنگین فلم کا مستقبل

ابھی لوگ اس پر بھی مطمئن نہیں ہیں۔ امریکہ میں فاکس۔ یونائیٹڈ آرٹسٹس۔ کوڈاک اور خود ٹیکنی کلر کارپوریشن۔ انگلستان میں فن لے اور الفورڈ کمپنی۔ فرانس میں یم، لومیر اور جرمنی کی آگنا اور یوفا کمپنیوں کے سائینس داں رات دن اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ سینما میں فلم میں بجائے تین رنگوں کے جیسا کہ اب ہوتا ہے قوس قزح کے کل رنگ آسکیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ پانچ سات سال کے بعد رنگین فلم بہت ترقی کریں گے۔ اور یہ کہ اس وقت فلم رنگین تیار ہوگا۔

سینما فلم کی یکسانیت

سینما کے اسٹیج پر یہ آخری اور اہم فوقیت یہ حاصل ہے کہ سینما فلم بالکل یکساں ہوتا ہے جو ایک دفعہ مکمل تیار ہوگیا کہ اس کی بے شمار کاپیاں ساری دنیا میں چلی جاتی ہیں اور جو فلم نیویارک کے کسی سینما میں جیسا نظر آتا ہے حیدرآباد میں یا ۱۶ ملیمیٹر فلم کے ذریعہ لوگوں کے گھروں میں بھی بالکل ویسا ہی نظر آئے گا۔ اس لئے کہ ایک دفعہ فلم بن جانے کے بعد اس پر نہ اداکار کی زندگی و موت کا اثر پڑتا ہے اور نہ سامان کا۔ برخلاف اس کے ایک ناٹک کمپنی ایک قسم کے حالات کے تحت جیسا کھیل کرسکے گی ویسا بہ سبب عدم دستیابی سامان یا اور کسی وجہ سے دوسرے حالات

تخت یا دوسرے مقام پر نہیں کرسکے گی اور خود اسی کمپنی کا اداکار ایک ہی کھیل میں ایک ہی پارٹ کو آج جس طرح ادا کرسکے گا کل نہیں کرسکے گا۔

مصنفین کی مالی سرپرستی ہالیوڈ اور سینما کے دوسرے مرکز بلکہ یہاں کی ہر ہر کمپنی مصنفین کے حق میں غزنوی اور اکبر کا دربار بنی ہوئی ہے جہاں سے ان کی شاہانہ سرپرستی ہو رہی ہے ـــــ بعض مقبول مطبوعہ فسانوں کا فلم بنانے کے لئے فسانہ نگاروں کو لاکھ ڈیڑھ لاکھ ڈالر تک دئے جاتے ہیں ـــــ اس غیر معمولی معاوضہ کی وجہ سے نہ صرف ان لوگوں اچھے اچھے ادبی کارنامے تیار کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے بلکہ ان کی سرسبزی ہوجسٹ وغیرہ ۔ لیو والیس کا ساحر۔ رائڈ ہیگرڈ کا شی، مارک ٹوین کا "کنگ ٹی کٹ بائی" وغیرہ اس کی چند اور بالکل چند مثالیں ہیں۔

اس قلیل عرصہ میں سینما نے نہ صرف کل گزشتہ ادبی شاہکاروں کا فلم بناڈالا بلکہ آج سینکڑوں مصنف رات دن سینما فلم کے لئے قصے لکھنے میں مشہور و معروف ہیں اور ایک نئے ادب کی تخلیق کر رہے ہیں جس کا نام آیندہ چلکر تفریحی ادب رکھا جائے گا اور جس میں مکالمہ سے زیادہ منظر کیفیت اور اثر کو اہمیت ہوگی ۔ بعض عمدہ فسانے جو خاص طور سے سینما کے لئے لکھے جاچکے ہیں اسی کے تحت آتے ہیں چپلن کا گولڈرش اور سٹی لائٹس، جینٹ گیز کا سنی سائیڈاپ، بب ڈانیلس کے ڈکسیانا اور زایو ریٹا، اور ماریس شوالے کا "لو پیریڈ" وغیرہ اس جدید ادب کی مثال ہیں جو سینما کی بدولت وجود میں آیا ہے اور پھل پھول رہا ہے۔

غرض بیسویں صدی کی اس ایجاد نے اس قلیل عرصہ میں بہت کچھ کر دکھایا ۔ جب اس کی ابتدا ہوئی تو لوگ اس کو ناٹک کی ایک بگڑی ہوئی شکل کہتے ۔ بڑے بڑے اسٹیج ایکٹر سینما میں کام کرنے کو اپنی ذلت سمجھتے تھے ۔ مصنفین، مضمون نگار اور کارٹونسٹ اس کی ہنسی اڑاتے تھے ۔ مگر باوجود اس تمام مخالفت کے سینما ترقی کرتا رہا اور آج ہماری حیات کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے ۔ اگر وہ لوگ جو اس کے خلاف لکھ کر مرچکے ہیں آج زندہ ہوتے تو پشیمانی کے ساتھ اپنے الفاظ واپس لے لیتے ۔ چنانچہ جو زندہ ہیں انہوں نے اپنی رائے بدل دی ہے ۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس زمانے کے سب سے ممتاز ڈراما نویس جارج برنارڈ شا نے (جن کے کسی قصہ کا فلم نہیں بنا) بولتے فلم کے نفوذ کو ناٹک کا کوس رحلت کہا ہے اور انہیں کے الفاظ پر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔

"بولتے فلم نے بیچارے اسٹیج کی رہی سہی بات بھی بگاڑ دی"

از

جناب سیّد علی حسین زیبا ردولوی

نشاط روح کو چونکا رہا ہے محبت کا فرشتہ گا رہا ہے

ذرا دیکھوں تو مجھ میں کیا رہا ہے زمانہ آئینہ دکھلا رہا ہے

میری فطرت مجھے رلوا رہی ہے زمانہ اپنی اپنی گا رہا ہے

خدا کا شکر ہے حال دل زار ادھر دو تین دن اچھا رہا ہے

قفس ہی اب نشیمن ہے کہ صیّاد چھری کے زور سے منوا رہا ہے

ذرا چہرہ تو دیکھو ناخدا کا کوئی طوفان جیسے آ رہا ہے

بڑی جنّت یہی ہے تو ہو راضی وگرنہ خُلد میں زیبا رہا ہے

سلطان غیاث الدین بہمنی

جناب محمد زکریا صاحب مائل (بھوپال)

"یہ مختصر مضمون خافی خان کی تاریخ کے ایک ٹکڑے آزاد ترجمہ ہے۔ اگرچہ سلطان غیاث الدین کو عموماً تاریخ بہمنیہ میں اس کی مدت حکومت کے بہت ہی قلیل ہونے کی وجہ سے بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے لیکن اس کی زندگی تاریخ خاندان مذکور کے سلسلہ کی ایک کارآمد کڑی ہونے کے علاوہ نوجوان فطرت کی بلند حوصلگی اور اس کے ساتھ دیوانی جوانی کی ناعاقبت اندیشی کا ایک عبرت خیز فسانہ ہے۔"

جب ۷۹۹ھ میں بہمنی خاندان کے نیک نام بادشاہ سلطان محمود شاہ کا انتقال ہو گیا تو اسی سال اس کا بیٹا سلطان غیاث الدین ملک دکن کا فرمانروا ہوا۔ یہ اس خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا۔

غیاث الدین نے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں اپنے باپ کی پیروی کی رعایا اور دربار کے ملازموں کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا، مناسب موقعوں پر ان کے ساتھ احسان کئے۔

دربار کے شریفوں پر اس کا ایک خاص احسان یہ بھی تھا کہ اس نے ترکی اور حبشی غلاموں کے بڑھتے ہوئے اختیارات کا خاتمہ کر دیا۔ یہ لوگ سلطان کے باپ دادا کے زمانہ میں سلطنت کے معاملات میں بہت دخل دینے لگے تھے اور اب ان کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ اس سے شریف سرداروں اور ملازموں کی حق تلفی ہوتی تھی اور یہ غلام جو چاہتے تھے، اندھا دھند کر گزرتے تھے۔ سلطان نے بادشاہ ہوتے ہی سب سے پہلے اس خرابی کی اصلاح کی۔ اور سارے ملک کو ان کے شر و فساد سے بچا لیا۔

غیاث الدین کے خیالات غلاموں کے متعلق پہلے ہی سے شریفانہ تھے۔ وہ شہزادگی کے زمانہ میں کہا کرتا تھا کہ "چونکہ بادشاہی خدا کی بہت بڑی امانت ہے، اس لئے بادشاہوں کے لئے کسی طرح مناسب نہیں کہ وہ سیدوں، شیخوں اور دوسرے شریف و عالم و فاضل لوگوں پر غلاموں اور کمینوں کو فوقیت دیں۔"

ترک غلاموں میں تغلچیں نام کا ایک غلام بہت زور پکڑ گیا تھا، اس نے مختلف ذریعوں سے اتنی قوت پیدا کر لی

تھی کہ اب اسے وزارت کے خواب نظر آنے لگے تھے، سلطان کے اس برتاؤ نے تغلچین کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا اور وہ سلطان کا سخت دشمن ہوگیا۔ اب اسے ہر وقت یہی فکر رہنے لگی کہ کب موقع ملے اور کب میں سلطان سے بدلہ لوں

زمانہ کے اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں، ادھر تغلچین سلطان کی فکر میں لگا ہوا تھا ادھر سلطان تغلچین کی لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ تغلچین کی لڑکی بڑی خوبصورت تھی اور صورت شکل میں ایک ہونے کے ساتھ ہی موسیقی کے فن میں بھی دور دور مشہور تھی قسمت کی بات ہے کہ سلطان کی نگاہ لڑگئی اور تھوڑے ہی دنوں میں محبت نے اتنی ترقی کی کہ سلطان کو جینا دوبھر ہوگیا۔ مجبور ہو کر سلطان نے نکاح کا پیام دیا مگر سنگدل غلام نے صاف انکار کر دیا اور کوئی کوشش مفید نہ ہوئی۔

جب تغلچین کو اچھی طرح یقین ہوگیا کہ سلطان پر عشق کا جنون پورا اثر کر چکا ہے تو اس نے ایک دن سلطان سے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"اگر جہاں پناہ چند رازداروں کے ساتھ اس موروثی غلام کے گھر قدم رنجہ فرمائیں اور اس بوڑھے غلام کی آرزو پوری ہو جائے تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے"

ساتھ ہی سلطان کے خاص مصاحبوں سے یہ بھی کہہ دیا کہ "جس وقت بادشاہ سلامت میرے گھر تشریف لائیں گے تو میں اپنی لڑکی کو تھوڑے قیمتی جواہرات کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں نذر کر دوں گا"

محبت کے جنون میں یہ مژدہ سلطان کے لئے بہت تھا، اس نے بے سوچے سمجھے تغلچین کی درخواست منظور کر لی اور اس نمک حرام کی خواہش کے مطابق چند خاص مصاحبوں کو ساتھ لیکر اس کے گھر پہنچ گیا۔

اپنے گھر میں تغلچین نے پہلے ہی سے سب انتظام کر رکھا تھا، سلطان کو ایک سجے سجائے تخت عروسی پر بٹھایا، جب پورے تکلف کے ساتھ مجلس آراستہ ہوگئی تو سلطان سے ادب کے ساتھ درخواست کی کہ "اب مجلس کو نامحرم آدمیوں سے خالی کر دیا جائے خلوت کی ضرورت ہے"

سلطان نے اب بھی کچھ خیال نہ کیا اور ذرا بھی احتیاط سے کام نہ لیا ورنہ آنے والے خطرہ سے بچ جاتا۔ فوراً حکم دے دیا کہ "سب ہمراہی باہر کی محفل میں ناچ گانے سے لطف اٹھائیں اور اس خلوت خانہ میں کوئی نہ آئے"

اب تغلچین نے اپنے ایک چالاک غلام فطرت نامی کو شراب پلانے کا حکم دیا اور اشاروں میں سمجھا دیا کہ "خوب پلا کر سلطان کو مدہوش کر دے"، جب سلطان شراب کے نشہ میں بیہوش ہوگیا تو اس نمک حرام نے اپنے چند بیدرد غلاموں کو آواز دی جو پہلے سے مکان کے ایک کونہ میں چھپا دئے گئے تھے۔ غلام بلائے ناگہانی کی طرح مظلوم سلطان پر ٹوٹ پڑے اور سلطان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجبور کر دیا۔ اس وقت تغلچین اٹھا اور اسی بیہوشی میں خنجر کی نوک سے سلطان کی

آنکھیں نکال لیں۔"

اس ظالمانہ کام سے فارغ ہوکر تغلچین نے سلطان کے ہمراہیوں کی خبر لی اور ان کو ایک ایک کرکے شادی کا خلعت دینے کے بہانے سے اندر بلایا اور مار ڈالا۔

موقع کے لحاظ سے اب اسے کوئی خطرہ نہ رہا تھا، اس نے فوراً ایک رازدار سے سلطان غیاث الدین کے بھائی سلطان شمس الدین کو بلوایا اور سلطنت کی مبارکباد دیکر قلعہ میں لے گیا اپنے ہمخیال امیروں اور غلاموں کو جمع کرکے اسی دن شمس الدین کی رسم تخت نشینی ادا کی اور خود وزیر مختار کی حیثیت سے سلطنت کے کام کرنے لگا۔

تمام معاملات پر مرضی کے مطابق قابو ملگیا تو تغلچین نے سلطان غیاث الدین کو بلاکر جان بخشی کا احسان جتایا اور اسی قید کی حالت میں قلعہ ساگرین بھیجدیا اس خرابی کے ساتھ غیاث الدین کی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ اور صرف ایک مہینہ بیس دن کی حکومت میں یہ سب کچھ ہوگیا۔

مبادی نفسیات

(رسالۂ حیدرآباد ٹیچر کی رائے)

نفسیات پر یہ ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے جو ہمارے سررشتہ کے ایک لائق رکن مولوی شیخ عبدالحمید صاحب شوق بی۔ اے (آنرز) صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ احمد پور کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس رسالے کو پیش کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ نوپیشہ مدرسین کو نفسیات کے ابتدائی مسائل سمجھنے میں سہولت ہو اور عام طور پر شائقین بھی مستفید ہوسکیں۔ بلاشبہ اس مقصد کے حصول میں قابل مؤلف کو کامیابی ہوئی۔ شروع سے آخر تک طرز بیان سلیس اور دلکش ہے جابجا حسب حال اشعار اور اقوال وغیرہ سے بھی کام لیا گیا ہے جس سے دلچسپی قائم رہنے کے علاوہ نفس مضمون کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس فن کے تراجم اور اردو تالیفات میں نامانوس انگریزی ترکیبوں اور ابہام وغیرہ سے سابقہ پڑتا ہے اور اکثر حصے چیستان سے کم نہیں ہوتے۔ مگر شوق صاحب کی تالیف ان اسقام سے بالکل پاک وصاف ہے جس کا مطالعہ یقین ہے کہ عام طور پر شائقین اور خاص کر مدرسین کے لئے بے حد مفید ہوگا۔ اس کامیابی پر ہم انہیں دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ لکھائی چھپائی بہتر اور کاغذ اچھا ہے۔ قیمت (۸؍) ہے۔ ملنے کا پتہ:۔

مکتبہ ابراہیمیہ باہتمامی امداد (محدود) متصل صدر پٹہ خانہ انگریزی حیدرآباد دکن

ادب

خشنشین | مسز ہنری شارپ کے ناول کا فاطمہ بیگم نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے چونکہ اس کا پلاٹ اسلامی فضا کا ہے اس لئے مشرقی قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ کتاب دارالاشاعت پنجاب سے بہت اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ مجلد شایع ہوئی ہے مکتبہ سے (۱۲ عا) میں مل سکتی ہے۔

الحمرا | واشنگٹن اورنگ کی تصنیف الحمرا کا ترجمہ غلام عباس صاحب نے کیا ہے۔ اور کتاب بہت اچھی جلد اور طباعت کے ساتھ باتصویر دارالاشاعت پنجاب سے شایع ہوئی ہے۔ قیمت (۱۲ عا)

فدائے شوہر | سید ناظم صاحب نشتر لکھنوی کی نظموں کا مجموعہ ہے اور باتصویر شایع ہوا ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ سے دستیاب ہو سکتا ہے

گردش آفاق | منشی تیرتھ رام فیروزپوری اس سے پہلے رینالڈس کے بکثرت ناولوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ جو ملک میں بہت مقبول ہوئے۔ یہی رینالڈس کے ایک ناول کا ترجمہ ہے۔ قیمت مکمل (۱۲ عہ)

تاریخ

توت عنخ آمون | جے۔ آر۔ رائے نے قدیم مصری تہذیب کے متعلق جدید تحقیق کی بنا پر یہ کتاب لکھی ہے۔ جس میں مصر قدیم کی زندگی اور مصری صنعت و تہذیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب دارالاشاعت پنجاب سے شایع ہوئی ہے قیمت ۱۲ عہ

سائنس

فوٹوگرافی | اردو میں عملی فنون پر کتابوں کی سخت ضرورت ہے اور یہ کتاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے اس میں سب سے پہلے علمی اور عملی فوٹوگرافی کی تفصیل سے تشریح کی گئی ہے۔ کتاب کے مصنف خواجہ محمد شجاع منعمی اور پبلشر فیروز پرنٹنگ ورکس ہیں

کتاب بہت اچھی کتابت وطباعت کے ساتھ مجلد شایع ہوئی ہے۔ جابجا تصویریں اور نقشے بھی ہیں مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔ قیمت (عہ)

ہما علم شفا بخشی لوئی کوہنی کی طبی تصنیف کا اُردو ترجمہ ہے، جس میں امراض کے متحد الاصل ہونیکے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ جس کی بنا پر مصنف نے ثابت کیا ہے کہ بغیر ادویات یا بغیر عمل جراحی امراض دفع ہوسکتے ہیں قیمت عہ

متفرق

صلاح کار اس نام سے قاضی ابو المعظم سید عبد الغفار صاحب نے ازدواجی زندگی کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے شروع میں ڈاکٹر میر سیادت علی خان کی تقریظ اور ڈاکٹر میر ولی الدین کا پیش لفظ ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے قیمت (۱۰)

چینی اور جاپانی افسانے

رسالہ "چاند" الہ آباد کی رائے

مرتبہ پروفیسر عبد القادر سروری ایم اے ال ال بی۔ دنیا کے شاہکار افسانے کا یہ ساتواں حصہ ہے، جو چینی اور جاپانی افسانوں کے بہترین مختصر قصص پر مشتمل ہے پروفیسر سروری کا ادب اردو پر یہ احسان ہے کہ وہ اس مخلص صنف ادب سے اردو کے خزانے کو مالامال کر رہے ہیں اور غالباً انہیں کی ایک پہلی ذات ہے جو مشرق بعید کی ادبیات عالیہ کو باضابطہ طور پر اردو سے روشناس کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مشرقی اور مغربی افسانوں کے وہ شاہکار جن کے لئے اب تک زبان اردو تشنہ تھی، اس سے بھی سروری صاحب اردو کو سیراب کر رہے ہیں۔ یہ حصہ جو ہمارے سامنے موجود ہے، جاپان اور چین کے افسانوں کا انتخاب ہے۔ انتخاب بہترین ہے۔ اس کے قصے نوعیت میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ کوئی قصہ رومانی ہے، اور کوئی اخلاقی ہے۔ اس طرح اگر ایک تاریخی ہے، تو دوسرا نفسیاتی ہے۔ غرضکہ ہر قصہ اپنی نوعیت میں اپنا آپ نظیر ہے۔ ناظرین سے ہم بزور سفارش کرتے ہیں کہ اس سلسلہ کے تمام افسانوں کے مجموعہ کو مطالعہ کریں۔ یقین ہے کہ دلچسپ اور مفید ثابت ہو۔ قیمت (۹/)

البدر مصنفہ حضرت مولوی محمد عبدالواسع صاحب عثمانی۔ پروفیسر حدیث کلیہ جامعہ عثمانیہ۔

یہ کتاب ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے بعض علما اس گئے گذرے زمانہ میں بھی جب کہ ہر مذہب کے پیشوا کسی نہ کسی طرح سے بدنام ہیں، دین کی صحیح تعلیم و تربیت کو صحیح طریقہ سے واضح کرنے کی خدمت برابر انجام دے رہے ہیں غزوہ بدر کے متعلق مخالفین اسلام کی تحریروں کے اثر سے جو جو شکوک پیدا ہو سکتے ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ کے بعد رفع ہو جاتے ہیں۔

مولوی صاحب نے "البدر" کو چار فصلوں پر منقسم کیا ہے۔ ابتدا میں ایک تمہید ہے جس میں مقصد تحریر ظاہر کیا ہے۔ پہلی فصل آیات سورۂ انفال کی تفسیر پیش کرتی ہے کیونکہ مخالفین اپنی رائے کی تائید میں اسی سورت کی آیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ دوسری فصل میں غزوہ بدر کے متعلق ۴۲ روایات صحیحہ اور ان کے ترجمے نقل کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں ان روایات سے جو نتایج رونما ہوتے ہیں ان کو ترتیب وار تحریر کیا ہے۔ یہ نہایت ضروری اور اصولی طریقہ کار تھا، کیونکہ انھی کی تحقیق و تصریح غزوہ بدر کے تمام اسباب و حالات کو روشن کر دیتی ہے۔

تیسری فصل سب سے زیادہ اہم ہے اور دراصل اسی کے مطالعہ سے مصنف کی محنت اور اپنے موضوع سے اعلی واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں واقعات غزوۂ بدر کی تحقیق کی گئی ہے۔ اور گذشتہ دو فصلوں میں جو نتیجے پیش کئے گئے تھے اُن کے اثرات وغیرہ پر بحث کی ہے۔ اس حصہ کا مطالعہ پڑھنے والے کی معلومات میں اسلام کے متعلق کئی اصولی امور کی نسبت اضافہ کرتا ہے۔ اور اس امر کا بھی احساس پیدا کراتا ہے کہ اصول روایت و درایت سے کام لینے، اور تاریخی انطباق کرنے میں مولوی صاحب کو کس قدر غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کرنی پڑی ہے۔

چوتھے اور آخری باب میں پہلے مخالفین کے دلائل کی تفصیلی تنقید کرنے کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے اور پھر اُن کے جملہ دلیلوں کی تنقید سلسلہ کے ساتھ لکھی ہے۔ یہ کام بھی محنت اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بہت کم اُس مولویانہ اسلوب سے کام لیا گیا ہے، جو ہمارے مذہب کے بعض تنگ نظر علما کی کتابوں کو مضحکہ خیز ثابت کرتا ہے

کتاب کے آخر میں عربستان قبل اسلام کا نقشہ دیا گیا ہے تاکہ بدر کا محل وقوع وغیرہ ظاہر ہو سکے۔

یہ کتاب کئی وجوہ سے قابل قدر اور مصنف کئی طرح سے لایق مبارکباد ہیں۔ اسلوب مولویانہ نہیں محققانہ ہے موضوع اہم ہے۔ اُردو میں تاریخ اسلام سے متعلق جسقدر لکھا جائے کم ہے۔ اور یہ کام ایسے ہی علما کا ہے جو ایک طرف تو اعلیٰ علم و فضل سے محروم نہوں اور دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات کی کمزوریوں اور اُن کے شبہات و نوعیت سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ مگر اس قسم کے علما ہمارے یہاں بہت کم ہیں۔ خوش اتفاقی سے مولوی عبدالواسع صاحب میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ آپ ایک عرصہ سے جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر دینیات و حدیث کی حیثیت سے طلبہ کے اعتراضات و شکوک کے جواب دیتے آرہے ہیں۔ اور موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنی نشوونما سے واقف ہیں۔

اس کتاب میں البتہ تفصیلی فہرست مضامین کی سخت ضرورت ہے تاکہ مطالعہ کرنے والے ہر بحث کو آسانی کے ساتھ نکال لے سکیں۔ حیرت ہے کہ مولوی صاحب نے جہاں غلط نامہ لگانے کی زحمت گوارا کی اس اصولی ضرورت کا خیال نہ رکھا!

ڈاکٹر سید محی الدین قادری

مرزاجی جناب ام، اسلم صاحب کی جدید ترین تصنیف ہے۔ اس سے پہلے مصنف نے بچوں اور صنف نازک کے لئے کئی قابل قدر کتابیں لکھیں ہیں۔ مصنف کو ہندوستان کی قدیم شایستگی سے بڑا لگاؤ ہے۔ چند روز ہوئے اسلم صاحب نے ایک کتاب "بڑی بی" کے نام سے شایع کی تھی جس میں مصنف موجودہ تہذیب کا ایک تاریک رخ پیش کیا تھا۔ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے، قدیم تہذیب کا ایک بہت دلچسپ مرقع "مرزاجی" کے لباس میں پیش کیا ہے یا پروفیسر محمد دین تاثیر کے قول کے مطابق "مرزاجی" کے لباس میں خود مصنف جلوہ گر ہوئے ہیں۔ قدیم تمدن جواب ہندوستان سے اُٹھ رہا ہے، اپنے اندر کئی دلکشیاں اور ایک استقلال اور پختگی رکھتا ہے۔ اس کے محاسن آئندہ ہم کو "مرزاجی" جیسے افسانوں ہی میں ڈھونڈنے پڑیں گے۔

"مرزاجی" مختصر افسانوں اور چند متفرق مضامین پر مشتمل ہے اس کتاب کا اسلوب مصنف کی اگلی تصانیف کے خلاف ظریفانہ ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت انسان بے تحاشا ہنس نہیں سکتا۔ اور بعد میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ پڑھنے والے کے لبوں پر ایک مسکراہٹ طاری ہوگی۔ اور اس کا حساس قلب اپنی معاشرہ کی زوال پذیر تاریخ میں گھسنے کی فکر میں پڑ جائے گا۔ یہ نتیجہ ہے اس کا کہ مصنف نے قدیم تہذیب کا خاکہ اڑانے کی بجائے اس پر ظریفانہ ہمدردی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے "مرزاجی" انگریزی کے

سراجردی کورلی اور دوسرے کرداروں کی طرح گذرنے والی شایستگی کی یادگار کے نمونے کے طور پر ادب میں عرصہ تک زندہ رہیں گے اس میں شک نہیں جس ذہن نے ان کی تخلیق کی تھی وہی ان کو فنا بھی کرسکتا ہے۔ لیکن ایسی تخلیقی ہستیاں ایک بار زندہ ہونے کے بعد اس قدر آسانی کے ساتھ مر نہیں سکتیں۔

ان افسانوں کے علاوہ "مزاجی" میں ام، اسلم صاحب کے چند متفرق مضامین اور پیروڈیاں بھی ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح اسلم صاحب کو سنجیدہ اسلوب پر قدرت ہے۔ مزاحیہ انداز میں بھی وہ خوب لکھ سکتے ہیں۔ مکالموں میں بعض جگہ پنجاب کے مخصوص اسلوب اور الفاظ قصوں کو "مقامی رنگ" کے نفیس مرقعے بنا رہے ہیں۔ اردو افسانوں میں یہ کتاب قابل قدر اضافہ ہے۔

عبدالقادر سروری

گلشن گفتار

رسالۂ "ہمایوں" کی رائے۔

مصنفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی مرحوم، جسے مولوی سید محمد صاحب ام، اے، نے ترتیب دیا ہے اور شروع میں ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے۔ یہ تذکرہ اب تک شعرائے اردو کا قدیم ترین تذکرہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں قدیم دکنی شاعروں کے علاوہ شمالی ہند کے صرف وہ شعرا مذکور ہیں جو ۱۱۶۵ھ میں وسیع شہرت کے مالک تھے، حاشیہ میں دوسرے قدیم تذکروں کے بیانات بھی درج کر دئے گئے ہیں جن سے معلومات میں خاص اضافہ ہوتا ہے شعرائے اردو کے تذکروں میں یہ تذکرہ بڑی اہمیت رکھتا ہے حجم (۸۸) صفحات قیمت (۱۲/)

ملنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود

متصل مطبع صدر خانہ انگریزی حیدرآباد دکن

مطبوعات دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) حیدرآباد دکن

علمی و ادبی کتابیں

۱۔ **اردو شہ پارے حصہ اول** از ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے پی ایچ ڈی، تاریخ اردوئے قدیم اور ابتدائے اردو سے لیکر ولی اورنگ آبادی تک نظم و نثر کا بہترین انتخاب مع نو تصاویر شعرائے قدیم ضخامت (۴۰۰) صفحے۔ قیمت مجلد ۱۲/۲

۲۔ **روح تنقید** از ڈاکٹر صاحب موصوف اردو میں فن تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت (۱۲/۱)

۳۔ **تنقیدی مقالات** از ڈاکٹر صاحب موصوف روح تنقید کا دوسرا حصہ پیش کردہ تنقیدی اصول کی روشنی میں چیدہ شعرا کے کلام پر تنقید و تبصرہ ضخامت (۵۰۰) صفحے مجلد قیمت ۴/۱

۴۔ **اردو کے اسالیب بیان** از ڈاکٹر موصوف ابتدائے اردو نثر سے لے کر موجودہ زمانے کے نثر نگاروں کے انداز تحریر و بیان کی ارتقائی تاریخ ضخامت (۲۰۴) صفحے مجلد (۶/۱)

۵۔ **محمود غزنوی کی بزم ادب** از ڈاکٹر صاحب موصوف غزنوی دور کی علمی و ادبی کارناموں کا مرقع ضخامت (۱۲۰) صفحے قیمت (۱۲/)

۶۔ **ارباب نثر اردو** از سید محمد ام، اے۔ اردو نثر نویسی کی تاریخ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفین اردو کا تذکرہ ضخامت (۲۲۰) صفحے مجلد قیمت عاں

۷۔ **دکن میں اردو**۔ از نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل جنوب ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اور آصفجاہی دور کے شعرا کا تذکرہ اور دکن کے علمی تصانیف رسائل اخبارات کے مفصل حالات ضخامت (۳۸۰) صفحے قیمت (عاں)

۸۔ **آثار الکرام** از حکیم سید شمس اللہ قادری ام، آر، اے ایس ایران وسط اور جنوبی ہند کے اسلامی سلاطین کے علمی ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت (۱۴۴) صفحے قیمت عصہ/۱۲

۹۔ **گلشن گفتار** مرتبہ سید محمد ام، اے۔ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ مع جامع مقدمہ ۱۱۶۵ھ سے پہلے کے دکن و ہندوستان کے مشہور شاعروں کے حالات نوشتہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی ضخامت (۸۵) صفحے قیمت ۱۲/

۱۰۔ **مقدمات عبد الحق حصہ اول**۔ مرتبہ مرزا محمد بیگ نعلقدار مولوی عبد الحق معتمد انجمن ترقی اردو پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ کے علمی ادبی اردو مقدموں اور

پیاموں کا مکمل مجموعہ جو مختلف موضوع کی گراں مایہ کتابوں میں شایع ہوئے تھے ضخامت (۴۰۳) صفحے قیمت (عار)

۱۱۔ مقدمات عبدالحق حصہ دوم (زیر طبع)

۱۲۔ دنیائے افسانہ از عبدالقادر سروری ام۔ اے ال ال بی۔ اردو افسانوں کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان پر تنقید اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ضخامت ۲۱۰ صفحے قیمت (عہ)

۱۳۔ کردار اور افسانہ از سروری افسانہ نگاری میں کردار اہم جزو ہے اردو کے چند مشہور افسانوی کردار عمرو عیار داستان امیر حمزہ، نجم النساء (مثنوی میر حسن)، (توبۃ النصوح) عون محمد (مراثی انیس) تنقیدی مقالات ضخامت (۲۳۲) صفحے قیمت عہ

۱۴۔ قدیم افسانے۔ از سروری۔ دنیا کے شہکار افسانوں میں سے قدیم ترین (۲۵) افسانوں کا مجموعہ ضخامت (۱۷۴) صفحے قیمت (عہ)

۱۵۔ چینی اور جاپانی افسانے بہ نگرانی سروری چین اور جاپان کے شہ کار افسانوں کا مجموعہ ضخامت (۲۱) قیمت (۹ر)

۱۶۔ انگریزی افسانے بہ نگرانی سروری انگلستان کے شہ کار افسانوں کا مجموعہ ضخامت (۱۴۰) صفحے قیمت (عہ)

۱۷۔ مبادی فلسفہ از میر حسن الدین بی۔ اے، ال ال بی ڈاکٹر اے یس راپورٹ پی ایچ ڈی کی پرائمر آف دی فلاسفی کا عام فہم سلیس اردو ترجمہ ضخامت (۱۳۶) قیمت (۱۳ر)

۱۸۔ مبادی نفسیات از شیخ عبدالحمید شوق بی، اے (آنرز) اردو زبان میں نفسیات سے متعلق اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ضخامت (۱۹۰) صفحے قیمت عہ

۱۹۔ قاموس الاغلاط۔ از مولانا سید مختار احمد وذہین پانچ ہزار الفاظ کی تحقیق اور اول اغلاط کی تصحیح جواب کے اہل تحقیق کے لیے مفید کتاب ضخامت (۸۴) قیمت (سے)

۲۰۔ محمود گاواں از ظہیر الدین سلطنت بہمنیہ کے وزیر و مدبر خواجہ جہاں محمود گاواں کی معتبر سوانح عمری ضخامت (۵۵) قیمت (۶ر)

۲۱۔ نیلگری۔ از حمید اللہ ام، اے، ال ال بی، جنوبی ہند کے صحت افزا مقام کی تاریخی و جغرافی مولفات ضخامت (۱۴۰) قیمت ۵ر

درسی و تعلیمی کتابیں

ان میں سے اکثر کتابیں قلمرو آصفیہ حضور نظام کے مدارس میں داخل نصاب ہیں

۱۔ خیابان اردو از عارف مدیر صبح دکن ہندوستان کے ماضی و حال کے ممتاز اردو و انشا پردازوں اور شعرا گرامی کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب ضخامت (۴۳) قیمت مجلد (عار)

۲۔ حدائق الاخلاق از مولانا ذہین کے نظم و نثر کا مجموعہ جو ہائی اسکولوں کیلئے نہایت مفید ہے ضخامت (۱۵۸) قیمت (عہ)

۳۔ تنظیم الاخلاق از سید عبدالعزیز عزیز لڑکے اور لڑکیوں کیلئے اخلاقی نظموں کا مجموعہ ضخامت (۹۸) قیمت (۱۲ر)

۴۔ خزینہ اخلاق از سید عبدالعزیز عزیز اخلاقی اور اول نظم و نثر کا مجموعہ جو لڑکے اور لڑکیوں کیلئے بیحد مفید ہے ضخامت (۶۴) صفحے قیمت ۶ر

تصنیفات حضور سلطان جہاں بیگم مرحومہ

حضرت نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ سابق فرمانروائے بھوپال نے عورتوں کی اصلاح و ترقی اور ان میں تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کی ترویج کے لئے جو عظیم الشان کوششیں فرمائیں اور جس طرح کی شاندار اسلامی اور علمی اور تعلیمی خدمات انجام دی ہیں ان سے کون ناواقف ہے۔ آپ کی مفید تصنیفات جو سلیس اور دلکش انداز بیان میں ہوتی ہیں، خاص طور پر خواتین کے لئے مفید ہیں عورتوں کے حقوق بچوں کی پرورش اور تربیت، معاشیات خانہ داری، تیمارداری وغیرہ کل ضروریات نسوانی پر آج تک کسی نے اس جامعیت اور توجہ سے قلم نہیں اٹھایا، جو آپ کی خاص خصوصیت ہے آپ کی یہ تمام مفید کتابیں جو صحت اور اہتمام سے چھپی ہیں، ہمارے ہاں سے مل سکتی ہیں:-

سیرت مصطفےٰ | سلیس اور سادہ اُردو میں آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک جو صحیح روایات پر مبنی ہے اور خاص طور پر عورتوں کے مطالعہ کے لئے تیار کی گئی ہے قیمت (عہ)

سبیل الجنان | ارکان اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اور دیگر شعائر اسلامی پر عورتوں کے مطالعہ کے لئے ایک دلچسپ اور بسیط کتاب ہے۔ قیمت (۱۲؍)

عفت المسلمات | پردے کی نسبت شرع شریف کے نقطہ نظر کی تشریح کے بعد مشرق اور مغرب کے حالات حاضرہ کی روشنی میں عالمانہ نقد و نظر قیمت (عہ)

اسلام میں عورت کا مرتبہ | اسلام نے عورت کو کیا مرتبہ دیا اور ان کی عزت و احترام کی نسبت کیا ہدایات دی ہیں ان پر ایک دلکش تقریر جو لیڈیز کلب بھوپال میں کی گئی ہے قیمت (۵؍)

مقصد ازدواج | اس کتاب میں ناکتخدا لڑکوں اور لڑکیوں کو شادی کے اصل مقاصد اور حسن معاشرت کے نکات عقلی اور اسلامی نکتہ نظر سے پیش کئے گئے ہیں قیمت (۱۲؍)

فرائض النسا | معاشیات خانہ داری، مکان اور اس کا سامان، ملازمین، صفائی، لباس، غذا، پانی، تیمارداری بچوں کی پرورش و تربیت غرض عورت کے فرائض زندگی کے ہر پہلو کو سلیس پیرائے میں اور اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے قیمت (عہ)

مجلّہ مکتبہ

ہدیتہ الزوجین | یہ نکاح میاں بیوی کے حقوق، تعداد ازدواج وغیرہ پر شرعی احکام کی روشنی میں ایک مفید رسالہ ہے قیمت (۱۰/)

حفظ صحت | عورتوں کے لیے جسم و جان کی حفاظت اور ابتدائی طبی امداد کی معلومات قیمت (ﻋﮧ)

ہدایات تیمارداری | بیماری کی تیمارداری علاج سے زیادہ ضروری اور مشکل ہے اس موضوع پر ضروری معلومات کا مجموعہ قیمت (۵/)

تربیت الاطفال | اس کتاب میں بچوں کی تربیت کے اصول اُن کے مشاغل کا انتخاب ذہنی اور اخلاقی تربیت و اصلاح اور اعلیٰ جذبات کی ترقی اور بری عادتوں سے بچاؤ کی تدابیر بیان کی گئی ہیں۔ قیمت (۱۰/)

بچوں کی پرورش | چھوٹے بچوں کی پرورش، ان کی غذا، لباس اور بیماریوں کے علاج پر ایک بے مثل کتاب جو کئی اردو اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ قیمت (عاں)

تندرستی | اس کتاب میں حفظان صحت کے تمام اصول، امراض متعدی سے حفاظت کی تدابیر اور تیمارداری کے طریقے اور علاج معالج متعدد انگریزی کتابوں سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں قیمت (ﻋﮧ)

مطبخ کنگ جارج | اس میں بتایا گیا ہے کہ غذا اور ترکیب غذا میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے اور ایسے کھانے جو عموماً بیمار واسطے مفید ہوں کیونکر تیار ہوتے ہیں اور حالت بیماری میں ہم اپنے مریضوں کے لئے کس طرح اور کس قسم کی زود ہضم غذا تیار کرسکتے ہیں قیمت (عاں)

علم زراعت | نباتیات پر ایک ابتدائی رسالہ جس میں پودوں کی پرورش اور کاشتکاری کے طریقے بیان کیے گئے ہیں قیمت حصہ اول و دوم (ﻋﮧ)

مسلک اشہوار | اگر آپ تعلیم نسواں کی ترقی کے بارے میں بیگم صاحبہ بھوپال کے خیالات وضاحت سے معلوم کرنا چاہیں تو یہ کتاب پڑھیے جو موصوفہ کی اس موضوع پر تمام تقاریر کا مجموعہ ہے قیمت (ﻋﮧ)

مہذب زندگی | اس میں اسلامی احکام و ہدایات اور مسلمانوں کی تاریخی حکایات کو درج کیا گیا ہے تاکہ ہر ایک ہونہار ابتدا سے کچھ نہ کچھ اپنے مذہب کے اخلاقی احکام سے اور بزرگوں کے اخلاق و عادات حسنہ سے واقفیت حاصل کرے قیمت (ﻋﮧ)

مدارج الفرقان | جس میں قرآن مجید کے متعلق بچوں، عورتوں اور عام معلومات کے لئے چند ضروری مضامین درج ہیں قیمت (۵/)

باغ عجیب | اس کے تین حصے ہیں جن میں (۳۳) مختلف کہانیاں ہیں جو تمام تر اخلاقی نصیحتوں سے معمور ہیں قیمت حصہ اول دوم سوم (۱۰/) (ﻋﮧ) (۱۰/)

فرائض باغبانی | یہ مختصر رسالہ اُن کیلئے بیحد مفید ہے جنہیں باغات کا شوق ہے اور باغات کی پیداوار سے دلچسپی ہے اس میں جنوری سے ڈسمبر تک جو جو کام ہر مہینے میں ہونی چاہئیں ان کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے ضخامت (۱۵) صفحات قیمت (۵/)

الملتہ ———— مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی متصل ڈاک خانہ انگریزی حیدرآباد دکن

یہ **دارالاشاعت** مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم از کم پانچ جز ہوگا۔

بنظر احتیاط ہر پرچہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر لفافہ وصول نہ ہو تو ہر قمری مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ عـه مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے ۱۲ فی پرچہ ۶ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کیلئے ـه نصف کے لئے ـے اور چوتھائی کیلئے ۱۲ ہے اگر زیادہ مدت کیلئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ فیصدی (۲۵) فی صدی تک کمی ہوسکے گی۔

ترسیل زر، مضامین و جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلہ مکتبہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے

باہتمام

محمد نظام الدین مددگار منیجر مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن
شمس الاسلام پریس حیدرآباد

ڈھائی سو روپیہ

کے

پانچ انعام

مجلّہ مکتبہ

کے قلمی معاونین کو سال بھر کے بہترین مضامین کے لئے حسب تفصیل ذیل عطا کئے جائیں گے

۱ ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے، صہ — مختصر ڈراما

پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ — ایک ایکٹ کا اچھی اور ہندوستان کی معاشرت کے مطابق۔

۲ ۔ مولوی عبد المجید صاحب صدیقی صہ — تاریخی مقالہ

ام اے ۔ ال ال بی ۔ پروفیسر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ — ریاست حیدرآباد اور خاصکر گولکنڈہ کی سلطنت کے متعلق ہو۔

۳ ۔ مولوی عبد القادر صاحب صدیقی صہ — تنقیدی مضمون

ام اے پروفیسر کلام کلیہ جامعہ عثمانیہ — اردو کے کسی مصنف یا شاعر پر تحقیقی اور انوکھے رنگ میں۔

۴ ۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی صہ — تحقیقی مضمون

منشی فاضل، دفتر دیوانی فینانس۔ ریاست حیدرآباد — تاریخ اسلام سے متعلق

۵ مدیر مکتبہ صہ — مختصر افسانہ

حیدرآباد کی زندگی کے کسی پہلو پر

نوٹ: ۔ (۱) تاریخی اور تنقیدی مضامین نہایت تحقیقی ہوں اور ڈرامے اور افسانے بالکل اچھے۔ (۲) کوئی مضمون رسالہ کے تیس صفحوں سے زیادہ طویل نہ ہو۔ (۳) جو مضامین انعام کے اہل قرار دئے جائیں گے ان کا اعلان ماہ آبان ستمبر میں ہوگا۔ (۴) انعاموں کی تقسیم ماہ آذر اکتوبر میں عمل میں آئے گی ۔ (۵) مضامین کی مجلس مبصرین مطبوعہ کے علاوہ فی الحال حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہوگی:۔

(۱) ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم ام، اے، پی ایچ ڈی پروفیسر فلسفہ ۔ (۲) ڈاکٹر میر سیادت علی خان ام، اے ال ال بی، ڈی ال ال پروفیسر قانون ۔ (۳) مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری۔ ام، اے بی اس سی آنرز (مینچسٹر) پروفیسر کلیہ انجینیرنگ جامعہ عثمانیہ

خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عا
مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے
بلاقیمت جاری ہوسکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا پینتیس رو
کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کریں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے مجلہ مکتبہ
بلاقیمت حاضر ہوگا یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں
خریدیں گے اُن کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ
کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ اُن کے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسرے
کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اسی طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

رجسٹرڈ نشان سرکار آصفیہ (۶۵۱)

دارالاشاعت انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

رجسٹرڈ نشان سرکار انگلشیہ (......)

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر۔ عبد القادر سروری ایم اے ال ال بی

(۳،۴)

جلد ۵	بابتہ ماہ بہمن و اسفندار ۱۳۴۱ف مطابق ماہ ڈسمبر و جنوری ۱۹۳۲ء	شمارہ ۴

شذرات

"مکتبہ" دو نمبر اکٹھے شایع کرنے کے اصول کا موافق نہیں۔ لیکن بعض وقت طباعتی دشواریوں سے بچنے اور ناظرین کو انتظار کی تکلیف سے بچانے کے لئے مجبوراً دو نمبر ایک جا شایع کرنے پڑتے ہیں چنانچہ اس دفعہ یہی ہوا ہے۔ بہمن اور اسفندار (ڈسمبر اور جنوری) کے رسالے ساتھ ساتھ شایع ہو رہے ہیں۔ اور یہ اس خیال سے کہ اس دفعہ دو رسالے شایع کردیئے جائیں، تو آیندہ فروردی (فبروری) کا رسالہ وقت پر شایع ہوسکیگا۔ امید ہے کہ ناظرین کرام کو بھی یہ بات پسند آئیگی۔

اس دفعہ کے مضامین میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا مضمون "حاتم کی مسلسل نظمیں" انکی زیر ترتیب کتاب دیوان زادہ حاتم کا ایک حصّہ ہے، اسکے طویل ترحصّے ہندوستانی اکاڈمی، صوبہ متحدہ، الہ آباد کے مشہور رسالے "ہندستانی" شایع ہوئے ہیں۔ حاتم کی مسلسل نظموں پر گذشتہ اشاعت میں، انکی مثنوی "قہوہ" کے ساتھ ہم نے ایک مختصر نوٹ شایع کیا تھا اسمیں دفعہ بھی خوش قسمتی سے استاد شعراء شاہ حاتم کی دوسری قابل قدر مثنوی "حقہ" ڈاکٹر قادری ہی کی عنایت سے ہم ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مثنوی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا مضمون بھی شایع ہو رہا ہے مضمون اور مطبوعہ نظموں سے، اردو دنیا شمالی ہند کی قدیم ترین مسلسل اور موضوعی نظموں اور ان کی کیفیت سے ایک حد تک روشناس ہوسکیگی۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس سعی مشکور کو جلد سے جلد مطبوعہ دیکھنے کی خواہش ہے۔

فراقؔ حیدرآبادی کا افسانہ "آوارہ گرد" اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ یہ ان کے ذہن طبعزاد معلوم ہوتا ہے ترجمہ اور تلخیص کا نہیں۔ محمود گاواں کی ہستی قرون وسطیٰ میں نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان بھر کے لئے باعث رحمت تھی، اس کے ذہن کی رسائی، اور اسکی علمی مساعی کی حدیں کہاں تک پہنچی تھیں، اسکی تاریخ شاہد ہے، اس برگزیدہ ہستی کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت کچھ لکھنے کی گنجایش ہے۔ ہم اس دفعہ ذکی صاحب کی نظم، اس بلند پایہ مدبر اور محسن علوم کی یاد رفتہ کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

جناب عزیز احمد صاحب، اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور پر اس دفعہ ایک عمیق ناظرانہ تنقیدی مضمون شایع کر رہے ہیں، انکی نظم "ہنگام شباب" بھی بڑی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے ابو المکارم صدیقی نے مشہور مصلح تعلیم بزرگوں پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے، اس دفعہ فرانس کے ماہر فن تعلیم روسو پر ان کا مضمون شایع ہو رہا ہے

آیندہ موقع پر ہم روسو کے ایک پیرو کا حال شایع کرینگے۔

"پریم کی آگ" جناب وشمبہ ناتھ کا طبعزاد افسانہ ہندی کے مشہور رسالے "چاند" میں شایع ہوا تھا۔ یہ افسانہ موجودہ ہندی افسانوں کے معیار کا ایک نمونہ ہے۔ مصنف نے اس افسانے کے ذریعہ ایک اخلاقی اور سیاسی سبق سکھانے کی کوشش کی ہے۔

موجودہ ماہران فلسفہ قانون بڑے غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ دنیا بھر کے نظام قانون میں سزائے موت جسقدر ہوسکے کم کی جانی چاہیے کیونکہ ہماری پابند انصاف نہیں، پابند قانون عدالتوں کی دسترس بعض مقدمات خصوصاً جرم کی حقیقت تک مشکل سے ہوسکتی ہے۔ اسلیئے سزاے موت کے یہ معنے ہیں کہ سزا کے بعد مجرم بے گناہ ثابت ہو تو اس سے اسکو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس سزا کی تلافی ممکن ہے اسلیئے یہ زیادہ مناسب تصور کیا جارہا ہے کہ ایک گناہگار کے سزا پانے کے بجائے ایک بے گناہ کا بچ جائے۔

رائے صاحب کا افسانہ انہیں انسانیت کے اصول کو مدنظر رکھکر لکھا گیا ہے ڈاکٹر ہیم نے رائے صاحب کے افسانے کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

میر حسن صاحب نے ورڈسورتھ کی حیات اور شاعری کا بغور مطالعہ کیا ہے ورڈسورتھ انگلستان کے فطرت پرست شعرا کا سرتاج سمجھا جاتا ہے میر حسن صاحب اپنے مطالعے کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کر رہے ہیں۔ اور ہمیں اس کا ایک باب اشاعت کیلیئے عنایت کیا ہے۔ اس میں میر صاحب کی تنقیدوں اور ترجموں سے ورڈسورتھ کی فطرت نگاری کے متعلق بہت مفید اور ضروری معلومات قارئین کرام کو حاصل ہونگی۔

ہندوستانی اکاڈمی (صوبہ متحدۂ الہ آباد) کی سالانہ علمی و ادبی کانفرنس اس دفعہ مارچ کے مہینے میں منعقد ہونے والی ہے۔ ملک کے مشہور عالموں اور ادیبوں کے پاس دعوتنامے، شرکت کی خواہش کے ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ کارکنوں کے اعلی مذاق سے توقع ہے کہ پچھلے سالوں کی طرح اکاڈمی کی یہ کانفرنس بھی بہت کامیاب ثابت ہوگی۔ کانفرنس کے پیش نامے (پروگرام) میں علمی اور ادبی مقالات کے علاوہ بزم مشاعرہ اور علمی نمائش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انڈین سائنس کانگرس کا اجلاس، اس سال ماہ جنوری کے اوائل میں بمقام بنگلور منعقد ہوا تھا۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے پروفیسر محمد عبدالرحمن خاں صاحب صدر کلیہ اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی بی اے (عثمانیہ) بی اے (آنرز) کیمبرج پی، ایچ، ڈی (جرمنی) پروفیسر ریاضی اسکے اجلاس میں شریک ہوئے اور مضامین بھی پڑھے صدر صاحب کلیہ کے دو مضمون طبیعات پر خاص طور سے پسند کئے گئے۔ اس شعبہ میں تیسرا قابل ذکر مضمون جناب ذوالفقار حسین صاحب فاروقی کا تھا، جو موصوف نے اپنی ام۔ اس، سی کی تعلیم اور ریسرچ کے دوران میں مرتب کیا تھا۔ یہ ریسرچ پروفیسر محمد عبدالرحمن خاں صاحب کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا مضمون ریاضی پر بہت دقیق تھا۔ اسی لئے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ شعبہ ریاضی کے صدر ریپروفیسر گنیش پرشاد، جو جامعہ کلکتہ میں ہارڈینج پروفیسر اعلیٰ ریاضیات ہیں، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے مضمون سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ چنانچہ دیوان صاحب میسور سر مرزا اسماعیل کے ایٹ ہوم میں، پروفیسر موصوف نے ڈاکٹر صاحب کو دیوان صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے انکی بڑی تعریف کی۔ اور کہا کہ مسلمانوں میں ڈاکٹر صدیقی ایک غیر معمولی دل دماغ کے ریاضی دان ہیں۔ توقع ہے کہ ان سے بڑے کام انجام پائینگے پروفیسر گنیش پرشاد کے ساتھ ہماری اور ملک کی بھی بہترین توقعات ڈاکٹر صدیقی سے وابستہ ہیں خدا کرے کہ یہ ڈاکٹر ضیا الدین کا بدل ثابت ہوں جو آجکل سیاسیات میں مصروف ہیں

جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے پی اچ ڈی

شاہ ظہور الدین حاتم اردو زبان کے ایک بہت بڑے شاعر تھے، اور بڑے بڑے شاعروں کے استاد بھی۔ ان کے حالات زندگی پر میں نے ایک تفصیلی مضمون صوبہ متحدہ کی "ہندستانی اکاڈمی" کے تماہی رسالہ میں اشاعت کے لئے روانہ کیا ہے۔ اُن کی شاعری پر بھی ایک مفصل تنقیدی مقالہ زیر تحریر ہے۔ چونکہ ان کی ایک نظم "قہوہ" مجلہ مکتبہ کے گذشتہ نمبر میں شایع ہوی ہے۔ اور اس دفعہ بھی اُردو جواہر پاروں کے سلسلے میں "مثنوی حقہ" پیش کیجا رہی ہے۔ اس لئے یہاں حاتم کی مسلسل نظموں کے متعلق چند معلومات لکھے جاتے ہیں۔

حاتم کے کلام کے جتنے نسخے اس وقت تک میری نظر سے گزرے اُن کے مطالعہ سے ظاہر ہوا کہ وہ محض غزل گو شاعر نہیں تھے۔ ان کے "دیوان زادہ" میں ان کی کئی مسلسل نظمیں مستقل عنوانوں کے تحت مندرج ہیں مگر اردو تذکروں وغیرہ میں جہاں حاتم کا ذکر کیا گیا ہے ان کی ان نظموں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ صرف ایک دو کتابوں میں "مثنوی حقہ" و "قہوہ" کا ذکر ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاران کی کماحقہٗ اہمیت سے واقف نہیں تھے۔ وہ غزل گوئی کا دور تھا، اور اسی کی اس زمانہ میں قدر کی جاتی تھی۔

(۲)

حاتم کی جو نظمیں اس موقع پر قابل ذکر ہیں اُن کے نام یہ ہیں:-

(۱) حمد و نعت　(۲) حقہ　(۳) قہوہ　(۴) نیرنگیِ زمانہ　(۵) عرضی استعفا　(۶) بنام فاخر مکیں

(۷) بارھویں صدی　(۸) حالِ دل

ان نظموں کے علاوہ حاتم کی بہت سی قطعہ بند غزلیں ایسی ہیں جو کسی خاص موضوع پر لکھی گئی ہے۔ دیوان زادہ کی غزلوں میں جو متعدد شعر موضوع کے لحاظ سے مستقل قطعات سمجھے جا سکتے ہیں ان میں سے بعض اہم قطعوں کی فہرست معہ سنہ

تصنیف یہ ہے :-

۱	کہہ پہنیوں بست (۱۱۵۶ھ)	۲	من کی من کے بیچ (۱۱۶۱ھ)
۳	روز میثاق (۱۱۶۱ھ)	۴	گورستان (۱۱۶۲ھ)
۵	قاصد (۱۱۶۶ھ)	۶	افسانۂ دل (۱۱۶۷ھ)
۷	خوف و رجا (۱۱۶۹ھ)	۸	اختیار بندہ (۱۱۶۹ھ)
۹	حاتم کی نوبت کی ( )	۱۰	ماتم حسن و حسین ( )

(۳)

اس فہرست میں حاتم کی پہلی مسلسل نظم حمد و نعت ہے ۔ یہ دیوان زادہ میں موجود نہیں ۔ غالباً طرز قدیم سمجھ کر حاتم نے اس کا انتخاب نہیں کیا ۔ اردو کے قدیم ترین تذکرہ "گلشن گفتار" کے مصنف نے بطور تبرک اس نظم کو اپنی کتاب کے آغاز میں شامل کیا ہے ۔ یہ تذکرہ خواجہ حمید خان اورنگ آبادی کا مولفہ ہے اس میں تقریباً (۳۰) قدیم شاعروں کا ذکر ہے ۔ مولوی سید محمد حسن ایم اے (عثمانیہ) لکچرار اردو سٹی کالج نے بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر کے شایع کیا ہے ۔ اردو شعرا کا قدیم ترین تذکرہ ہونے کی حیثیت سے اس کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ مگر اس موقع پر ہماری نظروں میں اس لئے بھی زیادہ عزیز ہے کہ اس میں حاتم کی ایک مثنوی کا ٹکڑا مل گیا جو آج نہ "دیوان زادہ" میں موجود ہے اور نہ حاتم کے ان دوسرے قدیم دیوانوں میں جو اس وقت تک میری نظر سے گذرے ہیں ۔

اس مثنوی کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ حاتم نے پہلے پہل ولی کی بعینہٖ تقلید کی جس طرح سے آج دہلی اور لکھنو کے شاعروں کا کلام دوسرے صوبوں اور شہروں کے شعرا کے لئے معیاری سمجھا جاتا ہے اسی طرح حاتم کے ابتدائی زمانہ میں دکن کے شاعروں کا کلام اور ان کا اسلوب معیاری تھا ۔ صرف یہ مثنوی ہی نہیں حاتم کی وہ غزلیں بھی جو دیوان زادہ میں درج ہیں اور جو ولی کی زمین میں لکھی گئی ہیں اس رجحان کا ثبوت دیتی ہیں ۔ غزلیں تو کسی اور موقع پر پیش کی جائیں گی ۔ یہاں صرف ایک مثنوی کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :-

الٰہی داغ سیں دل کو جلا دے	برہ کی آگ مجھ تن میں لگا دے
جلا جیوں پھلجھڑی مجھ ناتواں کو	شرر لبریز کر ہر استخواں کو
فنا کر عشق میں یہ جان بے تاب	کہ جیوں آتش میں گھٹ جاتا ہے سیماب
رہے منظور اک معشوق کی ذات	بطوف کعبہ و سیر خرابات

خدا کے نور کا مت کر سمندر | یہی چودہ رتن کاڑھے ہیں باھر
اگر فہمیدہ حکمت آشنا ہے | اسی نسخے میں چودہ بدیا ہے
نبیؐ کی آل پر سیس وار جانا | اسی بارہ پلے سیں پار جانا

(۴)

حاتم کی دوسری نظم "مثنوی حقہ" محمد شاہ کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ جعفر علی خان صادق نے اُس کو نظم کرنا شروع کیا مگر دو تین شعر سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ حاتم نے اختتام کو پہنچایا "گلشن گفتار" میں حاتم کی یہ مثنوی نقل کی گئی ہے۔ مگر اس میں صرف ۲۷ شعر ہیں۔ لچھمی نرائن شفیق نے اپنے اردو تذکرہ "چمنستان شعرا" میں لکھا ہے کہ اس مثنوی میں جملہ تیس ۳۰ شعر ہیں مگر "دیوان زادہ" کی جو مثنوی ہم یہاں نقل کر رہے ہیں وہ ۸۲ اشعار پر مشتمل ہے۔

"دیوان زادہ" کی اصل مثنوی اور "گلشن گفتار" کی پیش کی ہوئی مثنوی میں ایک تو تعداد اشعار میں بہت فرق ہے اور دوسرے الفاظ کے املا اور لسانی شکلوں میں بھی اختلاف ہے۔ "گلشن گفتار" کی مثنوی میں زیادہ تر قدیم وضع کے الفاظ اور ترکیبیں ہیں۔

یہ امور ظاہر کرتے ہیں کہ حاتم کی مثنوی ابتدا میں اتنی طویل نہیں تھی۔ لیکن "دیوان زادہ" کی ترتیب کے وقت تک ۱۴ سال کے عرصہ میں حاتم نے اس میں خاصہ اضافہ کر دیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ۱۱۶۵ھ سے ۱۱۶۹ھ تک اردو زبان کے الفاظ کی شکلوں اور ترکیبوں وغیرہ میں خاصہ فرق ہو گیا تھا۔ اور اگرچہ حاتم نے دیباچہ "دیوان زادہ" میں ذکر کیا ہے کہ مثنوی حقہ و قہوہ میں انہوں نے قدیم زبان ہی کو برقرار رکھا ہے تاکہ قدیم و جدید کا فرق معلوم ہو سکے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے بہت سے لفظوں اور ترکیبوں میں تبدیلی کر دی۔ جس کے دلچسپ ثبوت "دیوان زادہ" کی مثنوی کے اشعار کا "گلشن گفتار" کی مثنوی کے اشعار کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد دونوں نسخوں کے اختلافات حاشیہ پر درج کر کے پیش کئے گئے ہیں۔ ہم نے اس مثنوی کے ذیل میں نسخوں کے اختلاف کی نسبت جو حاشیے لکھے ہیں وہ لسانی تحقیقات کرنے والوں کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوں گے۔

یہ مثنوی اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ شمالی ہند کی اولین مسلسل نظموں میں سے ہے۔ میر و سودا کی مثنویاں اس کے بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ حاتم دہلی کے پہلے اردو شاعر ہیں جنہوں نے معین موضوعوں پر کئی مفصل اور دلچسپ نظمیں لکھیں۔

حاتم نے اپنے دوست جعفر علی خان کا تخلص صادق لکھا ہے حالانکہ یہ ذکی تھے۔ صادق اس نام کے ایک

اور شاعر کا تخلص تھا۔ میر تقی میر فرماتے ہیں :۔

جعفر علی خان ذکی مرد عمدہ روزگاریست ۔ متوطن دہلی ۔ بادشاہ محمد شاہ بر او فرمایش مثنوی حقہ کردہ بود دو سہ شعر موزوں کرد ۔ دیگر سرانجام از و نیافت اکنوں شیخ محمد حاتم نوشتہ آمدہ اتمام رسانید و آں مثنوی خالی از مزہ نیست .... الخ "

میر جیسے بد دماغ شخص کا اپنے حریف سودا کے استاد شاہ حاتم کی ایک نظم کو با مزہ کہنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ مثنوی کس قدر اہم ہے خصوصاً جب ہم ایک طرف دیکھتے ہیں کہ میر حاتم کو "مردیست جاہل" وغیرہ لکھتے ہیں اور ان کے اشعار پر طعن و اعتراض کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کی "مثنوی حقہ" کو "خالی از مزہ نیست" فرماتے ہیں تو ہمیں اس بوالعجبی پر ہنسی آتی ہے اس کے ساتھ ہی حاتم کی مثنوی کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

(۵)

"مثنوی قہوہ" مجلہ کے گذشتہ نمبر میں شایع ہو چکی ہے ۔ یہ نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ مثنوی حقہ بہت مقبول ہوئی تھی ۔ اور حاتم کو مجبور کیا گیا تھا کہ اسی طرز کی مثنوی "قہوہ" پر بھی کہیں ۔ اس مثنوی کا آخری شعر پر لطف ہے ۔ اور حاتم اور ان کے زمانے کی طرز معاشرت اور خیالات کی بڑی واضح اور لطیف تشریح کرتا ہے ۔ حاتم فرماتے ہیں شعر

جہاں میں زندگی حاتم دو دم ہے اُدھر حقہ اِدھر قہوہ کا دم ہے

حاتم کی اس سلسلہ کی چوتھی نظم "نیرنگی زمانہ" کے عنوان سے لکھی گئی ہے ۔ یہ گویا عہد محمد شاہ کا ایک منظوم خاکہ ہے ۔ حاتم پر ہم نے جو مضمون "ہندوستان اکاڈیمی" کے رسالے کے لئے لکھا ہے ۔ اس میں یہ نظم پوری نقل کر دی گئی ہے ۔ یہاں اس کے چار شعر بطور نمونہ کے پیش کئے جاتے ہیں :۔

کیا بیاں کیجئے نیرنگی اوضاع جہاں — کہ پلک جھپتم زدن ہو گیا عالم ویراں
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں — پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
چشم عبرت سے نظر کیجو الو الابصار — دیکھ لو راست میں کہتا ہوں عیاں را چہ بیاں
حاتم اس عجز مروت کی علی دیوے داد — جس کا اس وقت ہوا ہے تو عبید الاحساں

(۶)

پانچویں نظم "عرضی استغفا" ہے یہ ایک خاص چیز ہے جو ایک طرف تو حاتم کی شرافت طبع اور اعلیٰ کردار کی مظہر ہے اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ نواب عمدۃ الملک امیر خان نے جن کے یاں حاتم بحیثیت "کاول"

ملازم تھے ان کی قدردانی میں کوئی کمی نہیں کی۔ یہ نظم اردو ادب میں بالکل انوکھی چیز ہے نہ صرف تاریخی بلکہ شعری حیثیت سے بھی اس کے ابتدا اور آخر سے ایک ایک شعر یہاں نقل کیا جاتا ہے :۔

تمہارا عمدۃ الملک اس قدر سے خوان نعمت ہے ۔ کہ جس پر رات دن شاہ و گدا مہمان نعمت ہے

یہی ہے عرض خدمت میں تیری حاتم بکاول کی ۔ کہ یہ خدمت اُسے دے جو کوئی خواہان نعمت ہے

اس سلسلے کی چھٹی نظم حاتم کے ایک عزیز دوست نور الدولہ فاخر خان کے نام لکھی گئی ہے ۔ ان سے حاتم کو دلی محبت تھی اس نظم میں حاتم نے جس طرح بے لوث جذبات کا اظہار کیا ہے وہ ہر صاحبدل سے خراج تحسین حاصل کرنے کا مستحق ہے۔ اس نظم کے بھی دو شعر بطور نمونہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں :۔

وہ رکھے ہے رات دن جوں جاں مجھے ۔ جس اوپر دینا ہے جاں آساں مجھے

ہوں تو حاتم، ہر گھڑی پر لطف سے ۔ مول لیتا ہے گا فاخر خان مجھے

(۷)

ان نظموں کے علاوہ دو نظمیں ایسی بھی ہیں جو "دیوان زادہ" میں موجود نہیں ہیں۔ "انجمن ترقی اردو سے" حاتم کا جو قدیم قلمی دیوان مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی عنایت سے مطالعہ کے لئے مجھے دیا اس کے آخر میں دو ترکیب بند موجود ہیں۔ جن میں سے ہر ایک علیحدہ مستقل عنوان پر لکھا گیا ہے۔ یہ عنوان مخطوطہ میں موجود نہیں ہیں، لیکن میں نے نظم کے موضوع کے مدنظر خود قرار دے لئے ہیں۔ پہلی نظم "بارھویں صدی" پر لکھی گئی ہے۔ اس میں بارہ بند ہیں ہر بند میں پانچ مصرعے ابتدا اور آخر سے چند بند یہاں مندرج ہیں :۔

تو کھول چشم دل اور دیکھ قدرت کرتار ۔ کہ جن نے ارض و سما اور کیا ہے لیل و نہار

لگا کے سیس لگارہ صدا تو ہر کہ دوار ۔ کہ دور بارہ صدی کا ہی سخت کج رفتار

جہاں کی باغ میں یکساں ہیں اب خزاں و بہار

شہونکی بیچ عدالت کے کچھ نشانی نیں ۔ امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی نیں

بزرگوں بیچ کہیں بو ئی مہربانی نیں ۔ تواضع کھانیکی دیکھو تو جگ میں پانی نیں

گویا جہان سے جا نار ہا سخاوت و پیار

کرے ہے چرخ اگر تجھ اوپر جفا حاتم ۔ تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم

تیری ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم ۔ تو انقلاب زہستی غم نہ کھا حاتم

کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

اس نظم کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ حاتم کے اسی طبعی رجحان کا نتیجہ ہے جو عہد محمد شاہ کی پریشان حالی اور سفلہ پروری کی وجہ سے اکثر اہل علم اور صاحب فن حضرات میں پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے زمانہ کے مختلف پیشوں کے افراد وغیرہ کا حاتم نے خوب مضحکہ اڑایا ہے۔

دوسری نظم کا موضوع "حال دل" ہے یہ نظم "بارھویں صدی" اور "نیرنگئ زمانہ" نظموں کی طرح حاتم کی دنیا سے بیزاری اور اپنے زمانہ کی سفلہ پروری کی شکایت پر نہیں لکھی گئی بلکہ اس میں عشقیہ مضامین باندھے گئے ہیں۔ اس میں کل دس بند ہیں اور ہر بند میں (۸) مصرعے۔ پہلے (۶) مصرعے ہم قافیہ و ردیف ہیں۔ آخری شعر کا قافیہ اور ردیف جدا ہے یہ نظم تاریخی حیثیت سے حاتم کی دوسری نظموں کے مقابلہ میں کم اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے دو بند درج ذیل ہیں:۔

آج ہم حال دل اپنے کا بیان کرتے ہیں ‍ دی چھپی داغ محبت کے میاں کرتی ہیں
خون دل رو رو کے چشموں سے رواں کرتے ہیں ‍ ان سے کہتے ہیں جو کوئی سیر جہاں کرتے ہیں
مونس درد ہو ہر دل میں مکان کرتے ہیں ‍ مجھ دل پیر کو آ پھر کے جوان کرتے ہیں
شاید ان میں سے کوئی یار سے جا حال کہے
زلف کے پیچ سے بچ کر میرا جنجال کہے

آخری بند یہ ہے:۔

جان کر اپنا جہاں بیچ ہیں دلبر تجھ کو ‍ دوستداروں میں ہر ایک آن ہیں منہ پر تجھ کو
کہہ کہا حرف نصیحت کا مکرر تجھ کو ‍ سنگ دل پر نہ ہوا حیف تاثر تجھ کو
بہت پچتایا تو آخر کو میں لکھ کر تجھ کو ‍ سخن اتمام کیا جان کر ابتر تجھ کو
حاتم اب وصل کی امید پر رہنا ہے عبث
زیادہ احوال غم و درد کا کہنا ہے عبث

ان نظموں کے علاوہ حاتم کی اکثر غزلوں میں جو قطعہ بند اشعار خاص موضوع پر لکھے گئے ہیں ان کا ذکر اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں گزر چکا ہے ان کے متعلق تفصیلی معلومات دینے کا یہ موقع نہیں ہے ان پر حاتم کی غزلوں پر بحث کرتے وقت تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

آوارہ گرد

از

لیاقت علی خان فراق حیدر آبادی

ہم نے بدترین خیالات کے زیر اثر بھیڑوں کی طرح بھوکے اور ساری دنیا سے متنفر کوچ کیا...... کچھ نہ کچھ حاصل کر لینے یا الفاظ دیگر چرانے کی بیکار تگ و دو اور مسلسل بارہ گھنٹوں کی سعی بیجا صل کے بعد ہمیں آخر کار یقین ہو چکا تھا کہ دونوں میں سے کوئی تدبیر بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا...... مگر کہاں...... ! بس آگے.... فیصلہ متفقہ طور پر طے شدہ تھا اس لئے ہم لوگ اُس راہ زندگی پر جس کو اختیار کئے ہوئے عرصہ دراز گذر چکا تھا گامزن ہونے کے لئے کمر بستہ تھے۔ فیصلہ کا اظہار بعید خاموشی سے کیا گیا۔ اس کو کسی نے آواز سے بیان نہیں کیا بلکہ ہماری فاقہ زدہ آنکھوں اور گرسنہ نگاہوں نے ایک دوسرے کے خیالات کی ترجمانی کی۔

ہم تین تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے واقف ہوئے زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا۔ ایک تو تنومند بھورے بالوں والا فوجی شخص تھا جس کو صرف جرمنی زبان ہی میں مہارت حاصل نہ تھی بلکہ جو جیل کی زندگی کے تفصیلی حالات کا بھی خاصہ تجربہ رکھتا تھا۔ ہم جیسے لوگ بعض معقول یا نامعقول وجوہات کی بنا پر اپنی گذشتہ زندگی کے متعلق گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے اس لئے ہم ہر شخص کے بیان کو بظاہر صحیح سمجھنے پر مجبور رہتے تھے گو باطن میں ہر شخص کو اپنی کمزوریوں کا احساس تھا۔

جب ہمارے ایک خشک مزاج، نیلے ہونٹوں والے ساتھی نے ہمیں یقین دلانا چاہا کہ وہ ایک مشہور جامعہ کا طالب علم ہے تو میں نے اور میرے فوجی دوست نے فوراً یقین کر لیا...... چونکہ ہمارے لئے اُس کا چور پولس کا جاسوس یا طالب علم ہونا تینوں برابر تھے۔ جب وہ ہم سے ملا ہماری طرح بھوکا تھا...... پولس کی اُس پر نگرانی تھی...... گاؤں کے کسان اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے...... وہ ہر شخص سے ایک بھوکے اور حملہ کئے ہوئے جانور کی طرح نفرت کرتا تھا۔ اور ہر دنیا دار کے خلاف اس کے دل میں جوش انتقام موجزن تھا..... مختصر یہ کہ اس کی حیثیت دنیا اور اہل دنیا کے نزدیک بالکل وہی تھی جو ہماری۔

"بدقسمتی" انسان کے بدترین عیوب کو ظاہر کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اسی لئے ہمیں اچھی طرح اپنی بدقسمتی کا احساس تھا۔ تیسرا شخص میں تھا۔ چونکہ میں ابتدائے طفولیت ہی سے منکسر المزاج واقع ہوا ہوں اس لئے اپنی خوبیوں کا مطلق تذکرہ نہ کروں گا اور ساتھ ہی ساتھ خود کو غیر تعلق ثابت کرنیکے لئے اپنی برائیوں کا بھی اظہار کرنا نہیں چاہتا۔ بہرحال آپ میرے عادات و اطوار کے متعلق یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے ہمیشہ سے خود کو دوسرے سے بہتر خیال کیا ہے اور آج تک اپنے اس خیال پر قائم ہوں...... !

"سفر" سے ہمارا مطمح نظر کسانوں پر حملہ کر کے روزی کمانا تھا۔ چونکہ یہ لوگ آوارہ گرد فقراء کو بہ مشکل ہی خیرات دیا کرتے ہیں۔ میں فوجی کے قدم بہ قدم چل رہا تھا اور "طالب علم" بھی ہمارے پیچھے پیچھے کوئی لباس پہنا ہوا جو شاید کسی زمانہ میں کوٹ کے مشابہ ہوگا چلا آرہا تھا۔ اس کے منڈھے ہوئے نکیلے اور زاویہ دار سر پر ایک چوڑے حاشیہ کی ٹوپی کا کچھ حصہ رکھا ہوا تھا۔ رنگ برنگ کے پیوند لگے ہوئے بوسیدہ پتلون میں اس کی پتلی ٹانگیں چھپی ہوئی تھیں اور پیروں میں کسی جوتے کے تلے جو راستہ میں کہیں پڑے ہوئے مل گئے تھے ایک ڈوری کے ذریعہ باندھ لئے گئے تھے۔ وہ چپ چاپ گرد اڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں چمک رہی تھیں۔

فوجی نے ایک کثیف قمیص پہن رکھی تھی جو بقول اس کے "اپنی کوشش" سے حاصل کی گئی تھی قمیص کے اوپر ایک دبیز کپڑے کی واسکٹ بھی تھی۔ سر پر ایک فوجی وضع کی عجیب بدرنگ ٹوپی اور ٹانگوں میں ایک غیر معمولی ڈھیلا پتلون تھا اور اور پیر بالکل ننگے تھے۔ میں بھی ننگے پیر تھا۔

ہم چل رہے تھے۔ ہماری چاروں طرف چٹیل میدان پھیلا ہوا تھا جس کے اوپر سرما کے صاف و شفاف نیلگوں آسمان کا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ بھوری گرد آلود سڑک ہمارے پیروں کو جھلسا رہی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب کٹے ہوئے کھیتوں کے نشانات بھی نظر آرہے تھے جن کو فوجی کے رخساروں پر بڑھی ہوئی ڈاڑھی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی کرخت آواز میں کوئی مذہبی گیت گنگنا رہا تھا۔ چونکہ زمانۂ ملازمت میں عبادت کا کام بھی اسی کے تفویض تھا جس کی وجہ سے اکثر مناجاتیں اس کو ازبر ہوگئی تھیں اور وہ ہمیشہ دوران گفتگو میں ان کا بے موقع استعمال بھی کیا کرتا تھا۔ ہمارے سامنے افق پر ایک ہلکے ارغوانی رنگ کی لکیر جو آہستہ آہستہ مدھم سی سرخ روشنی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی نظر آرہی تھی۔

"غالباً کریمین کی پہاڑی ہے!" طالب علم نے یہ دیکھ کر کہا۔

"میرے دوست اُن کا نظر آنا قبل از وقت ہے!" فوجی نے کہنا شروع کیا "وہ تو صرف بادل ہیں...... اور کیسے بادل..... ؟ زعفرانی... حلوے کی طرح...."

حلوے کا نام سُن کر بھوک نے جو ہمارے لئے اس زمانہ کی سب سے زیادہ ناقابل برداشت مصیبت تھی بیتاب کرنا شروع کیا۔

"جہنم میں جائے ......" فوجی کہنے لگا" کوئی خدا کا بندہ تو نظر آتا ..... ایک بھی نہیں ..... سوائے اس کے کہ اپنے پیر ریچھ کی طرح چاٹتے بیٹھے رہیں اور کوئی تدبیر دکھائی نہیں دیتی ....." "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کاش ہمیں کسی آباد قطعۂ زمین کے لئے پیدا کیا گیا ہوتا ..." طالب علم نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا مگر فوجی نے قطع کلام کرتے ہوئے جواب دیا:-

بے شک تم نے کہا تھا ... اور تمھیں یہ کہنے کا حق بھی حاصل ہے ... کیونکہ آخر تعلیم یافتہ ہو .... مگر آباد قطعۂ زمین ہے کہاں ..... ؟ شیطان ہی کو اس کی خبر ہو تو ہو ....."

"طالب علم" کو کچھ جواب بن نہ پڑا تو اپنے دونوں ہونٹ چبا کر خاموش ہو گیا۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ ابر کے رنگین ٹکڑے افق پر رقص کر رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے مٹی کی نمکین بو آ رہی تھی جو ہماری اشتہا کے لئے ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی۔ معدے میں آنتیں خلو کی وجہ سے مچل رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے تمام اعصاب میں تشنج کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے اور عنقریب اُن سے قوت حیات سلب ہو جائے گی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ زبان سوکھ رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے سیاہ ذرّے رقص کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ بعض اوقات یہ چھوٹے چھوٹے اجسام دودھ کے پیالوں اور بھنے ہوئے گوشت کی صورت بھی اختیار کر لیتے تھے ... یہاں تک کہ تخیل بارہا ان گذشتہ نعمتوں کی خوشبو بھی سنگھا دیتا تھا ... جس کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیٹ میں کوئی چھریاں چلا رہا ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنی مہم کا تذکرہ کرتے ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ کسی بھیڑ یا پھلوں سے لدی ہوئی گاڑی کی تلاش میں نظریں دوڑاتے چلتے رہے۔

چاروں طرف موت کی سی خاموشی طاری تھی ..... اس سخت دن کے آغاز کے پہلے ہم نے صرف چار روٹیاں اور کچھ گوشت کے ٹکڑوں سے پیٹ بھر کر سفر کی ابتدا کی تھی ..... چونکہ سفر اور خرچ میں توازن قایم نہیں ہو سکتا ... سونے کو تو سو گئے مگر بھوک کی شدت نے بیدار کر دیا۔ خدا جھوٹ نہ کہلوائے .... طالب علم نے سونے سے منع کیا تھا اور اپنا کام جاری رکھنے کی تاکید بھی کی تھی۔ جس طرح کہ تہذیب یافتہ سماج میں خانگی جائداد کو تباہ کرنے کے طریقے بیان نہیں کئے جاتے اسی طرح میں بھی اب زیادہ نہ کہوں گا۔ میں ہمیشہ انصاف کو پیش نظر رکھتا ہوں اور ظلم میری طبیعت کے خلاف چیز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس متمدن دور میں لوگ دن بدن رحمدل ہوتے جا رہے ہیں اور جب کبھی کوئی شخص اپنے ہمسایہ کی گردن اس کو ہلاک کرنے کے ارادہ سے پکڑتا ہے تو ہر ممکنہ رعایت اور بموقع سلیقہ کو ہاتھ سے نہیں دیتا خود میری گردن کے تجربہ نے مجھ میں اخلاق

کی اس ترقی پر غور کرنیکی صلاحیت پیدا کر دی ہے ۔ اس لئے میں اپنے پُر مسرت خیال کے تحت یہ کہنے کے قابل ہوں کہ دنیا بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ترقی کا اندازہ جیل خانوں، کسبی خانوں اور دارالعوام میں ہر سال کے اضافہ سے کیا جاسکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ !

الغرض ہم اپنا خشک حلق لعاب دہن سے تر کرتے ہوئے بھوک کی طرف سے خیال ہٹانیکی خاطر آپس میں باتیں کرتے ویران اور سنسان میدان میں غروب آفتاب کی سُرخ روشنی کی طرف منہ اٹھائے امید و بیم کی حالت میں چلے جا رہے تھے ۔

ہمارے سامنے آفتاب کا سُرخ آتشین چہرا اپنے الوداعی کرنوں سے افق پر رنگ آمیزی کرتا ہوا نرم و نازک بادلوں کے دامن میں آہستہ آہستہ روپوش ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہمارے عقب میں لیلیٰ شب دونوں طرف اپنے سیاہ آنچل کو پھیلائے فضا کو اپنی آغوش میں لیتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی ۔ !

"بھائیو! ۔ ۔ ۔ ۔ آگ روشن کرنیکے لئے کچھ لکڑیاں جمع کر لو ۔۔۔ !" فوجی ہمسفر نے کہا "ہمیں اس میدان میں رات بسر کرنا ضروری ہے ۔ ۔ ۔ اب تو اوس بھی گرنے لگی ۔ ۔ ۔" ہم تینوں تین طرف روانہ ہو گئے ۔ ہر دفعہ لکڑیاں اٹھانے کے لئے زمین پر جھکنا ضروری تھا طبیعت چاہتی تھی کہ زمین پر لیٹ جائیں اور جو چیز ہاتھ آئے کھالیں ۔ ۔ ۔ ۔ کھاتے ہی رہیں، اور پھر ۔ ۔ ۔ پڑ کر سو رہیں ۔ ۔ ۔ کھانا اور سونا ہی تو "دنیا کی نعمتیں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ! پروانہ تھی اگر دائمی نیند سونا پڑتا ۔ ۔ ۔ معدہ سے حلق تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز گردش کر رہی ہے ۔

"کاش کسی درخت کی جڑ ہی پیٹ بھرنے کے لئے میسر آجاتی ۔ ۔ ۔ ۔ !" فوجی نے کہا : ۔

"وہ دیکھو کچھ جڑیں نظر آ رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ! !"

مگر سیاہ ہل کی ہوئی زمین پر کسی جڑ کا نام و نشان تک نہ تھا ۔ آہستہ آہستہ تاریکی ساری فضا پر چھا گئی ۔ آفتاب کی آخری شعاعیں بھی غائب ہو چکی تھیں جس کے ساتھ ہی نیلگوں سیاہ آسمان پر تارے ٹمٹمانے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دیکھ کر ہمارے اطراف کے سایے بھی قریب تر ہوتے گئے ۔ اتنے میں "طالب علم" کی مدھم سی آواز میدان کے خوفناک سکوت کو چاک کرتی ہوئی سنائی دی ۔۔۔ "بھائیو دیکھ رہے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ بائیں جانب کوئی شخص نظر آ رہا ہے ! "

"شخص" فوجی دوست نے مشتبہ انداز میں کہا "مگر وہ وہاں کیا کر رہا ہے ؟ " "قریب جاکر دریافت تو کرو کہ کیا اُس کے پاس کچھ کھانے کے لئے بھی مل سکتا ہے ؟ "

"طالب علم" نے آگے بڑھنے کی ہمت کی ۔ یہ دیکھ کر فوجی دوست نے فیصلہ کُن لہجہ میں کہا "چلو ۔ ۔ ۔ ہم سب ہی کیوں نہ چلیں ۔ ۔

صرف طالب علم کی تیز نیلگوں آنکھیں ہی سڑک سے کوئی پچاس قدم کے فاصلہ پر اس سیاہ ڈھیر کو دیکھ سکتی تھیں۔ ہم ہل کئے ہوئے کھیت پر تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کی طرف روانہ ہوئے۔ غذا ملنے کی موہوم امید نے بھوک کی شدت کو کسی قدر کم کر دیا تھا۔۔۔ ہم نزدیک پہنچ گئے۔۔۔ مگر اس شخص نے کسی قسم کی حرکت نہ کی۔

"شاید یہ آدمی نہ ہو" فوجی نے مایوسی سے ہمارے خیالات کی ترجمانی کی۔ مگر جلد ہی ہمارا شبہ غلط ثابت ہوا چونکہ فوراً ہی وہ ڈھیر متحرک نظر آنے لگا۔۔۔۔۔ اتنے میں وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔ حقیقت میں کوئی انسان ہی تھا۔۔!

"خبردار۔۔۔ ٹھہر جاؤ۔۔۔۔۔ ورنہ گولی چلا دوں گا" اُس نے کرخت اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ساتھ ہی ساکن ہوا میں ایک مدھم سا ارتعاش پیدا ہوا۔۔۔۔

یہ دیکھ کر ہمارے قدم ایک دم رُک گئے۔ ہم سب کچھ دیر تک اس دوستانہ "خوش آمدید" کے زیر اثر خاموش تھے۔

"خوب۔۔۔ میں تو ہرگز۔۔۔۔ بدمعاش" فوجی غصہ سے بڑبڑانے لگا۔

"ہوں۔۔۔۔ ریوالور بھی ہے!" طالب علم نے کچھ سوچکر کہنا شروع کیا "معلوم ہوتا ہے کچھ نقد بھی موجود ہے!" مگر اس شخص نے نہ تو کوئی حرکت ہی کی اور نہ کچھ کہا۔

"خوب۔۔۔ ہم تمھیں کچھ نقصان نہ پہنچائیں گے۔۔۔۔ کچھ کھانیکے لئے دیدو۔۔۔ ہم فاقہ کر رہے ہیں۔۔۔ تھوڑا ہی دیدو۔۔۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔۔ خدا تمھیں غارت کرے" آخری الفاظ نہایت آہستگی سے کہے گئے۔ مگر وہ شخص پھر بھی خاموش تھا۔

"کیا سنتے نہیں ہو۔۔؟" فوجی نے غصہ سے مایوسانہ لہجہ میں کہا "کچھ روٹی موجود ہو تو دیدو۔۔۔ ہم تمھارے قریب بھی نہ آئیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔ دور ہی سے پھینک دو"

"بہت اچھا" آخرکار اُس نے کہا۔

اگر وہ "میرے عزیز بھائیو" کے خوش کن الفاظ بھی کہتا تو اس قدر خوشی حاصل نہ ہوتی جو اُس کے "بہت اچھا" کہنے سے ہوئی۔

"بھلے آدمی ہم سے ڈرتا کیوں ہے۔!" فوجی نے ملائم لہجہ میں مسکرا کر کہنا شروع کیا۔ "ہم بھی شریف آدمی ہیں۔۔۔۔۔ سفر کر رہے تھے۔۔۔ راستہ میں روپیہ پیسہ سب خرچ ہو گیا۔۔۔ کھانے کے لئے جو کچھ تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔۔۔۔ مسلسل دو دن سے ہمارے منہ میں کھیل تک نہیں گئی"

"ٹھیرو۔۔۔!" اُس نے کوئی سیاہ چیز ہماری طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ جس کو دیکھ کر "طالب علم" فوراً اس

جھپٹ پڑا۔ "ٹھیرو۔۔۔۔۔ میرے پاس اور بھی موجود ہے۔ یعنی۔۔۔۔ میرے ہاں اب کچھ نہیں ہے۔!"

اس اجنبی کا دیا ہوا تحفہ ایک سوکھی ہوئی سیاہ، گرد آلود روٹی نکلی۔ بعد کے واقعات سے ہمیں مطلق صدمہ نہ ہوا موجودہ حالت ہی میں ہم بے انتہا خوش تھے۔ چونکہ سوکھی ہوئی روٹی ہی اس وقت ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی فوجی دوست نے ہمارے حصے تقسیم کئے "سب مساوی نہیں ہیں۔۔۔۔۔ تمہیں اپنے حصہ سے ادھر بھی کچھ دینا پڑے گا۔۔۔۔ جناب طالب علم صاحب"

طالب علم نے خاموشی سے اپنی روٹی کی ایک کسر کی قربانی برداشت کی۔ میں نے روٹی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر چبانے کی کوشش کرنی شروع کی۔ جبڑوں کی قوت جو اس وقت پتھر کو بھی ریزہ ریزہ کرنے سے دریغ نہ کرتی قابو سے باہر تھی۔ روٹی کے سوکھے ٹکڑے خشک حلق سے گذرتے ہوئے معدے میں داخل ہو رہے تھے۔ جس کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہضم ہو کر گوشت اور خون میں تبدیل بھی ہو گئے۔ پیٹ بھرتا ہوا دیکھ کر دل میں عجیب مسرت کی لہر اٹھ رہی تھی مجموعی طور پر ایک بیخودی کی سی کیفیت طاری تھی جس کے زیر اثر فاقہ کی ناقابل برداشت اذیتیں بھی یاد نہ رہیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کا تک خیال نہ رہا جو غالباً خود بھی میری ہی طرح بیخود ہو رہے تھے۔

لیکن جب میں نے روٹی کا آخری ٹکڑا اپنی ہتھیلی میں لیکر منہ میں رکھ لیا پھر بھوک کی شدت نے بیتاب کرنا شروع کر دیا۔

"اُس شیطان کے پاس اور ہوگی۔ اور غالباً گوشت بھی ہوگا۔۔۔۔۔" فوجی نے زمین پر بیٹھنے کے بعد اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً ہوگا۔۔۔۔ کیونکہ روٹی سے گوشت کی بو آ رہی تھی" طالب علم نے آہستہ سے تائید کی۔ "کاش مجھے صرف اس ریوالور کا خوف نہ ہوتا۔۔۔۔۔"

"تو آخر یہ کم بخت ہے کون۔۔۔۔۔ ؟"

"اپنا بھائی اسحاق۔ !"

"کتا۔۔۔" فوجی نے جلدی سے کہا

ہم ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے اپنے غیر متحرک نجات دہندہ کی طرف بے معنی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ رات کی پُرخوف تاریکی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی ہر طرف ایک ہُو کا عالم تھا یہاں تک کہ ہماری سانس کی آواز تک سنائی دیتی تھی کہیں دور پر ایک شب بیدار پرند چیخ رہا تھا۔ تارے۔۔۔۔ آسمان کے صدا بہار پھول ہمارے سروں پہ جگمگا رہے تھے۔

ہم بھوکے تھے۔

میں یہ فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس عجیب شب کے ساتھیوں سے میری حالت نہ بُری تھی اور نہ اچھی میں نے کہا کہ آگے بڑھ کر اس کو بغیر گزند پہنچائے جو کچھ کھانے کے لئے میسر آسکے حاصل کر لیا جائے اگر وہ گولی بھی چلا دیتا .... جس کا بہت ہی کم خوف تھا۔ تو تین میں سے ایک کا زخمی ہونا کوئی قابل لحاظ بات نہ تھی...... اگر اتفاقاً گولی زخمی ہو جاتا تو یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ زخم بھی مہلک ثابت ہو۔

"تو پھر بڑھو....." فوجی دوست نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ القصہ ہم تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے رواں ہوئے۔ "طالب علم" سب کے پیچھے تھا.... !

"مہربان......" فوجی نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ تڑاق کی آواز آئی اور کوئی چیز سنسناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے نکل گئی۔

"خالی گئی...." فوجی نے اپنی جگہ سے اُچھل کر پُرمسرت لہجہ میں کہا "شیطان"... اب ذرا دیکھ تو سہی....."

یہ دیکھ کر "طالب علم" فوراً اس کی جھولی پر جھپٹ پڑا۔ اور اُس "شیطان" نے پیچھے ہٹکر اپنے دونوں ہاتھ بچاؤ کے لئے آگے بڑھا دئے اور کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔

"شیطان.... یہ کیا شور ہے !" فوجی نے کسی قدر پریشان ہو کر ٹھوکر مارنے کے لئے اپنا پیر اٹھا کر کہا۔ "شاید خود ہی زخمی ہو گیا...... !"

"اپنی بلا سے..... کیا واقعی زخمی ہو گیا ؟"

"بھائیو..... یہ دیکھو" طالب علم نے کہنا شروع کیا "روٹی.... گوشت بافراط موجود ہے" یہ سنکر فوجی کہنے لگا۔ "دوستو آگے بڑھو..... اور خوب کھاؤ"

میں نے فوراً اس شخص کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ اس نے اب آہ وزاری بند کر دی تھی۔ اور خاموش پڑا رہا۔ ریوالور میں اب بھی ایک کارتوس باقی تھا۔

دوسری مرتبہ ہم کھا رہے تھے اور خوب سیر ہو کر کھا رہے تھے۔ وہ شخص چُپ چاپ بے حرکت پڑا ہوا تھا۔ ہم نے اُس کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔

"سو بھائیو..... کیا تم لوگوں نے یہ سب کچھ روٹی ہی کی خاطر کیا......" کسی نے بھرائی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا جس کو سن کر ہم سب کے سب اُچھل پڑے۔ "طالب علم" زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کھانسنے کی کوشش کرنے لگا۔

فوجی نے روٹی چباتے ہوئے جواب دیا:۔

"ابے کتے.... خدا تجھے غارت کرے.... کیا تو ہم سے اس لئے ڈرتا تھا کہ ہم تیری کھال ادھیڑ لیں گے.... بھلا یہ ہمارے کس کام آسکتی تھی...."

"الو کا پٹھا.... خطرناک ہتھیار رکھ کر دوسروں کو نشانہ بنانا چاہتا ہے...." طالب علم نے دخل انداز ہوتے ہوئے کہنا شروع کیا "ابلیس.... ذرا ہم کو کھانے سے تو فارغ ہونے دے.... پھر دیکھ تیرا کیا حشر ہوتا ہے...."

کسی کی غمناک آواز نے سکوت شب کو چاک کرتے ہوئے جواب دیا " بھائیو.... مجھے بھلا اس کی کیا خبر تھی.... میں نے ڈر کر گولی چلا دی.... میں سفر کرتا ہوا اپنے وطن کی طرف جا رہا تھا.... او خدا.... راستہ میں بخار نے آگھیرا.... غروب آفتاب کے ساتھ ہی یہ بھی تیز ہو جاتا ہے.... آہ میں بھی عجیب بد نصیب ہوں.... اس بخار ہی سے تنگ آکر میں نے وطن کا راستہ اختیار کیا..... میں نجاری کا پیشہ کرتا ہوں.... اور یہی میرا ذریعۂ معاش ہے.... میری ایک بیوی اور دو چھوٹی لڑکیاں بھی ہیں۔

آہ چار سال سے انہیں دیکھنے کا موقع نہ مل سکا.... بھائیو جو کچھ حاضر ہے خوشی تناول کرو۔" "ہم تیرے کہنے کے بغیر بھی کھا رہے ہیں بے.." "طالب علم" نے طنزیہ لہجہ میں جواب دیا۔

"او خدا.... کاش مجھے پہلے ہی سے تم لوگوں کے رحمدل ہونیکی خبر ہوتی..... کیا تمھارا یہ خیال تو نہیں ہے کہ میں نے عمداً گولی چلا دی.... اس ویرانہ میں میرے لئے اور کیا صورت ہو سکتی تھی...... بھائیو.... کیا در اصل میں موردِ الزام ہوں...." اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو گر رہے تھے۔ اُس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور اُس کا لہجہ یاس انگیز اور انفعال آمیز تھا....

"دیکھو وہ کیسی جا رہا ہے...." فوجی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شاید اُس کے پاس کچھ روپیہ بھی ہے" طالب علم نے اپنے سر کو حرکت دیکر کہا۔

"تم تو اندازہ لگانے میں بھی ماہر ہو....." فوجی نے اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا "چلو اب آگ روشن کر کے دو گھڑی آرام کر لیں گے...."

مگر اس کے متعلق کیا ارادہ ہے....؟" طالب علم نے دریافت کیا۔

"بھاڑ میں جانے دو.... کیا اس کو بھی لقمہ بنانے کا خیال ہے؟"

"وہ مستحق تو اسی کا ہے...."

ہم اپنی جمع کردہ لکڑیاں اٹھا لائے اور آگ روشن کرنے کے بعد اُس کے گرد بیٹھ گئے۔ لکڑیاں اس سنسان اور

تاریک رات میں اُس چھوٹے سے قطعۂ زمین کو روشن کرتی ہوئی آہستہ آہستہ جل رہی تھیں نیند کی وجہ سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں مگر مارے خوف و وحشت کے سونا مشکل تھا۔

"بھائیو..... نجّار جو ہم سے کوئی تیس قدم کے فاصلہ پر پڑا ہوا تھا آہستہ سے کہنے لگا" کیا میں آپ لوگوں کے قریب آسکتا ہوں..... آگ کے قریب..... میں مر رہا ہوں..... میری تمام ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے..... او خدا..... کیا میں گھر تک بھی نہ پہنچ سکوں گا....."

"تو پھر آتا کیوں نہیں....." طالب علم نے ڈانٹ کر کہا۔

آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور آگ کے قریب آپہنچا۔ یہ ایک غیر معمولی لاغر اور طویل القامت شخص تھا اس کا لباس بوسیدہ اور بیحد کثیف تھا۔ اس کی خوف زدہ آنکھوں سے مایوس اور غم کے آثار ٹپک رہے تھے اور اس کے زرد چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔

اُس کو دیکھ کر ہمارے دلوں میں خود بخود ایک قسم کے نفرت آمیز رحم کا احساس پیدا ہوا۔ اُس نے آہستہ سے اپنے پُر رعشہ سوکھے ہوئے ہاتھ آگ کی طرف پھیلا دیئے۔ اور اپنی پتلی پتلی انگلیوں کو اِدھر اُدھر حرکت دینے لگا۔

"مگر..... تم نے اس حالت میں پیدل سفر کس لئے اختیار کیا....." فوجی نے دریافت کیا

"مجھے سفر کا خیال ترک کرنے کے لئے سختی سے کہا گیا تھا..... مگر..... مگر..... آہ بھائیو..... میں اب آگے نہیں جا سکتا..... میں مر رہا ہوں..... میں اس ویرانہ میں مر جاؤں گا..... جنگلی جانور میری لاش کو کھا لیں گے..... کوئی مجھے پہچان بھی نہ سکے گا..... میری بیوی..... میری چھوٹی لڑکیاں..... میرا انتظار کر رہی ہوں گی..... میں نے انہیں اطلاع دی تھی..... آہ میری ہڈیاں تک اس مقام کی طوفانی بارش سے صاف ہو جائیں گی..... او خدا..... او خدا" یہاں تک کہنے کے بعد اُس شخص نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔

"زبان بند کر..... بدمعاش....." فوجی نے اس کی آہ و زاری سے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ کیا اودھم مچاتا ہے..... مرنا ہے تو چپ کیوں نہیں مر جاتا..... اس قدر شور و غوغا کیوں کر رہا ہے..... اطمینان رکھ تیری موت پر یہاں کوئی افسوس کرنے والا نہیں ہے۔"

"کمبخت کے سر پر ایک ٹھوکر کیوں نہیں رسید کرتے....." "طالب علم" نے آہستہ سے تحریک کی۔ اب ہمیں سو جانا چاہیئے" میں نے موقع دیکھ کر کہا "اگر تم آگ کے قریب بیٹھنا چاہتے ہو تو شور مت کرو" "سن رہا ہے.....؟" فوجی نے غصہ سے کہا "کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم تیرے ممنون احسان ہیں اس لئے کہ تو نے ہمیں ایک روٹی کا ٹکڑا دیا اور گولی بھی چلا دی۔

جہنم میں جائے ..... بیوقوف "

یہ کہنے کے بعد فوجی آہستہ سے زمین پر دراز ہوگیا۔ طالب علم تو پہلے ہی سو چکا تھا اس لئے میں بھی لیٹ گیا۔ خوف زدہ نجار آگے بڑھکر آگ کی طرف بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں چونکہ اُس کی بائیں جانب ہی لیٹا ہوا تھا اس لئے اُس کے دانتوں کے بجنے کی آواز صاف طور پر سن سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد طالب علم کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ فوجی اپنے دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے لیکر آسمان کی طرف دیکھتا ہوا لیٹا تھا۔

"کیا رات ہے .... اور کیسے تارے ہیں" کچھ دیر کے بعد اُس نے میری طرف کروٹ بدلکر کہنا شروع کیا۔ "کیا آسمان ہے .... بالکل ایک نیلی چادر کی طرح .... دوست میں اس آوارہ گردی کی زندگی کو پسند کرتا ہوں .... مانا کہ فاقہ اور سردی کی زندگی ہے اور .... راحت و آرام کا فقدان .... مگر آزادی .... ؟ کسی کے دست نگر نہیں .... خود ہی حاکم اور خود ہی محکوم .... اگر تم اپنا سر بھی پھوڑ لینا چاہو تو کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں .... کس قدر لطف ہے .... گو اس فاقہ نے مجھے سرکش بنا دیا ہے مگر میں اس وقت آسمان پر دیکھ رہا ہوں .... ستارے مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اے انسان دنیا میں جا .... کام کر .... مایوس نہ ہو .... آہ دل کو کس قدر طمانیت حاصل ہوتی ہے .... اور تو او نجار .... مجھ سے ناراض نہ ہو۔ افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہم نے تیری روٹی کھالی تو کیا ہوا .... تیرے پاس روٹی تھی اور ہم بھوکے تھے .... تیرے گوبی چلانیکی وجہ سے مجھے بھی غصہ آگیا .... روٹی کے متعلق .... یہ کہ تو کل آبادی کے قریب پہنچ جائے گا .... وہاں خرید سکتا ہے .... چونکہ تیرے پاس روپیہ بھی موجود ہے .... جس کا مجھے یقین ہے ! تو کس قدر عرصہ سے بخار میں مبتلا ہے ؟ "

میں بہت دیر تک فوجی کی کرخت اور سپاہی کی بھرائی ہوئی آوازیں سنتا رہا۔ رات کی پرخوف تاریکی بڑھتی جا رہی تھی شب کی ٹھنڈی ہوا کے معطر جھونکوں نے ایک مدہوشی کی حالت طاری کردی۔ آگ کی مدھم روشنی اور حیات بخش حرارت کے زیر اثر آنکھیں بند ہونے لگیں اور آہستہ آہستہ ایک پُرکیف بیخودی چھا گئی ....

....

"اٹھو .... فوراً اٹھو .... دیر نہ کرو اب ہمیں دیر نہ کرنی چاہیئے .... جلد چلو" میں ایک دم چونک کر کھڑا ہوگیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے دیکھا کہ فوجی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ "بس دیر نہ کرو .... جلد جلد قدم اٹھاؤ" اُس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے پریشان ہوکر اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی .... آفتاب آسمان پر بلند ہو چکا تھا اور

اُس کی گلابی شعاعیں نجار کے نیلگوں چہرے پر پڑ رہی تھیں اس کا منہ کھلا ہوا تھا اس کی غیر متحرک آنکھیں باہر کی طرف نکلی ہوئی تھیں لباس ہر جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس کا جسم عجیب طریقے پر اینٹھا ہوا تھا۔

"بس۔ بہت دیکھ چکے..... اب چلو" فوجی نے میری آستین پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ مر گیا.....؟" میں نے خوف اور صبح کی ٹھنڈی ہوا کے زیر اثر کانپتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی.....بیشک.....اگر تمہارا گلا بھی اسی طرح گھونٹ دیا جاتا تو تم بھی مر جاتے....." فوجی نے واقعہ کو کسی قدر واضح کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا اُس طالب علم نے.....؟"

سوائے اُس کے اور کون ہو سکتا.....ہیں یا نہ..... یہ تو اُسی تعلیم یافتہ گدھے ہی کی حرکت ہے.....خوب اُلو بنا.....اور ہمیں بھی مصیبت میں مبتلا کر کے فرار ہو گیا.....اگر مجھ کو پہلے ہی اس کی خبر ہوتی تو بدمعاش کو یہ حرکت کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیتا.....صرف ایک گھونسہ کنپٹی پر رسید کر کے واصل جہنم کر دیتا.....اب.....اس سے پہلے کہ ہمیں یہاں کوئی دیکھے دفع ہو جانا چاہیئے.....سمجھ میں آیا.....کوئی نہ کوئی اس نجار کو یہاں مرا ہوا دیکھ لیگا.....ہماری موجودگی ہی گرفتاری کے لئے کافی ہے.....تم کون ہو.....؟ کہاں سے آرہے ہو.....بس سوالات کے جوابات دیتے دیتے ہی ناک میں دم آجائے گا..... یہ پولیس والے تو تم جیسے لوگوں کی تلاش ہی میں رہتے ہیں..... مانا کہ ہم بےقصور ہیں.....مگر یہ ریوالور.....!عجیب ہے......"

"تو کہیں پھینکدو....."

"پھینکدوں.....؟ کس لئے..... یہ تو ایک قیمتی چیز ہے.....ہم اُن کو اپنی گرفتاری کا موقع ہی کیوں دیں..... میں بھلا اس کو کس طرح پھینک سکتا ہوں.....آخر اس کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ہوگی.....علاوہ ازیں اس میں ایک کارتوس بھی باقی ہے.....خدا جانے اس شیطان نے اس کی مدد سے کس قدر رقم جمع کی ہے.....!"

"جس قدر اُس کی لڑکیوں کے لئے کافی ہو سکے....."

"لڑکیاں.....کیسی لڑکیاں.....خوب.....اُس کی.....وہ جوان بھی ہو جائیں گی اور شادی بھی کر لیں گی۔ .....مگر ہمیں اس کی کیا فکر ہے.....چلو بھئی.....جلدی کرو۔ مگر یہ تو کہو.....چلیں کہاں.....؟"

میں کیا بتاؤں.....کسی طرف چلو.....ٹھیک.....دائیں جانب قدم اٹھاؤ.....شاید اِدھر ہی ساحل سمندر نظر آجائے....."

سامنے گنجان جنگل پھیلا ہوا تھا.... پیچھے سر بہ فلک پہاڑ.... اور سر پر آتش بار آفتاب جگمگا رہا تھا۔

"اگر یہ زندہ ہو جائے.... کیا تمھیں خوف نہیں معلوم ہوتا.... شاید ہم گرفتار کر لئے جائیں.... اس طالب علم کے بچے نے تو خوب چکمہ دیا.... دوست بنکر ہمیں ہی دھوکہ دینا چاہا.... آج کل لوگ دن بدن خود غرض ہوتے جا رہے ہیں اگر زمانہ کی یہی رفتار رہی تو خدا جانے آئندہ کیا ہو....؟" فوجی یہ کہنے کے بعد ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔

جنگل میں چاروں طرف وہی سکوت طاری تھا اور وہی ویرانی برس رہی تھی.... صبح کی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی صاف و شفاف نیلگوں آسمان ایک گنبد کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"بھائی مجھے تو بھوک معلوم ہو رہی ہے...." میرے ہمسفر نے اپنی پوشیدہ جیب سے ایک ادنیٰ درجہ کے تمبا کو کا ٹوٹا ہوا سگریٹ نکالکر جلانے کے بعد کہا۔ جس کو سنکر میں نے جواب دیا: "مگر سوال یہ ہے کہ کیا کھائیں اور کہاں کھائیں....؟"

"سوال تو یہی ہے....!!"

. . . .

اس قصے کے بیان کرنے والے شخص نے جو دوا خانہ میں میرے پلنگ کے قریب لیٹا ہوا تھا اس طرح اپنا سلسلہ کلام جاری کیا...."یہ ہے سارا واقعہ.... اس کے بعد ہی فوجی سے میرے دوستانہ تعلقات اور بڑھ گئے سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک رحمدل، تجربہ کار اور اپنی نوعیت کا ایک ہی آوارہ گرد تھا.... میری نظروں میں اب بھی اس کی وقعت ہے.... ہم دونوں بہت دور تک ساتھ رہے مگر اس کے بعد ہی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے.... اور غالباً ہمیشہ کے لئے...."

"کیا وہ نجار بھی تمھیں کبھی یاد آتا ہے...." میں نے آہستہ سے دریافت کیا۔

"ہاں.... اسی قدر کہ گویا کبھی اُس کو دیکھا تھا یا کبھی اُس کے متعلق سنا تھا....!"

"اسی قدر....!"

وہ ہنسنے لگا۔

"تم مجھ سے اس کو یاد رکھنے کی امید کرتے ہو.... جو کچھ ہوا اس کے لئے میں ہی کیوں مورد الزام سمجھا جاؤں.... کسی شخص کی بربادی کے ذمہ دار نہ تم ہو سکتے ہو نہ میں.... بلکہ ہر شخص مساوی حیثیت رکھتا ہے.... سچ پوچھو تو کوئی بھی مورد الزام نہیں.... چونکہ اس دنیا میں ہم سب کے سب.... درندے ہیں۔"

(ماخوذ)

خواجہ عماد الدین محمود گاواں وزیر سلطنت بہمنیہ

سنہ ۱۴۰۸ء تا سنہ ۱۴۸۱ء

از
محمد عبد السلام ذکی (عثمانیہ)

ہائے تاریخ دکن کا وہ درخشاں پہلو ہائے وہ جاہ و حشم کی وہ ترقی وہ نمو
دولت بہمنیہ کی وہ حکومت ہر سو جس کی توسیع کی خاطر بہا مسلم کا لہو

مرکز اس وقت حکومت کا یہی بیدر تھا
بدر جس وقت حکومت کا دکن پر چمکا

کیسا مضبوط وہ تنظیم کا شیرازہ تھا طرز تہذیب و تمدن تھا بہت حیرت زا
پھیلنے پائی تھی دنیا میں نہ لندن کی ہوا تھا ابھی بطن عدم ہی میں نہاں امریکہ

علم و حکمت میں تجارت میں ترقی تھی کمال
باعث فخر زمانہ تھی ہر اک جس کی مثال

شوق تعمیر نے بنوائے مکانات و قصور دست بستہ تھا حشم باب حکومت کے حضور
تھی خوشی کھیلتی گھر گھر تھا مسرت کا وفور اہل اسلام کی شوکت سے دکن تھا م

متحد تھے سبھی اور صاف تھے باطن سب کے
شامل حال تھے ہر لحظہ عواطف رب کے

اے تصور کے مصور یہ جما دے نقشہ رنگ تصویر کہن میں ہمیں بھر بھر کے د
ان کے اسباب تنزل کا دکھا دے خاکہ یہ ندا آئی تخیل میں ہے فوٹو اس کا

لو نظر تم کو وہ تصویر کہن آتی ہے

دیکھ لو سامنے آنکھوں کے تمھارے ہے عیاں یعنی محمود چلا جاتا ہے باشوکت و شان
صاحب سیف و قلم ہے یہی شیر گاواں یہی نصرت کا علم ہے یہی سطوت کا نشان

بزم میں سنت فاروق کا دمساز ہے یہ
رزم میں شبیر زیاں خالد جانباز ہے یہ

اس سے قائم نہیں صرف ایک حکومت کی بنا عدل اور علم و ہنر کی بھی اسی سے تھی بقا
صاحب فضل و کرم معدن افضال و عطا حامی دین متین صاحب زہد و تقویٰ

یہ بشر ہے کوئی یا فوق بشر انسان ہے
جو کمالات کا سرچشمہ ہے اس کی جان ہے

سامنے کون ہیں جو لوگ نظر آتے ہیں شہ محمود کو خط دے کے وہ بہکاتے ہیں
لیجئے شاہ بھی اشرار میں مل جاتے ہیں حکم وہ دیتے ہیں جس کے لئے پچھتاتے ہیں

یعنی محمود جو تھا حاکم فرمانبردار
اس کا حلقوم ہو اور خنجر بیداد شعار

بے گناہ قتل کی دنیا میں جو تشہیر ہوئی۔ اور تخریب یہ تخریب کی تعبیر ہوئی
جس کی ممکن نہ تلافی ہو وہ تقصیر ہوئی سلطنت مٹ گئی قدرت سے یہ تعزیر ہوئی

گویا اک برق غضب کوند کے ایوان پہ گری
اینٹ سے اینٹ بجی شان شہی کچھ نہ رہی

شک نہیں اس میں ہے عبرت کا سبق اس سے عیاں بو کے جو کاٹے گندم! یہ نہیں ممکن یاں
اب وہ محمود کے احسان گران مایہ کہاں ایسے پاکیزہ بشر پہ ہو اسازش کا گماں

اپنے محسن کے جو احسان بھلا دیتے ہیں
خاک میں جو ہر نیکی کو ملا دیتے ہیں۔

فیض محمود کے جاری ہیں پئے خاص و عوام جن کو دھراتی ہے تاریخ زمانہ میں مدام
قرطبہ بھتا یہ دکن کا کبھی مسعود نام دائمی نام ہے روشن وہ ملی شہرت عام
باغ عالم میں ہیں جب تک گل و سرو و شمشاد ذکر محمود بھلانے سے سوا ہوگا یاد

اقبال کی شاعری کا

پہلا دور

از
جناب عزیز احمد صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ

اقبال کی شاعری کی ابتدا عام اردو شاعروں کی طرح غزلوں سے ہوی۔ سیالکوٹ کے مشاعرے کے لئے اقبال جو غزلیں لکھے تھے وہ بانگ درا میں تو نہیں ہیں لیکن کلیات اقبال میں ان میں سے دو ایک موجود ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ ملک کے ہزاروں نوجوانوں کی طرح اقبال بھی بذریعہ خط و کتابت داغ مرحوم سے اصلاح لینے لگے۔

کوہ ہمالیہ جو سنہ ۱۹۰۰ء میں لکھی گئی۔ اقبال کی جدید رنگ کی نظموں میں سب سے پہلی ہے۔ یہ نظم ان کی طالب علمی کے زمانہ میں لکھی گئی۔ اور جب سنہ ۱۹۰۱ء میں اس کو اقبال کے دوست اور ساتھی شیخ عبدالقادر نے مخزن میں شایع کیا تو اس وقت خود شاعر کی نظر میں اس میں خامیاں موجود تھیں اور نظم نظرثانی کی محتاج تھی۔ بانگ درا کی ترتیب کے وقت اس میں بہت کافی تبدیلیاں کی گئیں۔ اصل نظم میں بارہ بند ہیں بانگ درا میں اقبال نے کانٹ چھانٹ کر صرف آٹھ بند رکھے ہیں اور یہ نظم اس شعر پر ختم کر دی ہے۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو　　　دوڑ پیچھے کی طرف اور گردش ایام تو

اس شعر پر اس نظم کا خاتمہ کسی قدر تشنگی لئے ہوئے ہے۔ اصلی نظم میں اس بند کے آگے ایک اور بند ہے جس پر اس نظم کا خاتمہ زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

آنکھ اے دل کھول اور نظارۂ قدرت کو دیکھ　　　اس فضا کو اس گل و گلزار کی رنگت کو دیکھ
اپنی پستی دیکھ اور اس کوہ کی رفعت کو دیکھ　　　اس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ

شاہد مطلب ملے جس سے وہ ساماں ہے یہی
دردِ دل جاتا رہے جس سے وہ درماں ہے یہی

"کوہِ ہمالہ" کئی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ اپنے قسم کی پہلی نظم ہے۔ دوسرے یہ وہ نظم ہے

اقبال کی مقبولیت کی ابتدا ہوئی۔ مخزن میں یہ پہلی جدید رنگ کی نظم تھی جس نے نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور اس کے بعد اس قسم کی بکثرت نظمیں لکھی جانے لگیں۔ اس نظم میں زبان کی کچھ غلطیاں بھی ہیں۔ لیکن وہ ایک تو اس وجہ سے قابل لحاظ نہیں کہ یہ نظم اقبال کی ابتدائی نظم ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ اقبال پنجابی تھے، پنجاب ہی میں انہوں نے نشوونما پائی اور اگر وہ زبان کی سختی سے پابندی نہ کر سکے تو ان کا قصور نہ تھا۔

اس کے بعد اقبال کی دوسری نظم "گل رنگین" ہے جو اُس زمانے میں لکھی گئی ہے جب وہ اورینٹل کالج لاہور میں لکچرار مقرر ہوئے۔ اس زمانے سے اقبال کی شاعری میں ان کا حقیقی رنگ ملنا شروع ہوتا ہے یعنی ذوق جستجو۔ وہ فلسفے کے طالب علم رہ چکے تھے اور فلسفے ہی سے ان کو انتہا سے زیادہ دلچسپی رہی لیکن "عقلیت" کے ذریعہ ان کا ذوق جستجو کبھی سیراب نہ ہو سکا۔ اسی وجہ سے انہوں نے "عقلیت" کے بجائے "جذبات اور احساسات" کو اپنا ذریعہ جستجو بنایا۔ اور ان کے کلام کے ساتھ اُن کا یہ مسلک مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ گل رنگین میں ایک دو شعر ایسے ہیں جن سے اقبال کے قلب پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

اور

مطمئن تو ہے پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں۔

اسی زمانہ کی نظموں میں "عہد طفلی" ہے۔ یہ پہلی نظم ہے جو کسی انگریز شاعر سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں اقبال۔ ورڈسوتھ کے نظریۂ "رشتۂ فطرت" سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اور اس قول کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں

"CHILD IS FATHER OF THE MAN"

لیکن وہ کبھی کسی خیال کی پیروی نہیں کرتے کسی خیال کا ایک حصہ اگر ان کو اپنے خیال کے مطابق معلوم ہوتا ہے تو اُس کو چُن لیتے ہیں۔ اور اس کو یا اپنے نظریۂ کے موافق ڈھال لیتے ہیں۔ یا اُس پر تخیل کی ایک نئی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ چنانچہ "عہد طفلی" میں بھی وہ "ذوق جستجو" پر زور دیتے ہیں۔

"مرزا غالب" غالباً غالب کا مکمل اور جامع مطالعہ کر چکنے کے بعد اس احساس کے ساتھ لکھی گئی جس سے اثر پذیر ہو کر ایک بڑا شاعر دوسرے بڑے شاعر کے سامنے سر تعظیم خم کرتا ہے۔ یہ نظم اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں اقبال نے غالب کی شاعری کی خاص خاص خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور غالب کے شاعرانہ مذہب کو واضح کیا ہے۔ مثلاً

تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے بن کے سوزِ زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے

ایک اور چیز جو اقبال اور صرف اقبال کا حصہ تھی وہ غالب کا موازنہ ہے۔ اقبال نے غالب کو گوئٹے کے مقابل میں پیش کیا ہے۔ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس زمانے تک اردو اور مغربی مصنفین کے تقابلی موازنے کی رسم شروع نہ ہوئی تھی۔ اقبال نے جن کا مطالعہ اب بھی اپنی وسعت کے اعتبار سے شاید ہی ہندوستان بھر میں اپنا جواب رکھتا ہو، بہت غور و خوض کے بعد غالب کے مقابلے کے لئے گوئٹے کا نام سوچا۔ اگر لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ غالب ٹھہرے ایک غزل گو شاعر ان کا گوئٹے سے کیا مقابلہ؟ پہلی بات جو یاد رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ گوئٹے غزل گو شاعر بھی تھا چنانچہ اس نے ایک غزلوں کا دیوان بھی تصنیف کیا تھا، جس کے جواب میں اقبال نے "پیامِ مشرق" لکھی۔ لیکن اقبال نے غالب کو گوئٹے سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ گوئٹے نے غزلیں بھی لکھیں۔ اُن کا مقصد اس سے زیادہ اعلیٰ تھا۔ غالب اور گوئٹے کے نظریۂ حیات ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ دونوں کے ادبی اسالیب اظہار جداگانہ سہی، مگر دونوں کی روحِ حیات ایک دوسرے سے بہت قریب تھی۔

پھر اسی زمانے کی نظموں میں ابرِ کہسار ہے۔ جو بالکل نیچرل نظم ہے۔ کوئی خاص بات اس کے متعلق قابلِ تحریر نہیں اس کے بعد اقبال کی شاعری میں ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی ادب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انگریزی کے پروفیسر ہونے کی وجہ سے انگریزی ادب سے ان کا تعلق براہ راست ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی شاعری زیادہ تر اُن کے زیرِ مطالعہ رہنے لگی اور وہ خاص شعرا جن کا گہرا مطالعہ کر کے وہ متاثر ہوئے یہ ہیں۔

ورڈسورتھ۔ ایمرسن۔ ولیم کوپر۔ ٹینی سن گرے۔ طامس مُور۔ لانگ فیلو۔ وغیرہ۔ ان میں سے کسی کا زیادہ گہرا اور کسی کا بہت معمولی اثر اُن کی شاعری پر بھی پڑا۔ کچھ نظمیں انہوں نے بچوں کے لئے ترجمہ کیں۔ یہاں تک تو اثر بہت معمولی تھا۔ گرے کی ELEGY پڑھنے کے بعد، یا پڑھتے وقت انہوں نے اپنی نظم "خفتگانِ خاک سے استفسار" لکھی چنانچہ اس نظم کا پہلا حصہ گرے سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنی مستقل روش پر آجاتے ہیں۔ وہی جستجو، وہی تلاش زندگی کی تلاش، اور ہستی کی تلاش۔۔

"شمع اور پروانہ" مشرقی فضا کی کامل مشرقی نظم ہے لیکن یہاں بھی خیالات ایک جدت لیے ہوئے ہیں یہ نظم اس لحاظ سے ایک خاص حیثیت کی مستحق ہے کہ اس میں اقبال نے اس جستجو کا ماحصل اور مدعا محبت قرار دیا ہے۔ وہ محبت جو عشق حقیقی کہلاتی ہے۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ نہ یونانی فلسفہ اور نہ جدید مغربی فلسفہ اقبال کے دماغ کو مطمئن کر سکا۔ بلکہ انہوں نے تصوف میں آکر پناہ لی۔ اور تصوف کو کسی قدر جدید اور وسیع رنگ دے دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کا جذباتی پہلو ہمیشہ اُن کے عقلیاتی پہلو پر غالب رہا۔ چنانچہ اس کے بعد کی نظم "عقل و دل" میں انہوں نے جذبات کے مقابلے میں عقل کی شکست کا اظہار کیا ہے۔ عقل کو وہ صرف دنیا اور دنیاوی علوم کے لیے بہترین چیز سمجھتے ہیں لیکن جب مابعد الطبیعات کا سوال آتا ہے تو اُن کے نزدیک عقل بیکار محض رہ جاتی ہے۔

"صدائے درد" ایک لحاظ سے اقبال کے کلام میں اپنے قسم کی پہلی نظم ہے۔ یعنی یہ پہلی نظم ہے جس میں اقبال نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا ہے۔ اور شاعر کو اس کی تلقین کی ہے کہ وہ اس اتحاد کی پیامبری کرے۔

"آفتاب" تھیوفیل گاتیر کی نظم سے ماخوذ ہے۔ اس زمانے میں اقبال انگریزی شعراء کے دیوان مطالعہ کر رہے تھے روزیٹی (ROSSETHI) نے گاتیر کی بہت سی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ غالباً روزیٹی کا دیوان پڑھتے وقت یہ ترجمہ اقبال کی نظر سے گزرا اور پسند آیا۔ اور انہوں نے اُسی انگریزی ترجمے سے اس کو اردو میں منتقل کر لیا۔ اسی سلسلہ میں ایک خاص بات قابل لحاظ ہے یعنی اقبال کے ترجمے، اصل سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ کبھی وہ اس کی پابندی نہیں کرتے کہ اصل نظم کی خوبیاں اپنی نظم میں ظاہر کریں۔ بلکہ صرف تخیل کو لیکر وہ اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبانی خوبیاں شمہ برابر بھی ترجمے میں عکس فگن ہونے نہیں پاتیں۔

"شمع" پہلی نظم ہے جس میں اقبال اپنی پوری فلسفیانہ شوکت سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس نظم میں سب سے پہلے حقیقی اقبال کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اقبال جو اردو شاعروں میں محض ایسی ہی چند نظموں کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ ممتاز رہے گا۔ اس نظم سے اقبال کا فلسفہ اور اقبال کا ذہنی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ کہ اس نظم کی زبان میں ایک پُر عظمت روانی ہے جو مطلب کے شایانِ شان ہے۔

پہلے تو وہ ہستی انسان اور شمع کا مقابلہ کرتے ہیں۔

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلی سے دور ہے — بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں — بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں
میں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی — آگاہِ اضطرابِ دلِ بیقرار بھی

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا احساس دیدیا مجھے اپنے گداز کا

اُس کے بعد پھر وہ اس "آگہی" اور اس احساس کی تفصیل کرتے ہیں جو انسان کو، اور تمام ذی روح مخلوق سے ممتاز کرتا ہے۔

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق آوازِ کُن ہوئی تپش آموزجان عشق
یہ حکم تھا کہ گلشن "کن" کی بہار دیکھ ایک آنکھ لیکے خواب پریشاں ہزار دیکھ
یاد وطن فسردگی بے سبب بنی شوق نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں اے شمع میں اسیر فریب نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقۂ دام ستم بھی آپ بام حرم بھی طائر بام حرم بھی آپ
میں حُسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں؟ کھلتا نہیں ہے ناز ہوں میں یا نیاز ہوں؟

ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار ورسن کہیں

یہاں سے ان کی جستجو اور جستجو کا سوز انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ شاہد مقصود کو دیکھ تو نہیں سکتے مگر تصور کر لیتے ہیں سکون قلب ۔ یا زیادہ بہتر الفاظ میں سکونِ جستجو جس کو وہ برسوں افلاطون سے لیکر برگساں تک میں تلاش کرتے رہے۔ بالآخر ان کو مل جاتا ہے۔ کہاں؟ — مولانا روم کے یہاں۔ اور یہ نظم اس کامیابی کی نشانی ہے۔

اس کے بعد "ایک آرزو" ہے جو بہت ممکن ہے پوپ یا کسی اور شاعر کے اثر سے یا خود کسی افسردہ گھڑی میں لکھی گئی ہو۔ یہ نظم اقبال کی معمولی لیکن مقبول نظموں میں سے ہیں۔ اُس کے بعد "آفتاب صبح" ہے جس میں آفتاب کی گردش کا انسان کے ذوقِ جستجو سے مقابلہ کیا ہے۔

اس کے بعد پھر ایک اہم نظم آتی ہے جس میں "دردِ عشق" سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اپنے احساس کا اظہار کیا ہے کہ دردِ عشق ہی انسانی ہستی کا حقیقی مدعا ہے؛ اور اس زمانے میں مادیت کی ترقی، روحانیت کو فنا کر رہی ہے، روحانیت کے ساتھ عشق حقیقی (جو اقبال کے یہاں NATURAL PIETY کی ایک زیادہ ترقی یافتہ صورت کا نام ہے) فنا ہو رہا ہے۔ اس نظم میں خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی نظم ہے جس میں اقبال نے نئی نسلوں کی مادہ پرست ذہنیت کا ماتم کیا ہے۔ اور آگے بڑھ کر وہ اس خطرے کو بہت زیادہ محسوس کرنے لگے۔ اس نظم میں انتہائی لطافت کے ساتھ وہ موجودہ تعلیم کے اثر کو "حیرت علم آفریدہ" کہتے ہیں۔ اور بالآخر لکھتے ہیں۔

یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز — مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز

ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے — کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

اُس کے بعد کی نظم "گل پژمردہ" طامس مور کی نظم کو دیکھ کر لکھی گئی ہے، لیکن یہاں پھر وہی مشرقی روحانی رنگ دے دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اصل نظم سے بالکل علیحدہ چیز بن گئی ہے۔

"سید کی لوح تربت" کے عنوان سے اقبال نے جو نظم لکھی اس کا مُدعا باہمی اتحاد ہے۔ سر سید کے زمانے تک باہمی تکدّر کے کوئی آثار نہ تھے۔ سر سید کے مرنے کے بعد ہندو مسلم کشیدگی شروع ہوئی۔ اقبال نے اس نظم کا عنوان محض اسی لئے "سید کی لوح تربت" رکھا ہے کہ اگر سر سید مرحوم زندہ ہوتے تو وہ قوم کو اور قوم کے شعرا کو یہی نصیحت کرتے اس نظم کا KEYNOTE یہ حصّہ ہے۔

مُدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں — ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں — چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تیری تحریر سے — دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پُرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

بانگ درا میں اقبال نے اس نظم کا بہت تھوڑا حصّہ رکھا ہے۔ بہت بڑا حصہ کاٹ چھانٹ کر نکال دیا۔ "ماہ نو اور انسان اور بزم قدرت" یہ دونوں نظمیں باوجود اس کے کہ ظاہری یکسانیت نہیں رکھتیں۔ ایک ہی مدعا کی مُظہر ہیں وہی ہم جستجو۔ اس کے بعد "پیام صبح" لانگ فیلو اور "عشق اور موت" ٹینی سن سے ماخوذ ہیں۔ "پیام صبح" کے ترجمے میں ایک بات قابل غور ہے۔ لانگ فیلو نے صبح کی آمد کو بہت نرم الفاظ اور نرم زبان میں بیان کیا تھا۔ اقبال نے ترجمے میں اس کا مطلق لحاظ نہیں کیا اور بلند آہنگ الفاظ میں شان وشوکت کے ساتھ صبح کی آمد کا نظارہ دکھایا ہے۔ "عشق اور موت" میں ترجمہ اصل نظم سے بھی بڑھ گیا ہے۔ زبان بہت بہتر اور رواں ہے۔

"زہد اور رندی" کے عنوان سے اقبال نے ایک واقعہ کو نظم کیا۔ میں نے یہ پتہ چلانے کی بہت کوشش کی کہ یہ مولوی صاحب کون تھے۔ مگر معلوم نہیں ہو سکا۔ اس میں اقبال نے ایک شگفتہ پیرایے میں یہ ظاہر کیا ہے کہ اُن کی ہستی دوسروں ہی کے لئے نہیں۔ خود اُن کے لئے بھی ایک معمّہ ہے۔

اس کے بعد کی نظم "شاعر" اس حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں اقبال نے اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے

شاعر کے فرض پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کو وہ "دیدۂ بینائے قوم" کہتے ہیں جس کا کام صرف دیکھنا اور آنسو بہانا ہے۔ اس نظم کا موازنہ اگر اس نظم سے کیا جائے جو انہوں نے "شاعر" ہی کے عنوان سے یورپ سے واپسی کے بعد لکھی تو اس سے ان کے نقطۂ نظر کی تبدیلی کا پتہ چلے گا۔

"دل" کے عنوان سے جو نظم بانگ درا میں موجود ہے وہ فی الحقیقت "فریاد اُمت" کا ایک حصہ ہے۔ "فریاد اُمت" "ابر گہربار" کے نام سے انجمن حمایت الاسلام کے ایک جلسے میں پڑھکر سنائی گئی تھی۔ اُس کے بعد مرغوب ایجنسی لاہور نے اُس کو کتابی صورت میں شایع کیا۔ کلیات اقبال میں یہ پوری نظم موجود ہے۔ تعجب ہے کہ اقبال نے بانگ درا میں یہ پوری نظم کیوں شامل نہ کی۔ حالانکہ اس کا شمار اقبال کی بہت اچھی نظموں میں کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں "نالۂ یتیم" کا ذکر بھی مناسب ہے۔ یہ اقبال کی پہلی طویل نظم ہے اور بے انتہا خوبیاں رکھتی ہے۔ لیکن اقبال نے اس کو بھی بانگ درا میں شامل نہ کیا۔

"موج دریا" میں وہی جزو کل کا فلسفہ ہے جو اس زمانے میں اقبال کی دماغی توجہ کا مرکز تھا۔ اس کے بعد "رخصت اے بزم جہاں" ایمرسن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ اور اگرچہ اصل کی خوبیوں کا حسب عادت ترجمے میں کوئی خیال نہیں کیا گیا تاہم بجائے خود ترجمہ میں بہت سی لطافتیں ہیں جو اقبال کے قلم کا نتیجہ ہیں۔

اس کے بعد "طفل شیر خوار" ہے۔ اس نظم میں بھی اقبال نے "عہد طفلی" کی طرح ورڈسورتھ کے خیالات کی پیروی کی لیکن یہاں مغربی خیالات میں تصوف کی چاشنی سے نظم بجائے خود ایک خاص چیز بن گئی۔

"تصویر درد" اقبال کی شاعری کے پہلے دور میں ایک امتیازی خصوصیت رکھتی ہے۔ اقبال کی یہی ایک طویل نظم ہے جس میں انہوں نے حب وطن کے جذبات کو ادا کیا ہے۔ خیالات کا جوش و خروش زبان کی بلند آہنگ روانی اس نظم کی ادبی خصوصیات ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھتے تھے اور باوجود انتہائی اسلامی عقیدت اور اسلام سے محبت کے "پان اسلامزم" کا رنگ ان کے دل و دماغ اور ان کے خیالات و احساسات پر چڑھنے نہ پایا تھا۔ اقبال کی وطنی نظموں میں کوئی نظم "تصویر درد" کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ دور اول کی طویل نظموں میں سے صرف یہی ایک نظم ہے جس کو اقبال نے بانگ درا میں جگہ دی ہے۔

"نالۂ فراق" اقبال کی زندگی اور ان کی ادبی اور ذہنی کیفیت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اس نظم کے متعلق خود اقبال لکھتے ہیں۔

"استاذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لیجانے کے بعد اُن کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک سکونِ قلب کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک دن زورِ تخیل نے ان کے

مکان کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ اور یہ چند اشعار زبان پر آگئے ...."

لیکن ان نظموں میں ایک خاص بات قابل ذکر ہے۔ اسی زمانے سے اقبال پر "فارسیت" کا غلبہ شروع ہوا جابجا وہ فارسی اشعار کی تضمینیں باندھنے لگے۔ چنانچہ نالۂ فراق میں بکثرت فارسی اشعار موجود ہیں۔

"چاند" کا مقصد تو وہی ہے جو اقبال کی دور اول کی اکثر نظموں کا ہے یعنی "ہمچو نے از نیستان خود حکایت می کنم"، لیکن انداز بیان کے اعتبار سے یہ نظم بہت اچھی ہے۔ یہ نظمیں جو مطلب کے لحاظ سے بالکل یکساں نظر آتی ہیں انداز بیان اور طرز نگارش میں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ناظران میں سے ہر ایک میں بہت کافی دلچسپی محسوس کرتا ہے

اقبال کو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ انتہائی عقیدت و محبت رہی۔ "بلال" اسی عقیدت کا ایک نتیجہ ہے۔ حضرت بلال کو اقبال بہت قدر اور اہمیت کی نگاہوں سے دیکھتے رہے اور جابجا ان کی نظموں میں بلال کی طرف اشارے ہیں۔ اس نظم کا انداز بیان دلی عقیدت اور جوش کی وجہ سے ادبی خوبیوں سے مالا مال ہے مثلاً

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسائید

یا

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی نماز اُس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

جو نظم بانگ درا میں "سرگزشت آدم" کے عنوان سے چھپی ہے وہ فی الحقیقت ایک غزل کا قطعہ بند حصہ ہے۔ یہ غزل اخبار زمیندار میں شایع ہوئی تھی۔ کلیات اقبال میں غزلیات کے ضمن میں ہے۔

غزل کا مطلع یہ تھا:۔

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے ہر اک چیز میں دیکھا اُسے مکیں میں نے

اور مقطع یہ تھا:۔

عجیب شئے ہے صنم خانۂ امیرؔ اقبال میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

خود قطعہ میں سے اقبال نے بعض بہت اچھے شعر انتخاب نہیں کئے۔ پھر بھی اس صورت میں یہ نظم واقعی ہستی انسان اور تاریخ ہستی انسان کی ایک مختصر مگر واضح سرگزشت ہے جس میں ارتقائے تخیل انسانی کے ساتھ HISTORY REPEATS ITSELF کے نظریے سے سر زورہ پاگیا۔

"ترانۂ ہندی" اقبال کی انتہائی مشہور نظموں میں سے ہیں۔ اردو میں یہ اپنے طرز کی پہلی نظم ہے۔ اور اس کے بعد اس کے تتبع میں ہزاروں نظمیں لکھی گئیں لیکن کوئی اس کا مقابلہ نہ کرسکی۔ رسالہ زمانہ کو فخر حاصل ہے کہ اس میں

سب سے پہلے یہ نظم شایع ہوئی جو اردو زبان میں ہمیشہ یادگار رہیگی۔

"جگنو" پر جو نظم اقبال نے لکھی ہے۔ وہ گوناگوں خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر شخص بقدر ذوق اس سے محظوظ ہوسکتا ہے بچے اور بوڑھے اس نظم سے یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔ بچوں کو اس کا ترنم انتہائی دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ اور بوڑھوں کو خیالات کی گہرائی اور عظمت۔

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسمان کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

"صبح کا ستارہ" اقبال کے دل پر ہمیشہ ایک خاص اثر پیدا کرتا رہا۔ اور انہوں نے دو تین نظمیں اس موضوع پر لکھیں اور اس کے علاوہ جابجا صبح کے ستارے کا اپنی دوسری نظموں میں ذکر کیا۔ اس نظم کی محرک دلربائی فطرت نہ تھی بلکہ ایک خاص جوش تھا۔ اس زمانے میں جنگ ترکی وروس چھڑی ہوئی تھی۔ اور اخبار زمیندار میں یہ نظم شایع ہوئی جس میں ایک مجاہد کی بیوی کے آنسو کو ستارۂ صبح کی انتہائی مکمل صورت سے تشبیہ دی گئی۔ کوشش اس کی کی گئی تھی کہ شاعرانہ جذبات انتہائی ترتیب ولطافت سے ادا کئے جائیں۔ لیکن اقبال کو اس کوشش میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اور نظم میں ہم آہنگی پیدا نہ ہوسکی۔

"نیا شوالہ" اقبال کی بہترین اور مقبول ترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر آج تک اس سے بہتر کوئی نظم نہیں لکھی گئی ہے۔ اس میں اقبال سیاسی لیڈر کی حیثیت سے نہیں بلکہ شاعر کی حیثیت سے اتحاد کی تلقین کرتے ہیں۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس نظم کے خیالات کی بلندی اور عظمت کو شاعرانہ لطافت وشوکت کے ساتھ اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔ صرف ایسی ہی چند نظمیں اردو ادب میں ہمیشہ کے لئے اقبال کا نام باقی رکھ سکتی ہیں۔ پوری نظم بہت

کافی طویل اور بہت دلچسپ ہے۔ تعجب ہے کہ اقبال نے بانگ درا میں شایع کرتے وقت اس قدر کانٹ چھانٹ کیوں کی ہے

نواب مرزا خان داغ سے اقبال اصلاح لیتے تھے، اور داغ کی بہت کافی قدر و منزلت اقبال کے دل میں موجود تھی۔ اور اقبال نے اپنی غزلوں میں جابجا داغ کے تتبع کی کوشش کی۔ "داغ" کا مرثیہ بھی اقبال کی منتخب نظموں میں سے ہے اور نظم کی شوکت و روانی ظاہر کر رہی ہے کہ دل سے نکلی ہے۔ اس نظم میں بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں۔ اور خصوصیت سے وہ شعر خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں اقبال نے داغ کے کلام اور طرز بیان اور کامیابی موضوع پر نظر ڈالی ہے۔

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گُل کا راز — کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بُلبُل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں — آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت — ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟ — اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

داغ کی تعریف میں مبالغہ سہی لیکن نظم کی دوسری خوبیاں خامیوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ نظم میں بالکل صحیح تنقید نہ ہو سکتی ہے اور نہ ہونا چاہیے۔ اور مرثیے میں تو تعریف ہونا چاہیئے نہ کہ تنقید۔

"ابر" پر اقبال نے جو نظم لکھی ہے وہ اقبال کی اُن چند نظموں میں ہے جہاں انہوں نے مناظر قدرت کا صرف مناظر قدرت کی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں ان کا نقطۂ نظر فلسفیانہ نہیں بلکہ جمالیاتی ہے۔ اور کوئی خاص بات اس نظم کے متعلق قابل تحریر نہیں۔

"ایک پرندہ اور جگنو" ولیم کوپر کی ایک نظم کا ماخوذ ترجمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک اقبال انگریزی شعرا کے کلام کا برابر مطالعہ کر رہے تھے۔ گو انگریزی شعرا کا اثر ان کے کلام پر بہت کم ہو گیا تھا۔ یہ ماخوذ ترجمہ خیالات کی مشرقیت کی وجہ سے اصل نظم سے بھی بہت بڑھ گیا۔ اسی سلسلے میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اقبال کے شروع کے ترجمے بعد کے ترجموں کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتے ہیں۔

"بچہ اور شمع" ایک نظم ہے جس میں اقبال نے "عہد طفلی" اور "شمع" دونوں کے خیالات کو یکجا کر کے کچھ اور زندہ پیرائے کے ساتھ ظاہر کیا۔ یہ نظم باوجود موضوع کی یکسانیت کے، بہت سی دلکش خوبیاں رکھتی ہے۔ اس نظم کے K.EYNOTE (یہ دو شعر ہیں۔

رُوح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس — ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے زندگی اس کی مثالِ ماہی بے آب ہے

دریائے راوی کا کنارہ ۔ لاہور کی خاص تفریح گاہوں میں ہے اور اقبال بھی اکثر یہیں تفریح کیا کرتے تھے شاعر کا ذہن اسی تفریح گاہ میں اپنا ایک موضوع تلاش کر لیتا ہے ۔ چنانچہ "کنار راوی" کی ابتدا راوی اور راوی کے ساحلی منظروں سے ہوئی ہے ۔ شاعر بیک گراونڈ (BACKGROND) کی طرح ان مناظر کو پیش کرتا ہے، اور پھر ان پر زندگی کی تصویر نمایاں کرتا ہے ۔ زندگی کو ایک کشتی کی روانی سے (SYMBOLIZE) کیا ہے ۔

سبک روی میں مثالِ نگہ ہے یہ کشتی نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی ۔
جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہیں ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے ۔ لیکن فنا نہیں ہوتا

یہ وہ مصوری ہے جو صرف الفاظ کے ذریعہ کی جا سکتی ہے ۔ جہاں رنگ خطوط اور موقلم بیکار رہ جاتے ہیں
اقبال کو ہمیشہ سے بزرگان دین اور اولیاء اللہ سے بہت عقیدت رہی ۔ باوجود انکی اعلیٰ تعلیم اور اس قدر ذہنی نشوونما کے اُن کی یہ کمزوری تعجب خیز ہے ۔ اسی وجہ سے ان سے شاہ سلیمان پھلواری اور خواجہ حسن نظامی سے بہت مراسم رہے ۔ حضرت محبوب الٰہی سے ان کو خاص عقیدت تھی ۔ انگلستان جاتے ہوئے وہ دہلی میں ٹھہرے اور درگاہ شریف بھی گئے ۔ درگاہ شریف جانے کا پورا قصہ اقبال کے دوست میر نیرنگ نے جو اُن کے ساتھ تھے بہت دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے ۔ اس نظم میں خاص طور پر قابل غور وہ حصہ ہے جہاں اقبال نے اپنی آرزوئیں بیان کر کے دعا مانگی ہے ۔ اس سے اقبال کے زاویۂ نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے ۔

مِری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دُکھے کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
دِلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

یہ اقبال کی آخری نظم تھی جو سفر یورپ سے پہلے سرزمین ہند پر لکھی گئی اور اس کے ساتھ اقبال کی شاعری کا ایک دور ختم ہوتا ہے ۔ یا یہ کہ یہاں ایک اقبال کی شاعری ختم ہوتی ہے اور دوسرا اقبال افقِ یورپ سے نمودار ہوتا ہے
ایک اجمالی نظر میں میں نے اقبال کی ہر نظم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ۔ اب اُن کی دور اول کی شاعری کی چند عام خصوصیات کا ذکر ضروری ہے ۔

اس زمانے میں اقبال کی شاعری کا رنگ کچھ فلسفیانہ (ادبی معنوں میں فلسفیانہ) اور کچھ قومی تھا۔ وہ عقل کے بجائے دل کو رہنما بنانے ہیں۔ اور برگساں اور نٹشے کی پیروی کے بجائے مولانا روم اور امام غزالی کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ اُن کا یہ مسلک آج تک باقی ہے بلکہ پہلے سے بہت زیادہ مضبوط اور مکمل۔

ابتدائی نظموں میں ایک بیتاب جستجو پائی جاتی ہے، جو اقبال کے ذہن کی ابتدائی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے، اُس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب وہ ایک نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اُن کو اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اُن کی اکثر و بیشتر نظموں کا موضوع وہی ہے۔ یعنی عالمگیر حُسن کی عشق پروری خیالات کی مشرقیت کو وہ مغربی انداز میں بیان کرتے ہیں اور اس طرح وہی خیالات بالکل نئی چیز بنجاتے ہیں۔ ایک اور خصوصیت جو اس انداز کے کلام میں اقبال کو ہندوستان کے تمام شاعروں سے یہاں تک کہ ٹیگور سے بھی ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ انہوں نے مشرقی و مغربی ادب اور فلسفے کا یکساں جامع مطالعہ کیا۔

اس زمانے میں اقبال کا سیاسی مسلک قوم پرستی تھا۔ یورپ جاکر انہوں نے پان اسلامزم کو اپنا اور اپنی شاعری کا عقیدہ بنایا۔ اس سے پہلے وہ ہندوستانی ہونے پر زور دیتے تھے۔ اور اُن کی چند لاجواب نظمیں اسی عقیدے کی یادگار ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو مذہب اسلام، ملت اسلام، بانی اسلام، اور بزرگان اسلام سے سچی عقیدت تھی۔ اور بہت سی نظمیں انہوں نے اسی تاثر میں لکھی ہیں۔

اقبال کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا دماغ ہمیشہ بیدار (SANE) رہتا ہے۔ وہ کہیں ذرا بھی نہیں بھٹکتے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، بلا زبان یا لطافت زبان کی پروا کئے بے تکلف کہہ جاتے ہیں تاکہ ان کا مافی الضمیر صاف صاف ظاہر ہو جائے........ اُن کی زبان میں جو خامیاں ہیں ان کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

اقبال فلسفی ہیں لیکن حُسن کار (ARTIST) نہیں جا بجا انہوں نے حُسن کارانہ دلکشیاں پیدا کرنیکی کوششیں کیں اور اپنی کوششوں میں وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

اقبال کی زبان پر بکثرت اعتراض کئے گئے ہیں۔ جو یقیناً ایک حد تک صحیح ہیں۔ لیکن اقبال کے پایے کے شاعر اور ادیب زبانی قیود سے آزاد ہیں۔ زبان کا فرض ہے کہ ان کی پیروی کرے یا ان کی غلطیوں کو (EXCEPTIONS) میں شمار کرے۔

مثنوی در تعریف تمباکو و حقہ

حسب الفرمائش جعفر علی خان صادق و ایشاں حسب الحکم محمد شاہ بادشاہ .... (کرم خوردہ)

(فی بحر ہزج مسدس محذوف مفاعیلن مفاعیلن فعولن)

اس مثنوی کے متعلق تفصیلی معلومات ڈاکٹر سید محی الدین قادری کے مضمون سے حاصل ہوسکتی ہیں جو اسی رسالہ میں کسی دوسرے مقام پر شایع کیا جا رہا ہے (مدیر)

تماکو کو نہ جانوں کیا سبب ہے
ملا ہے گڑ سے اور کیوں گڑ طلب ہے

طلب ہے گڑ کی اس کو اس سبب سے
ملاوے گڑ اسے لالن کے لب سے

ملا گڑ تب گڑاکو نام پایا
سبھوں نے چاہ کر تب منہ لگایا

اگر ہے تلخ پر میٹھا ہے گڑ سے
مٹھائی گڑ کی ہے گی اس میں دھر سے

کہے حقا تماکو کیوں جلے ہے
کہ گنگا جل ترے پاوں تلے ہے

اگن کو آب نے سے لے بجھا دے
وگرنہ باعث جلنا بتا دے

تماکو نے کہا حقہ سے جل کر
یہ سر عشق ہے سنیو سنبھل کر

اگن میں جان کر جو جی جلاوے
چمن میں عشق کے تب گل کہلاوے

ہوا ہوں سوکھ کر میں خشک اور زرد
یہی صورت ہے میری دیکھ بے درد

کبھو رو رو کے میں ہوتا ہوں تر نم
کبھو میں جل بجھوں ہوں غم سے ہردم

کبھو گویا کبھو خاموش ہوں میں
کبھو داغوں سے پر گل پوش ہوں میں

ہمیشہ سر اُپر جلتا توا ہے
جنم سے مجھ کو جلنے کی ہوا ہے

قدم سے میرے محفل ہوی ہے باغ
چمن میں رشک سے لالہ کو ہے داغ

زباں پر سب کے میرا نام ہے گل
نمونہ دود کا میرے ہے سنبل

۱۵ کروں کیا وصف اپنے دودماں کا ۔۔۔ جہاں بندا ہے میرے خاندان کا
یہی احوال ہے ہر آن میرا ۔۔۔ کہ جب سے عشق ہے مہماں میرا
مجھے اس لعل کے لب سے ملائے ۔۔۔ جلا دے، پھونک دے یا پھر جلائے
میری صحبت سے آتش تاب ہے یہ ۔۔۔ اگرچہ ناو اس کا آب نے ہے
کہو فوارہ آتش بار اس کو ۔۔۔ نہیں جلنے سوا کچھ کار اس کو
۲۰ چلم گل، آب نے ڈنڈی نمن ہے ۔۔۔ ہوی نے نل، چمن اس پر دمن ہے
اگن میں پھول اور ڈنڈی ہے جل میں ۔۔۔ گل خورشید ہے شکل کنول میں
کنول میں کوئلا مثل بھنور ہے ۔۔۔ بھنور میں پنجرہ سرپوش زر ہے
یہ کیا سرپوش کی تقصیر ہے گی ۔۔۔ گلے میں اس کے جو زنجیر ہے گی
نہ چنبر، رشک چرخ چنبری ہے ۔۔۔ کہ جس کی اوٹ میں آتش بھری ہے
۲۵ چلم کے جوہری خواہاں کھڑے ہیں ۔۔۔ انگارے لعل کے جوں نگ جڑے ہیں
سنا حقے نے تماکو کا احوال ۔۔۔ ہوا یکبارگی نالاں و بے حال
کہا نیچے سے اس نے آرزو ساتھ ۔۔۔ کہ ہے گا کام ہم سب کا ترے ہاتھ
یہ سن، دل پیچ نیچا پیچ کھا کر ۔۔۔ جبیں پر چین چڑھا سینا دکھا کر
کہا پی سے کہ پہلے سب خبر رکھ ۔۔۔ ان اپنے دل جلوں اوپر نظر رکھ
۳۰ پیا ہو مہرباں حقہ بلایا ۔۔۔ کرم کر، لے کے نیچا منھ لگایا
لگا کر ہونٹھ سے یکدم میں پی نے ۔۔۔ عزیز اب کر دیا عالم میں پی نے

بقیہ حاشیہ: ۱؎ ہے سیں ۲؎ ملا جب گڑگڑا کو نام پایا ۳؎ ہر اک نے چاہ کر تب منھ لگایا ۴؎ یہ شعر "گلشن گفتار" میں موجود نہیں ۵؎ برہ کی بات ہے سن تو سنبھل کر ۶؎ نمبر ۹ سے نمبر ۔۔ تک کے اشعار "گلشن گفتار" میں موجود نہیں ہیں۔ ۷؎ میری سنگت سے ۸؎ اشعار نمبر ۱۹ اور ۲۰ "گلشن گفتار" میں موجود نہیں۔ ۹؎ مثل ۱۰؎ او نہر ۱۱؎ پر ۱۲؎ اشعار نمبر ۲۳، ۲۴، ۲۵، "گلشن گفتار" میں موجود نہیں۔ ۱۳؎ جگر کے خون سے رو رو کر بھر آتاں ۱۴؎ کہا نیچے سے سوں آرزو سات ۱۵؎ یہ سن سن ہار نیچا پیچ کھا کر ۱۶؎ نے ۱۷؎ اس کے ۱۸؎ لگا وہ لب ستی یکدم میں پی نے۔

لگی محبوب کے جس وقت مکھ نے — وہاں تب رشک سے پانی ہوئی مئے
لگا مہنال تب حق حق پکارا — کہ خوب[19] منصور آیا پھر دوبارا
نہ حقے ہیں صدائے سرسری جان — کنھیا ہاتھ گویا بانسری جان
۳۵ گمند[20] دست محبوباں سے نیچا — انیس و ہمدم خوباں ہے نیچا
کہرولی[21] وہاں کی بو سے رچا ہے — گلاب و مشک و عنبر سے بسا ہے
بجا یہ حقہ و نیچے میں لے ہے — جوں[22] مطرب ہاتھ چھلے دارنے ہے
نہ نے پرسانولی برہانپوری بوجھ[23] — یہ جوں[24] کالے پہ کالی کینچری بوجھ
تس[25] او پرتم نہ بوجھ دستکی ہے — اسیر تشنۂ دل بستگی ہے
۴۰ بڑا پیچوں ہیں نیچا پیچواں ہے — کہ سب روہمسر زلف بتاں ہے؟
..... دیکھے سے دل خورسند ہے گا — عجب معشوق کل کے بند ہے گا؟
نہیں خفا مگر[26] دکھنی پسر ہے — کہ چیرا کو چلی کا سراو پر ہے
بجا[27] ہے بزم ہو گر اس کا میدان — کہ حقا گوے ہے، اور نے ہے چوگان
صف عشاق میں آتش..... ہے — .... (اکرم خوردہ)
۴۵ یہاں گلدستہ لانا کیا چلی ہے — نماکو گل ہے اور حقا کلی ہے
کرے ہے طعن اب حقا فلک پر — کہ میں ہوں خوبتر تجھ سے مدور
تری گردش کا ہے شکوہ ہراک جا — مرے مشتاق ہیں اعلیٰ و ادنا
ہے الماس و گہر سے مجھ کو تزئین — بنا ہوں موتیوں سے عقد پروین
برائے خاطر معشوق طناز — کہ ہووے ایک دم وہ مجھ سے دمساز

---

[19] کہ جیوں منصور پھر آیا دوبارا [20] "گلشن گفتار" میں یہ شعر بعد میں آیا ہے۔ [21] موجود نہیں [22] جو [23] ہے [24] کہ جیوں کالے پہ کالی کیچلی ہے۔ [25] اشعار نمبر ۳۹، ۴۰، ۴۱ "گلشن گفتار" میں موجود نہیں ہیں۔
[26] افغان پسر [27] اشعار نمبر ۴۳ سے ۵۲ تک "گلشن گفتار" میں موجود نہیں ہیں۔

۵۰ زمیں پر جا بجا کر لے نظارے — جھڑیں ہیں فیض کے میرے ستارے
اگر تارے نہ ہوتے آسماں ہیں — سہانا کس طرح لگتا جہاں ہیں
اس دن رات مہر و مہ جلا ہے — مرے کن چاند سورج خوانچا ہے
نہیں[۲۸] انڈوی یہ زر دوزوں کے گھر کی — مرے پاؤں میں ہے خلخال زر کی
شحر[۲۹] خورشید کا گردا بنایا — ستارا صبح کا مجھ پاس لایا
۵۵ کہ یہ میں پیشکش لایا ہوں بھیجو — اسے حقے کا زیر انداز کیجو
بجا ہے گروہ ہو انڈوی کے ہمراہ[۳۰] — کہ جس کی جوت سے تاریک ہے ماہ
کرن اس گرد گرد ے کی سراسر — گویا خورشید نکلا ہے زمیں پر
نئے[۳۱] ہے حقا یار یارو دل جلوں کا — نئے[۳۲] ہے حقا درد میں مونس سبھوں کا
سبھوں کو اس کا پینا سود دے ہے گا — دھواں طفلاں کے حق میں دود دے ہے گا
۶۰ نہ بوے آپ سے جب تک[۳۳] نہ بو لو — کھلے نہیں پیچ سب جب تک[۳۴] نہ کھولو
وہ[۳۵] جس کے پاس یکدم آ و نا ہے — وہی اس کے تئیں سلگاو نا ہے
مزا اس تلخ وش کا آئے اس کو — جو کڑوا گھونٹ سا پی جائے اس کو
ہوا ہے جب سے یہ پیدا عدم سے — جلے ہے دمبدم سر تک قدم سے
کسو نے اس کی کیفیت نہ جانی — کہ کیونکر ایک جا ہے آگ پانی
۶۵ مخالف طبع اور باہم ہیں یک جا — تماشا ہے تماشا ہے تماشا
نہ ان دونو سے وہ بولے ہے گڑگڑ — ملے ہیں بلک اس میں چار عنصر
تعمق کی نگہ سے دیکھ دم کش — جمع ہیں خاک و باد و آب و آتش
مسیحا دم اسے کہنا روا ہے — کہ ہر اک مرض کو اس سے شفا ہے
یہ فارغ ہے بری سے اور بھلی سے — سدا ہے کام اسے ذکر جلی سے

---

۲۸ زری کی انیڈوی حقہ کی اگرنال ہٗ ہے ہے رات دن مانند خلخال۔ ۲۹ نمبر ۵۵ سے ۶۵ تک کے اشعار گلشن گفتار میں موجود نہیں
۳۰ اس شعر سے پہلے "گلشن" میں یہ شعر ہے۔ کمند دست محبوباں یہی ہے، انیس و ہمدم خوباں یہی ہے۔ ۳۱ یہی ہے یار یارو۔

۷۰ یہ کامل ہے گا درویشی کے فن میں　　اسے خلوت ہے ہر دم انجمن میں
کرے ہے شغل یہ ہر دن مکرر　　ہمیشہ سے رہے ہے تازہ و تر
مجھے دن رات ایسا یار بس ہے　　کہ ہر دم جس کے تئیں پاس نفس ہے
ہے آمد رفت اس کے دم کی دن رات　　ممدِ ہم حیات ہم فرحت ذات
پسندِ خاطرِ شاہ و گدا ہے　　بہفتادو دو ملت آشنا ہے
۷۵ ہے سب کے مذہب و مشرب سے آگاہ　　ہر ایک محفل میں ہے گی اس کے تئیں راہ
کوئی حقا کوئی قلیاں کہے ہے　　کوئی مجلس کی اس کو جاں کہے ہے
تنا کو بھیلسی کا معتبر ہے　　مزے میں بو میں سب سے خوب تر ہے
جو ترنم ہے تو دفتر پیچ ہے گا　　سوا دونو کے اور سب ہیچ ہے گا
یہ حقا بادشاہوں کا بنا ہے　　فقیر اب کڑکڑی کا آشنا ہے
۸۰ کہ ہو ہے سب کے تئیں سب جا میسر　　کوئی ہو کیا غریب اور کیا تونگر
کوئی چھوٹا جہاں میں اس سے کم ہے　　تنا کو گر نہ ہو گڑ کا دم ہے
تمام عالم میں حاتم ڈھونڈھ آیا
پر ایسا دوسرا ہمدم نہ پایا

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۴۰)　　۳۲ یہی ہے درد میں ساقی سبھوں کا۔　　۳۳ لگ　　۳۴ اس کے بعد کے تمام شعر سوائے مقطع کے گلشن گفتار میں محذوف ہیں۔　　۳۵ بہت ساجگ ملی حاتم

از جناب ابو المکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی، اے، کلیۃ المعلمین

جان جیکس روسو (۱۲ء ۱۷۱۲ - ۱۷۷۸ء) سوئٹزرلینڈ کے مشہور شہر جنیوا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک گھڑی ساز تھا۔ قصے کہانیوں سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ایک جذباتی آدمی بن گیا تھا۔ روسو کی ماں بھی ایک پادری کی بیٹی تھی اور اس میں بھی جذباتی عنصر بدرجۂ اتم موجود تھا، روسو کے پیدا ہونے کے بعد ہی اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ اپنی پھوپی کے زیر نگرانی پرورش پانے لگا۔ یہ عورت کچھ ایسی زیادہ پڑھی لکھی اور شائستہ نہ تھی۔ اس لئے روسو میں حقیقی اخلاقی خیالات پیدا نہ کر سکی۔ اس کا باپ بھی بہت ہی لاپروا آدمی تھا، جب روسو کی عمر چھ سال کی تھی وہ رات رات بھر اس کے سامنے ادنیٰ درجہ کے جذباتی قصے اور افسانے پڑھکر سنایا کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسو بچپن ہی سے جذبات کا بندہ اور تخیل کا شیدائی بن گیا۔ جب اس کی ماں کی جمع کی ہوئی ناولوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اس نے اپنے دادا کے کتب خانے کی طرف توجہ کی اور اس کی چند مستند تواریخ پڑھنے کا موقع ملا۔ ان سے روسو میں راجائیت اور آزادی کے خیالات پیدا ہو گئے۔ اور چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہی خیالات کی بدولت آگے چلکر وہ اپنی موجودہ سوسائٹی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے انقلاب عظیم کا بانی ہوتا ہے۔

دو سال بعد روسو کو باسی نامی ایک گاؤں میں زندگی گذارنی پڑی۔ جنیوا کے دلچسپ مناظر نے پہلے ہی سے اس کا دل مسخر کر لیا تھا۔ اس گاؤں کے پُرلطف مناظر اور قدرت کی سحر کاریوں نے اور بھی اس پر اپنا سکہ جما دیا اور وہ مناظر قدرت کا دلدادہ اور شیدائی بن گیا۔ اور کہنے لگا کہ قدرت سے دوری انسانیت کو تباہ و برباد کر دیتی ہے یہی چیز آگے چلکر اس کے فطری فلسفہ کا مرکز بن گئی۔ اس کے بعد وہ جنیوا واپس آیا اور اسی طرح لااُبالی اور جذباتی زندگی بسر کرنے لگا۔ روسو ہمیشہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے ساتھ رہا کرتا تھا جس سے آوارہ پھرنے، جھوٹ بولنے اور چرانے کی عادت پڑ گئی، وہ شہر سے بھاگ نکلا اور ادنیٰ قسم کے لوگوں کے ساتھ آوارگی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس دوران میں اسے قدرت سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ او

غریب اور نچلے طبقوں کی خراب و خستہ حالت کا احساس بھی ہونے لگا۔ ان تاثرات نے جیسا کہ ہم آگے چلکر دیکھیں گے روسو کی زندگی اور خیالات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

انیس سال کی عمر میں روسو کو سیوائے نامی مقام پر میڈیم ڈی وارنس کے ساتھ جو ایک سطحی کردار کی عورت تھی رہنا پڑا اس زمانے میں اس نے لاطینی، موسیقی، فلسفہ اور دیگر علوم کے متعلق تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرلی۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے تنگ آگئے اور روسو پیرس واپس آیا یہاں وہ تھریس (THERESE LE VASSEUR) نامی عورت سے وابستہ ہوگیا۔ یہ عورت تمام عمر اس کے ساتھ رہی، اب روسو کو اپنے اور اس کے لئے روزی کمانا تھا جس کی وجہ سے اس میں ذمہ دارانہ زندگی کا بھی احساس پیدا ہوگیا۔

پس آوارہ زندگی نے روسو میں حساسیت قدرت سے دل بستگی غریبوں سے محبت و بیداری پیدا کردی۔ اور روسو اپنی موجودہ نظام حکومت کے خلاف خیالات پکانے لگا۔ یہ لوئی پانزدہم کا زمانہ تھا۔ بادشاہ مطلق العنان تھا۔ اس کی حکومت برائے نام تھی، سارا کاروبار چند جاہل اور بدمعاش درباریوں کے ہاتھ میں تھا۔ امیر طبقہ کا بول بالا تھا، کاشتکاروں کا ٹیکس ادا کرتے کرتے برا حال ہوگیا تھا۔ ان کے حقوق پامال کئے جارہے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ ان کا فرض تھا کہ وہ ایک عیش و عشرت کرنے والی مختصر سی جماعت پر اپنی تمام محنتیں و مشقتیں نثار کریں روسو کا حساس دل ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور آہستہ آہستہ اس کے دل میں موجودہ سوسائٹی کے خلاف انقلابی خیالات پیدا ہونے لگے۔

تصانیف

روزی کمانے کے دوسرے بہت سے دھندوں میں روسو نے ادب کو بھی تلاش معاش کا ایک ذریعہ بنالیا تھا۔ اور ۱۷۵۰ء میں حسن اتفاق سے وہ ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوگیا۔ وہ اس طرح سے کہ "اکیڈیمی آف ڈیجان" نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص اس سوال کا کہ "سائنس اور فنون کی ترقی کیا اخلاق کو سنوارنے کی ممد ہوئی یا بگاڑنے کی محرک؟" بہترین جواب دے گا اس کو انعام دیا جائے گا۔ روسو نے گو غیر منطقی طور پر ہی سہی لیکن بہت ہی زور و شور کے ساتھ یہ بتلایا کہ سوسائٹی کی پستی اور خراب و خستہ حالت تمدن کی ترقی کی وجہ سے ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات بتلائے سوسائٹی نے اس کے مضمون کو پسند کیا اور انعام کا مستحق ٹھہرایا۔ اس کے تین سال بعد ہی اسی اکیڈیمی نے ایک اور مضمون کا اعلان کیا "انسانوں میں عدم مساوات کی اصلیت" اس پر روسو نے بھی قسمت آزمائی کی اور بتلایا کہ پہلے یعنی بہت ہی قدیم سوسائٹی میں جب کہ قدرت کی حکمرانی تھی انسانوں میں کوئی امتیاز نہ تھا لیکن تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب سے کہ خانگی جائدادوں کا سوال پیدا ہوگیا۔ عدم مساوات کو تقویت ہوئی۔

روسو کے یہ جمہوریت پسند اور انقلابی خیالات پیرس کی منافقانہ اور مردہ زندگی کے موافق نہ تھے۔ اس لئے اسے

چند وجوہات کی بنا پر اپنے دوست احباب اور ساتھیوں کو خیرباد کہہ کر مانٹ مورینسی جانا پڑا ۔ ۱۷۶۱ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب THE NEW HELOISE پیش کی اور اس کے ایک سال بعد ہی اس کا مبسوط اور پراثر مقالہ SOCIAL CONTRACT اور تعلیم پر انقلابی مقالہ EMILE شائع ہوئے ۔ NEW HELOISE کا پہلا حصہ جذبات اور عشق عاشقی سے بھرا پڑا ہے ۔ اور آخری حصہ میں شادی، خاندان اور دیہات کی پرسکون زندگی کو سراہا گیا ہے ۔ SOCIAL CONTRACT میں روسو نے ایک ایسے آئیڈیل اسٹیٹ کی حالت بیان کی ہے جہاں سادگی کی حکومت ہے اور امراء پرستی، نمائش اور تصنع کا کوئی ذکر نہیں ۔ اس کتاب نے شہنشاہ پرست فرانس اور کلیسا میں جو ہیجان پیدا کر دیا ہوگا اس کا بیان تحصیل حاصل ہے ۔

ایمل روسو کی شاہکار تصنیف ہے ۔ اس کتاب نے روسو کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے ۔ تعلیماتی نقطۂ نظر سے یہ بہت ہی اہم تصنیف ہے کیونکہ اس میں روسو کے تمام تعلیمی خیالات کا مفصل حال درج ہے ۔ اس میں روسو نے کسی قدر ناول کے پیرایہ میں اپنے خیالات کو نہایت ہی دلچسپ اور پراثر طریقے سے بیان کیا ہے ۔ اس میں اشخاص قصہ تین ہیں ۔ ایمل، صوفی اور معلم، معلم خود روسو ہے ۔ جس طرح سوشیل کنٹراکٹ ملک کی سماجی اور سیاسی حالت کو درست کرنے کے لئے لکھی گئی تھی ایمل کا مقصد ملک کی عام تعلیمی حالت کو درست کرنا تھا ۔ روسو کا خیال ہے کہ فطری تعلیم سے تمدن کی خامیاں گھٹتی ہیں اور انسان فطرت سے قریب ہوتا جاتا ہے ۔ پہلے بچوں کے لباس اور تعلیم میں حد درجہ تصنع سے کام لیا جاتا تھا ۔ روسو ان تمام کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے اور ایمل میں اپنے تمام فطری خیالات کو بیان کرتا ہے ۔ ایمل پانچ حصوں پر منقسم ہے ۔ پہلے چار حصوں میں ایمل کی شیرخوارگی، بچپن، لڑکپن اور جوانی کا ذکر ہے ۔ پانچواں حصہ اس کی ہونے والی بیوی کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہے ۔

ایمل کے پانچ حصے

روسو اپنی کتاب کو اس اصول سے شروع کرتا ہے کہ "قدرت کے ہاتھوں جو چیز دنیا میں آتی ہے وہ بالکل نیک ہوتی ہے لیکن انسان اسے بگاڑ دیتا ہے ۔" اس کی وضاحت کے بعد وہ کہتا ہے کہ انسان تین طرح سے تعلیم حاصل کرتا ہے ۔ قدرت، انسان اور اشیاء، تعلیم میں کمال پیدا کرنے کے لئے ان تینوں کا ہونا ضروری ہے اب چونکہ ان سب میں فطرت کا پلّہ بھاری ہے لہذا اگر تعلیم میں فطرت کا لحاظ رکھا جائے تو انسان کے لئے بہت مفید ہوگا ۔ تعلیم کا مقصد روسو کے نزدیک انسانی فرائض کو پورا کرنا ہے ۔ ایسے نازک کام کے لئے والدین کی تربیت ضروری ہے ۔ اور والدین نہ ہونے کی صورت میں یہ کام کوئی قابل بھروسہ آدمی ہی انجام دے سکتا ہے ۔ روسو بچہ کو گاؤں میں رکھنے کا مشورہ دیتا ہے تاکہ وہ فطرت سے قریب اور تمدن کے بیجا اثرات سے دور رہے ۔ جہاں تک ہو سکے اس کو خود سے حاصل کرنے کا موقع دیا جائے ۔ سوائے ناگزیر صورتوں کے وہ دوا دارو کا بھی قائل نہیں ہے

کیونکہ اس کے خیال کے مطابق یہی چیزیں ہلاکت کا باعث ہوتی ہیں۔ لاک کی طرح وہ بھی بچوں میں سختی برداشت کرنے کی عادت ڈالنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ بچوں کی تربیت میں سرد گرم کا کچھ خیال نہ رکھا جائے۔ انہیں ننگے کھلے پھرنے دو ہر موسم کا پانی نہانے دو۔ بچہ میں کسی قسم کی عادت نہ پیدا ہونی چاہیئے اور اگر کوئی عادت ڈالی بھی جائے تو یہ کہ وہ کسی عادت کا غلام نہ بنے۔ اسی طرح بچوں کو ڈر، خوف وغیرہ کی بھی عادت نہ ڈالی جائے۔ کھیلنے کے لئے بچوں کو سونے چاندی کی گھنٹیاں نہ دی جائیں بلکہ اس مقصد کے لئے میوہ دار ٹہنیاں اور پھول پتے بہت کافی ہیں۔ بات چیت میں زبان صاف، سادہ اور ستھری ہونی چاہیئے۔ بچہ کے لئے اتنی بات کرنا کہ وہ اپنے سادہ اور حقیقی خیالات کو آسانی کے ساتھ بیان کر سکے بہت کافی ہے۔

یہ تعلیم ایک سے پانچ سال تک کے لئے تھی، اس میں روسو بالکل جسمانی تعلیم پر زور دیتا ہے۔ روسو کا بیان ہے کہ بچہ کی جبلتیں اور رجحانات فطرتاً نیک ہوتے ہیں ان کو برائی سے محفوظ رکھنا چاہیئے اور اس بات کی احتیاط لازمی ہے کہ اس کی ذہانت پر غلط ارتسامات جگہ نہ پائیں۔ یہ فطری اور فعلی تعلیم ہے جو دوسری کتاب میں بھی جاری ہے۔ دوسری کتاب میں پانچ سے بارہ سال تک کے بچے سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں روسو یہ خیال پیش کرتا ہے کہ اخلاقی تعلیم اس وقت تک نہ دینی چاہیئے جب تک کہ بچہ استدلال کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ جہاں تک ہو سکے بچہ کو تجربہ سے سیکھنے کا موقع دیا جائے۔ اگر وہ اپنا یا کوئی اور چیز توڑتا ہے تو اسے اس کا خمیازہ بھگتنے دو۔ تجربہ سے خود وہ اس کے نقصانات کو محسوس کرنے لگے گا کہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ روسو بچوں کی عملی تعلیم پر بڑے شد و مد کے ساتھ زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس دور میں تعلیم کا مقصد اعلیٰ جسمانی نشوونما ہے۔ اس زمانے میں نفس کو بالکل اپنے حال پر چھوڑ دینا ہی مناسب ہے کیونکہ غور و فکر کے لئے ہم کو پہلے اپنے بازو، حواس اور دیگر عضویات کو مناسب ترقی دے لینی چاہیئے اس لئے کہ یہ سب بجائے خود ذہانت کے آلہ کار ہیں۔ پہلے کی طرح بچہ کو معمولی سادہ لباس پہنایا جائے، کافی دیر تک رونے کا موقع دیا جائے لیکن ساتھ ہی اس کے اسے فوراً اٹھ جانے کا بھی عادی بنایا جانا ضروری ہے۔ پیراکی کی تعلیم اپنی اور دوسروں کی جان بچانے کے لئے مفید ہے۔ بچہ کو کودنے پھاندنے، دوڑنے کا بھی کافی موقع دیا جانا چاہیئے۔ حواس کی تربیت اشیاء کا باہمی مقابلہ کرنے، فاصلوں کا اندازہ لگانے سے ہو سکتی ہے ماحول کی اشیاء کی نقشہ کشی سے ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ممکن ہے۔ گانے سے کانوں یا حس سماعت کی تربیت ہوتی ہے۔ اس طرح سے مفید پیرائے میں ہم بچہ کے حواس کی تربیت کر سکتے ہیں۔

تیسری کتاب میں روسو ۱۲ تا ۱۵ سال تک کے زمانہ کا حال بیان کرتا ہے اس کے خیال میں یہ زمانہ محنت مشقت، اکتساب اور مطالعہ کا ہے۔ چونکہ تین سال کی قلیل مدت میں بچہ کو کچھ زیادہ سکھایا نہیں جا سکتا اس لئے صرف

ضروری اور کار آمد باتوں کی تعلیم کی حد تک وہ اس زمانہ کی تعلیم کو محدود کرتا ہے۔

روسو ذاتی سعی اور ذاتی تجربہ کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ بچہ سے ایسے سوالات کرو جو اس کی سمجھ میں آسکیں، پھر اس کو سونچنے کا موقع دو، اس کو خود ہی تفہیم کرنے دو۔ اگر استدلال میں تم کسی مستند شخصیت کا حوالہ دو گے تو شاگرد سے وہ استدلال ہی کرنا چھوڑ دے گا۔ اسی وجہ سے جغرافیہ اور علم ہیئت کا موجودہ طریقہ تعلیم روسو کے خیال کے خلاف ہے کیونکہ ہم کرہ، نقشہ اور دیگر اشیاء سے مدد لیتے ہیں برخلاف اس کے روسو کا کہنا ہے کہ مختلف موسموں میں سورج کے طلوع و غروب اپنے شہر یا گاؤں کی نقشہ کشی سے مدد لی جائے۔ اگر بچہ کو سمت بتلانی مقصود ہو تو اس کو کسی جنگل میں تنہا چھوڑ دو۔ اب گھر جا نا اس کے لئے ضروری ہے۔ وہ سونچے گا کہ گھر سے نکلتے وقت سورج کہاں تھا۔ کدھر کو جا رہا تھا۔ اب کہاں ہے میرا گھر کدھر ہونا چاہیئے وغیرہ۔ اس طرح سے وہ خود غور و فکر کر کے اپنے مکان کا پتہ لگانے لگا۔ اور اس کو سمت کا خاصہ احساس ہو جائے گا۔ اسی طرح بچہ کو ٹھوس اور مائعات پر حرارت کے اثرات کے نتائج خود ہی معلوم کرنے دیئے جانا چاہیئے اس سے وہ تپش پیما اور دیگر آلات کے سمجھنے کا اہل ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روسو کتابوں کو غیر ضروری خیال کرتا ہے البتہ وہ صرف ایک کتاب (ROBINSON CRUSOE) کو اپنے مقصد کے لئے پسند کرتا ہے۔ روسو کے خیال کے مطابق تمام قسم کے مضامین کی تعلیم اسی طرح تجربی طور پر دی جاسکتی ہے۔ اس کتاب میں وہ تجارت کی طرف بھی اپنی توجہ دیتا ہے۔ اور اس کیلئے دستی مشاغل کو شامل کرتا ہے۔ روزی کمانے کا سوال اس طرح سے ایک بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے۔

اب ایمل کی عمر پندرہ سال کی ہے۔ اس کی خاصی جسمانی تربیت ہو چکی ہے۔ اب اخلاقی تربیت کی ضرورت ہے اس کا حال چوتھی کتاب میں درج ہے۔ روسو کا رجحان اب تک خود سعی، ذاتی دلچسپی اور خود سے ترقی کرنے کی طرف تھا۔ اب ضرورت ہے کہ ایمل سماج میں رہنا سیکھے اور سماجی تعلقات پیدا کرے۔ اسی مقصد کے تحت وہ ایمل کے دوا خانوں، جیل خانوں اور تھیٹروں کے جانے کو پسند کرتا ہے لیکن ایک حد تک۔ اس خیال سے کہ اگر بالکل ڈھیلی ڈوری چھوڑ دی گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ایمل من چلا اور عیش پرست بن جائے۔ اس چیز کو روکنے کے لئے وہ تاریخ پڑھانے کا مشورہ دیتا ہے کیونکہ تاریخ انسان میں خراب جذبات پیدا نہیں کرتی۔ روسو قدیم زمانہ کی تاریخ پر زور دیتا ہے۔ پندرہ سے بیس سال تک خود نمائی عروج پر رہتی ہے۔ اس لئے وہ ایمل کو خوشامدیوں اور مسرف آدمیوں سے دوچار کراتا ہے تاکہ وہ ذاتی طور پر ان کی صحبتوں کے برے نتائج سے واقف ہو جائے۔ اس زمانہ میں روسو ایمل کو اپنے فطری مذہب کی بھی تعلیم دیتا ہے۔

ایمل اب بڑا ہو چکا ہے۔ اس کے لئے ایک رفیق زندگی کی ضرورت ہے۔ اس لئے آخری کتاب میں جو ایمل

کتاب کا ضمیمہ کہلائی جاسکتی ہے ۔ ایک عورت صوفی کی تعلیم و تربیت کا ذکر کیا گیا ہے ۔ یا بالفاظ دیگر یہ کتاب عورتوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہے۔ اب تک روسو انفرادی آزادی کا راگ الاپتا رہا لیکن اب وہ اپنے خیال کی تردید کرتا ہے ۔ اور کہتا ہے کہ عورتوں کو تمام تعلیم مرد کی مناسبت سے دی جانی چاہیئے ۔ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی جسمانی تعلیم دی جانی چاہیئے ۔ ایک تو اس خیال سے کہ وہ صحت مند بچے پیدا کر سکیں ۔ اور دوسرے اچھی صحت ان کے حسن کو برقرار رکھے گی جو مرد کیلئے ضروری ہے ۔ ان کو سینا ۔ پرونا ۔ زردوزی اور اسی قسم کے دوسرے اور کام اس لیے سکھلانا ضروری ہے کہ وہ اچھے اور خوش وضع لباس پہنکر مردوں کو خوش کر سکیں ۔ عورتوں کو مردوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کا سبق پڑھایا جانا چاہیئے ۔ ہر بیٹی کو اپنی ماں کا اور ہر بیوی کو اپنے شوہر کا مذہب اختیار کرنا لازمی ہے ۔ ایک عورت کے لیئے یہ ضروری نہیں کہ وہ فلسفہ فن، یا سائینس کی تعلیم حاصل کرے بلکہ اس کے لیئے مردوں کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ وہ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کر سکے جس سے وہ خوش ہوں ۔

ایمل کے محاسن اور مصائب

ایمل جیسا کہ ہم ابھی اوپر دیکھ آئے ہیں غیر منطقی بے ربط اور غیر مستقل خیالات پر مبنی ہے ۔ اس میں روسو آہستہ آہستہ رجائیت سے قنوطیت اور خودی سے شخصیت کی طرف مائل ہوتا گیا ہے ۔ ایک طرف تو وہ سوسائٹی کی برائی کا نوحہ پڑھتا ہے اور دوسری طرف افراد کی نیکیوں پر رطب اللسان ہے ۔ اگرچہ کہ بظاہر ایمل کی تعلیم و تربیت میں اس کی جبلتوں کو ہر قسم کی آزادی دی گئی ہے لیکن مستقل طور پر استاد ہی رہبری کرتا ہے، ایک جگہ روسو کہتا ہے کہ ایمل کو سوسائٹی سے دور رکھا جائے لیکن بعد میں خود ہی اس کو میلوں، تھیٹروں اور مجلسوں میں شرکت کا مشورہ دیتا ہے ۔ انسانی انفرادی آزادی کی شروع سے آخر تک تائید کرتا ہے ۔ لیکن صوفی کی تعلیم میں انفرادیت کا کچھ لحاظ نہیں کرتا ۔ باوجود ان تمام تضاد باتوں کے ایمل کو روسو کا شاہکار مانا جاتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روسو کے اعلیٰ و ارفع تجویزی خیالات، جذبات کو اپیل کرنے والی باتیں، صاف جوشیلے اور سادہ طریقہ اظہار نے اس کے تضاد خیالات اور منطقی خامیوں کو پوشیدہ کر دیا ہے ۔

سب سے بڑا اعتراض ایمل پر یہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی سماج کی مخالفت میں انتہا پسندی سے کام لیا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں وہ پندرہ سال تک بچہ کو سوسائٹی سے الگ رکھتا اور اس کے بعد سوسائٹی سے روشناس کرواتا ہے ۔ سماج سے ہٹ کر تعلیم دینے کا خیال بے معنی سا ہے کیونکہ قومی تجربات و محصلات کا ذخیرہ انسان کی تعلیم و تربیت میں بہت ہی ممد و معاون ہوتا ہے ۔ روسو اس معاملہ میں نظریۂ ترتیب زمانی کا قائل ہے ۔ جو اپنی کمزوریوں کے باعث ہر طرح سے مسترد کر دیئے جانے کے قابل ہے ۔ بہرحال ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ زمانہ اور واقعات کا لحاظ کرتے

ایک مصلح کے لئے اسی قسم کی مخالف آواز کا بلند کرنا ضروری تھا اور حالات زمانہ اسی قسم کی انتہا پسندی کے مقتضی تھے۔ بنابریں روسو کی شخصیت پر اس اعتراض سے دھبہ نہیں لگ سکتا۔

اس کے علاوہ ایمل پر اور بھی کئی اعتراض کئے جا سکتے ہیں مثلاً یہ کہ روسو کتاب کی تعلیم کے خلاف شخصی مشاہدہ اور نتیجہ کا حامی ہے گویا اس طرح سے وہ بچہ کو اس کے ساتھیوں اور پیش رؤں کے تجربات سے محروم رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ ابتدائی تعلیم میں مشاہدہ اور تجرباتی کام میں ترقی پیدا کرتا ہے اور جسمانی ورزش پر زور دیتا ہے جو بچہ کی ترقی کیلئے ہر لحاظ سے ضروری ہے۔

اگرچہ کہ روسو کو بچہ کے متعلق بہت کم علم تھا لیکن پھر بھی اس نے بچہ کی اہمیت کو واضح کر کے دنیا کو ایک نئے اصول سے روشناس کروایا۔ اور آج ہم اس کے بتلائے ہوئے اصول کو ترقی دیکر تعلیمات میں اپنی پوری توجہ بچہ کی طرف دیتے ہیں گویا اس طرح سے روسو نے مصلحین تعلیم کے لئے ایک نیا راستہ پیدا کر دیا۔

چوتھی کتاب میں مذہب کی تعلیم کے متعلق روسو یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ جب تک بچہ پورے طور پر سمجھنے کے قابل نہ ہو جائے اس کو مذہبی تعلیم سے دور رکھا جانا ہی مناسب ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بچہ کو پندرہ سال کی عمر تک اخلاقی، سماجی اور مذہبی تعلیم سے بے بہرہ رکھیں، ان چیزوں کا اثر شروع ہی سے بچہ پر ہونے لگتا ہے۔ روسو کے یہ خیالات صرف نظری حیثیت رکھتے ہیں۔ ورنہ ان کا عمل ناممکن ہے۔

یہ چند اعتراضات ہیں جو بالعموم ایمل پر کئے جاتے ہیں لیکن جب ہم اس کے محاسن و مصائب کا توازن کرتے ہیں تو محاسن کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ دراصل ایمل ایک ایسی زبردست اور اہم کتاب ہے کہ جس نے یورپ کی بلکہ ساری دنیا کی تعلیمی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اگر صرف چند خامیوں کی بنا پر اس کو برا کہا جائے تو اس سے بڑھکر اور کیا بھاری غلطی ہو سکتی ہے۔

روسو کے اثرات سماج، ادب اور تعلیم پر

ایمل جیسی اعلیٰ پایہ کی کتاب مطلق العنان حکومت کے دست تظلم سے نہ بچ سکی۔ شائع ہونے کے ایک ماہ بعد ہی اس کو ضبط کر کے جلانے اور اس کے مصنف کو دہریت کے الزام میں گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا۔ سوربورن کے مذہبی، مقتداؤں اور پیرس کے اسقف اعظم نے بھی اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ بیچارے روسو کو مانٹمورنسی سے بھاگ جانا پڑا اور مرتے دم تک غریب ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اور آخر عمر میں وہ بہت کچھ بہک بھی گیا تھا۔ سوئٹزرلینڈ میں جہاں کہیں بھی وہ گیا اس کی گرفتاری کے متعلق حکم دیا گیا۔ بالآخر فلسفی ہیوم کے بلانے پر وہ انگلستان چلا گیا۔ یہاں آنے کے بعد

اس کے دل میں شک پیدا ہوا کہ شاید مجھے یہاں دھوکے سے بلایا گیا ہے اس ہیجا تخیل نے اسے پھر سے فرانس واپس کر دیا۔ اس کے بعد وہ کوئی دس برس تک فرانس کے اطراف و جوانب میں ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر ۱۷۷۸ء میں انتقال کر گیا۔

روسو کے کارنامے، اس کی مہتم بالشان تصانیف جن کے اندر اعلیٰ جذبات غریب طبقہ کو ابھارنے کے متعلق سنجیدہ خیالات، سماج کی برائیوں کا حال، جدید فطری نظام حکومت کی ضرورت کے متعلق تجاویز اور سب سے بڑھکر صداقت اور خلوص موجود تھا دنیا سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے (اقبال)

اگرچہ کہ روسو کی زندگی میں ان پر کچھ زیادہ توجہ نہ دی گئی لیکن بعد کو عوام نے ان کی قدر کی، ان کے اصولوں کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اور ان کو عملی صورت دیکر ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

روسو کی تصانیف کا ۱۸ ویں صدی کے آخری حصہ اور انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ کے ادب پر خاصہ اثر پڑا۔ اور RONANAIEISM کو ترقی دینے میں یہ بہت مدد و معاون ہوئیں۔ روسو نے قدرتی مناظر سے ادب کو سب سے پہلی دفعہ روشناس کرایا۔

روسو کی وجہ سے خصوصاً فرانس اور عام طور پر یورپ کی تعلیمی زندگی بہت متاثر ہوئی، السنہ قدیمہ کی اہمیت گھٹ گئی اور مادری زبان کو فوقیت دی جانے لگی۔ اگرچہ کہ کمنیس اور لاک نے بھی سترھویں صدی میں مادری زبان کے متعلق خیالات ظاہر کئے تھے لیکن روسو کی فطری تحریک نے اس خیال میں ایک جان ڈالدی اس کے علاوہ یورپ کی عام تعلیمی حالت میں جو انجماد تھا روسو کی فطری تحریک نے اس میں ہیجان پیدا کر دیا اور یہ تحریک ایک بڑی حد تک موجودہ زمانہ کی تعلیم کا سنگ بنیاد خیال کی جا سکتی ہے اس تحریک کا سب سے زیادہ اثر اس زمانہ کے تعلیمی اداروں پر پڑا اور اکثر و بیشتر ادارے فطری تحریک کے موافق بن گئے۔

روسو کے خیالات کا نظم و نسق، طریقہ تعلیم اور مواد تعلیم پر بہت ہی گہرا اثر ہوا ہے۔ گو روسو کا نصب العین تخریبی تھا لیکن اس کے تعلیمی اصول بہت ہی کارآمد اور مفید تھے۔ اس سے قبل ایک خاص محدود طبقہ کو تعلیم دی جاتی تھی، غریب تعلیم سے بالکل محروم تھے لیکن روسو نے بتلایا کہ سوسائٹی کی بھلائی اور برائی کا انحصار افراد پر ہے۔ جب تک افراد کو تعلیم نہ دی جائے سوسائٹی کسی حالت میں اچھی نہیں ہو سکتی۔ اس نے عام تعلیم کا آوازہ بلند کیا اور تعلیم انسانی بھلائی

کے لئے مفید تصور کی جانے لگی۔

پہلے بچہ اور بالغ کے لئے طریقۂ تعلیم میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن جب روسو نے بچہ کی زندگی کے مدارج اور اس کی انفرادی اہمیت کو واضح کر دیا تو بچہ کی آزادی اور اس کی نفسیاتی ترقی پر توجہ دی جا کر تعلیم دی جانے لگی۔ مطالعۂ قدرت اور قدرتی ماحول سے استفادہ کرنے کا سبق ہم نے ایمیل ہی سے پڑھا ہے!

روسو نے سماج، ادب اور تعلیم پر جو احسانات کئے ہیں دنیا اس کو مدت العمر بھول نہیں سکتی ہے۔ اس کے وضع کردہ اصول آج بھی ہمارے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں، اس نے بالخصوص تعلیمات کے باب میں ایسی مستحکم بنیاد ڈالی ہے کہ اس پر آنے والی نسلیں عالیشان سے عالیشان عمارت تعمیر کر سکتی ہیں۔ روسو کی تصانیف جو اس کی زندگی میں اس کی جان کی دشمن بن گئی تھیں آج اپنے مصنف کو حیات جاوید بخش رہی ہیں اور رہتی دنیا تک اس کے نام کو روشن رکھیں گی۔

"یہ چاقو تو یار بڑے خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے ان میں سے ایک لے لوں۔"

کامتا پرشاد نے ہنسکر کہا۔ "تم کیا کروگے"۔

"کروں گا کیا۔ رکھے رہوں گا۔"

"یہ تو چیر پھاڑ کے کام کے ہیں"۔

"ہاں۔ ہاں۔ نہیں تو کیا۔ ان سے بھاجی ترکاری تھوڑے بنائی جائے گی؟ مجھے اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔ اس لئے جی للچا رہا ہے۔"

"تو ایک لے لو!"

"تمہارا سیٹ (SET) تو خراب نہ ہوگا؟"

"نہیں سیٹ خراب نہیں ہوگا۔ میں نے ایک چاقو زیادہ منگا لیا تھا۔"

"تب ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ریونی شنکر نے ایک چاقو لے لیا اور اس کی دھار پر آہستہ آہستہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا

"بڑے تیز ہیں۔"

"جراحی میں تیز چاقو ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنے ہی تیز اوزار ہوں گے۔ اسی قدر آپریشن جلد اور اچھا ہوگا۔"

ریونی شنکر نے چاقو کو ایک کاغذ میں اچھی طرح لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا:

"اگر مڑنے والا چاقو ہوتا تو اور بھی اچھا ہوتا۔"

"جراحی میں جو چاقو استعمال کئے جاتے ہیں وہ مڑنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔"

"خیر! یہ تو کہو کہ کچھ بیمار آنے لگے یا نہیں؟"

"ابھی بیٹھے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں!"

"ایک مہینے سے تو زیادہ ہوگیا ہوگا۔"

"تو پھر؟ کیا بہت دن ہو گئے؟ سال چھ مہینے میں کچھ کام چمکے گا۔ ابھی تو صرف حاضری ہے۔"

"کچھ ہرج نہ ہو تو آؤ چلیں گھوم آویں۔"

"مجھے کام ہی کونسا ہے؟ چلو چلیں۔ کدھر چلو گے؟"

"چلو ادھر بازار کی طرف چلیں۔"

"بازار کی طرف چل کے کیا ہوگا؟ چلنا ہے تو باہر کی طرف چلو۔ شام کا وقت ہے کھلی ہوا کا لطف اٹھائیں۔"

"بس تم تو وہی ڈاکٹری کی باتیں کرنے لگے۔ کون ہم روگی یا کمزور ہیں؟ یہ سبق آپ بیماروں کے لئے ہی رکھئے"

"کھلی ہوا تو سب کے لئے فائدہ مند ہے۔ اس میں صحت والوں یا بیماروں کی کونسی تخصیص ہے؟"

"خیر اس وقت بازار کی طرف چلو۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

"اچھی بات ہے! جیسی تمہاری مرضی!"

کامتا پرشاد نے اوزاروں کو بکس میں بند کرکے الماری میں رکھ دیا اور نوکر سے بولے:

"رام دھن ہم گھومنے جاتے ہیں۔ تم ساڑھے سات بجے دواخانہ بند کرکے کنجی گھر پہنچا دینا" یہ کہہ کر کامتا پرشاد نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور ریوتی شنکر سے بولے: "چلو"

دونوں دوست چل دئے اور گھومتے پھرتے چوک پہنچے۔ چوک میں قدم رکھتے ہی ریوتی شنکر نے کہا: دیکھئے کتنی رونق ہے! جنگل میں یہ مسرت کہاں؟"

کامتا پرشاد نے مسکرا کر جواب دیا: "اس میں کیا شک ہے۔ جنگل میں تو یہ بھیڑ بھاڑ نہیں ملے گی!"

"آدمیوں ہی کی تو رونق ہوتی ہے۔ جہاں آدمی نہیں وہاں کیا رونق ہو سکتی ہے؟"

"اپنے اپنے مذاق کی بات ہے کسی کو یہ پسند ہے کسی کو وہ۔"

اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے یہ دونوں دوست آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ ریوتی شنکر نے کامتا پرشاد کا ہاتھ دبا کر کہا: "ذرا اِدھر تو دیکھو!"

کامتا پرشاد نے اوپر نگاہ اٹھائی۔ ایک چھکلہ پر ایک بیسوا بیٹھی ہوئی تھی۔ جو نوجوان اور از حد خوبصورت تھی کامتا پرشاد نے کہا:

"یہ کون ہے؟ پہلے تو اسے کبھی نہیں دیکھا"

"معلوم ہوتا ہے کہیں باہر سے آئی ہے"

"بڑی خوبصورت ہے"

"کیا کہنے ہزاروں میں ایک ہے!"

"مگر کس کام کی؟"

"کیوں؟"

"ویشیا کی خوبصورتی تو اس پھول کی طرح ہے جو دیکھنے میں تو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر بے رس اور خوشبو

سے محروم ہے۔"

"اب لگے فلسفہ بگھارنے، انہیں باتوں سے تو مجھے نفرت ہے۔"

"جھوٹ تھوڑے ہی کہتا ہوں؟"

"رہنے دیجئے۔ بڑے صداقت پسند بنے ہیں؟"

"اچھا نہ سہی!"

"بولو چلتے ہو؟ پانچ منٹ بیٹھکر چلے آئیں گے جان پہچان ہو جائیگی۔"

"اجی بس رہنے بھی دو"

"تمھیں ہماری قسم، صرف پانچ منٹ کے لئے!"

"اس وقت جانے دو۔ پھر کسی دن سہی!"

ریوتی شنکر نے خیال کیا کہ کامتا پرشاد کی خواہش تو ہے۔ مگر صرف ظاہرداری کے لئے انکار کر رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے کہا:

"پھر پھر کا جھگڑا میں نہیں پالتا۔ تم جانتے ہو میرے جی میں جو آتا ہے وہ میں فوراً کرتا ہوں۔"

کامتا پرشاد نے کہا: "تو یہ کون اچھی بات ہے؟"

"نہ سہی۔ مگر اپنا طریقہ تو ہے۔"

"کہا مانو اس وقت ٹال جاؤ"

"ٹالنے والے پر لعنت ہے!"

"افوہ! اتنے محو ہو گئے؟ اچھا واپسی کے وقت سہی۔ اُس وقت تک ذرا اور اندھیرا ہو جائے گا۔"

"ہاں۔ یہ مانی!"

دونوں اشخاص ٹہلتے ٹہلتے آگے بڑھ گئے اور آدھ گھنٹے تک اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد لوٹے۔ اس وقت سات بج چکے تھے اور خاصا اندھیرا ہو چکا تھا جب یہ دونوں اس مکان کے نیچے آئے تو ٹھیر گئے۔ ریوتی شنکر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کھٹ سے زینہ پر چڑھ گئے۔ کامتا پرشاد نے بھی ان کی تقلید کی۔

(۲)

اس واقعہ کے بعد ایک مہینہ گذر گیا۔ ریوتی شنکر اس ویشیا کے یہاں آنے جانے لگے۔ ان کے ساتھ کامتا پرشاد

بھی کبھی چلے جاتے تھے ایک روز شام کے وقت ریوتی شنکر اس ویشیا کے یہاں پہنچے۔ ویشیا نے جس کا نام "سندر بائی" تھا ریوتی شنکر سے پوچھا کہ: "ڈاکٹر صاحب نہیں آئے؟"

"ہاں نہیں آئے!"

"وہ بہت کم آتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"وہ میرے ساتھ چلے آتے ہیں۔ ورنہ وہ ویشیاؤں کے یہاں بہت کم آتے جاتے ہیں۔"

سندر بائی رنجیدہ ہوکر خاموش ہوگئی۔ ریوتی شنکر نے پوچھا:

"کیوں ڈاکٹر صاحب کی کیوں یاد آئی؟"

"ڈاکٹر صاحب بھلے آدمی ہیں۔ مجھے وہ بڑے اچھے لگتے ہیں۔"

ریوتی شنکر کے دل میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی۔ انہوں نے پوچھا:

"اُن کے آنے سے تمھیں کچھ خوشی ہوتی ہے؟"

"ہاں ضرور ہوتی ہے"

"اور میرے آنے سے؟"

"آپ کے آنے سے بھی ہوتی ہے"

ریوتی شنکر نے سندر بائی کی صورت کا حال دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ انہوں نے کہا:

"نہیں میرے آنے سے نہیں ہوتی۔"

"کیوں آپ میرا کچھ چھین لیتے ہیں کیا؟" سندر بائی نے مسکرا کر کہا! ریوتی شنکر سندر بائی سے ایک محبت سے لبریز جواب سننا چاہتے تھے۔ مگر جب اُس نے صرف ایک خشک بات کہہ کر خاموشی اختیار کرلی تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی ان کے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ سندر بائی ضرور ڈاکٹر صاحب سے پریم کرتی ہے اس شبہ کے ہوتے ہی کامتا پرشاد کے خلاف اُن کے دل میں نفرت پیدا ہوگئی ریوتی شنکر نے اسی وقت آمادہ کیا کہ اس بات کی جانچ کرنی چاہیئے۔

اس دن وہ تھوڑی ہی دیر بیٹھ کر چلے آئے۔ دوسرے دن وہ کامتا پرشاد کے پاس پہنچے۔ اُن سے انہوں نے کہا:

"کل سندر بائی تمھیں یاد کر رہی تھی۔"

کامتا پرشاد نے متعجب ہوکر پوچھا:

"مجھے یاد کر رہی تھی؟"

"جی ہاں!"

"بھلا مجھے وہ کیوں یاد کرنے لگی؟ تمہارے ہوتے ہوئے اس کا مجھے یاد کرنا تعجب کی بات ہے!"

ریوتی شنکر نے کہا: "کیوں؟ مجھ میں کون لعل لگے ہیں؟"

"لعل کیوں نہیں لگے ہیں؟ تم سے اُسے چار پیسے کی آمدنی ہے میرے پاس کیا دھرا ہے! تم نے ابھی تک اُسے سو دو سو دے ہی دئے ہوں گے میں نے کیا دیا؟"

"پھر بھی وہ تمھیں یاد کرتی تھی"

"اس لئے یاد کرتی ہو گی کہ اُن سے کچھ نہیں ملا، کچھ وصول کرنا چاہیئے سو یہاں وہ گڑ ہی نہیں جسے چیونٹیاں کھائیں۔"

"خیر جو کچھ ہو۔ آج تم میرے ساتھ چلو"

"معاف کرو"

"نہیں آج تو چلنا پڑے گا"

"بھائی صاحب میری اتنی حیثیت نہیں کہ ویشیاؤں کے یہاں جاؤں۔ میں غریب آدمی ہوں۔ یہ کام تو آپ جیسے مالدار لوگوں کا ہے۔"

"تو وہ کون تم سے نقد مانگتی ہے"

"مانگے کیسے، جب کچھ گنجائش پاوے تب تو مانگے؟ آپ کی طرح میں بھی روز آنے جانے لگوں تو مجھ سے بھی سوال کرے"

"اجی نہیں۔ یہ بات نہیں۔ اچھا خیر۔ آج تو چلے چلو۔"

"معاف کرو"

"ارے تو آج جانے سے تمہاری قرقی نہ کرا لیگی"

"نہیں یہ بات نہیں"

"تو پھر؟"

"ویسے ہی، جہاں تک بچوں اچھا ہے"

"آج تو چلنا ہی پڑے گا"

"خیر تم ضد کرتے ہو تو چلا چلوں گا۔"

دونوں سندر بائی کے مکان پر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی سندر بائی کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے بڑی محبت سے ان کا استقبال کیا۔

ریوتی شنکر سندر بائی کے عادات واطوار کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے سندر بائی نے پوچھا: "ڈاکٹر صاحب آپ ہم سے کچھ ناراض ہیں کیا؟"

"نہیں ناراض ہونے کی کیا بات ہے"

"تو پھر آتے کیوں نہیں؟"

"ایک تو فرصت نہیں ملتی دوسرے ہم غریبوں کی پرسش آپ کے یہاں کہاں؟"

سندر بائی نے کچھ شرمندہ ہو کر کہا: "نہیں آپ کی یہ غلط فہمی ہے ہم بھی آدمی کو پہچانتے ہیں۔ ہر ایک آدمی سے ویشیا پن کا طریقہ کام نہیں دیتا۔"

"آپ میں یہ خصوصیت ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ ورنہ بالعموم ویشیاؤں کی یہی حالت ہے کہ ان کے یہاں مالدار آدمی ہی کی قدر ہوتی ہے۔"

"نہیں میرے متعلق آپ کبھی ایسا نہ سوچئے گا۔"

"خیر۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ میں یہ عیب نہیں ہے"

جب تک کامتا پرشاد بیٹھے رہے، تب تک سندر بائی انہیں سے باتیں کرتی رہی۔ ریوتی شنکر کو اس کا یہ برتاؤ بہت ہی بُرا لگا۔ ایک گھنٹہ کے بعد کامتا پرشاد نے کہا: "اب مجھے اجازت دیجئے۔"

سندر بائی نے کہا: "آیا کیجئے"

"ہاں آیا کروں گا۔" یہ کہکر کامتا پرشاد نے ریوتی شنکر سے مخاطب ہو کر کہا: "چلتے ہو؟"

"تم جاؤ۔ میں ذرا دیر بیٹھوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" یہ کہکر کامتا پرشاد چل دئے۔ ان کے جانے کے بعد سندر بائی نے ریوتی شنکر سے کہا: "بڑے شریف آدمی ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں!" ریوتی شنکر نے روکھے پن سے کہا۔

دونوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ریوتی شنکر سندر بائی کے قریب کھسک کر بولے:

"سندر بائی میں تم سے کتنا پریم کرتا ہوں۔ یہ شاید ابھی تمھیں معلوم نہیں ہوا"

سندر بائی نے کہا: "یہ آپ کی کرپا ہے"

ریوتی شنکر نے پھر کہا: "صرف اس کے کہنے سے مجھے اطمینان نہیں ہوسکتا پریم ہمیشہ پریم کا معاوضہ چاہتا ہے
سچا چاہتا ہوگا۔ مجھے تو ابھی تک اس کا یقین نہیں ہوا۔"

"اب ہونا چاہیئے"

"اپنے بس کی تھوڑے ہی بات ہے"

"میں تمھارے ہر ایک خواہش اور ہر ایک حسرت کو پورا کرنے کے لئے تیار رہتا ہوں۔ پھر بھی تمھیں میرے پریم پر شک ہے!"

"نہ مجھے شک ہے نہ وسواس ہے۔ آپ میری خاطر کرتے ہیں تو میں بھی آپ کی خاطر کرتی ہوں۔"

"صرف خاطر سے مجھے اطمینان نہیں ہوسکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ جیسے میں تم سے پریم کرتا ہوں ویسے ہی تم بھی مجھ سے پریم کرو۔"

"یہ تو میرے بس کی بات نہیں۔"

"ہونا چاہیئے۔"

"چاہیئے تو سب کچھ پر جب ہو تب نا؟ ویسے اگر ہمارے پیشہ کی بات پوچھئے تو ہم ہر ایک آدمی سے یہی کہتے ہیں کہ ہم جتنا پریم کرتے ہیں۔ اتنا کسی سے بھی نہیں کرتے۔ مگر میرا یہ دستور نہیں ہے میں تو صاف بات کہتی ہوں۔ آپ ہمارے اوپر روپیہ خرچ کرتے ہیں ہم اس کا بدلہ دوسری طرح چکا دیتے ہیں جھگڑا طے ہوا۔ رہا عشق اور محبت کی بات سو یہ دل سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ کا زور ہمارے جسم پر ہے دل پر نہیں!"

ریوتی شنکر چپ ہو گئے۔ انہوں نے دل میں سوچا' یہ ضرور کامتا پرشاد سے محبت کرتی ہے تبھی ایسی صاف صاف باتیں کرتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی ان کے دل میں کامتا پرشاد کے متعلق انتہائی بدگمانی پیدا ہوگئی کچھ دیر بعد انہوں نے کہا:۔

"شاید تمھیں کسی سے اب تک محبت نہیں ہوئی۔"

سندر بائی نے ہنس کر کہا: "اگر محبت ہوئی ہوتی تو ہم اس طرح بازار میں بیٹھے ہوتے؟ آپ بچوں کی طرح سی باتیں کرتے ہیں۔ ہمارے پیشے اور ہماری محبت میں دشمنی ہے۔ جو جس سے محبت کرتا ہے وہ اسی کا ہوکر رہتا ہے

ریوتی شنکر کو سندر بائی کے اس جواب پر اگرچہ یقین نہ آیا۔ مگر کچھ اطمینان ضرور ہوا اور انہوں نے کہا :

"خیر مجھ سے تو تمھیں پریم ضرور کرنا ہی پڑے گا۔"

سندر بائی نے مسکرا کر جواب دیا :

"اگر کرنا پڑے گا تو کروں گی۔ پر جب کروں گی تو دل کی مجبوری سے زبردستی کوئی کسی سے پریم نہیں کرا سکتا۔"

(۳)

ایک دن سندر بائی کی ماتا کو ہیضہ ہو گیا۔ سندر بائی نے ڈاکٹر کامتا پرشاد کو بلوایا۔ کامتا پرشاد نے بڑی محنت سے اُسے اچھا کیا۔ جس وقت سندر بائی نے ڈاکٹر کامتا پرشاد کو فیس دینا چاہی تو انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا :

"میں اتنی بار تمھارے یہاں آیا، پان، الائچی کھاتا رہا، گانا سنتا رہا میں نے تمھیں کیا دیا؟ اس لئے میں تم سے فیس نہیں لے سکتا۔"

اُس دن سے کامتا پرشاد کی عزت اور زیادہ ہونے لگی جوں جوں کامتا پرشاد کی عزت بڑھتی جاتی تھی اسی قدر ریوتی شنکر جل بھن کر راکھ ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ میں اتنا روپیہ پیسہ خرچ کرتا ہوں پر میری اتنی خاطر تواضع نہیں ہوتی۔ جتنی کہ کامتا پرشاد کی ہوتی ہے۔ کامتا پرشاد کو دیکھ کر سندر بائی خوش ہو جاتی ہے۔ جب میں جاتا ہوں تو وہ اگرچہ مسکرا کر میرا استقبال کرتی ہے مگر وہ بات نہیں رہتی۔ مجھ سے وہ کھنچی کھنچی رہتی ہے۔"

یہ بات حقیقت میں سچ تھی۔ سندر بائی واقعی ریوتی شنکر سے کھنچی رہتی تھی۔ اس کے دو وجوہ تھے۔ ایک تو اسے ریوتی شنکر پسند نہ تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر کھنچاؤ تھا۔ دوسرے خود غرضی کی وجہ سے بھی وہ کھنچی رہتی تھی۔

سندر بائی کو اپنی صورت شکل پر اس قدر بھروسہ اور ناز تھا کہ وہ ان لوگوں سے جو اس پر محو ہو جاتے تھے کچھ کھنچے رہنے میں ہی زیادہ فائدہ مند سمجھتی تھی۔ جہاں تک ریوتی شنکر کا تعلق ہے۔ اس کا یہ طریقہ بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوا۔ ریوتی شنکر اسے خوش کرنے اور اپنے پر مہربان بنانے کے لئے! اور دل میں صرف مہربان بنانے ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی محبت اس کے دل میں پیدا کرنے کے لئے اس کی ہر ایک خواہش کو فوراً پورا کرتے تھے۔ جس کا یہ نتیجہ تھا کہ سندر بائی کو اُن سے خاصی آمدنی تھی۔

اس کے برخلاف کامتا پرشاد سے سندر بائی کا طرزِ عمل بالکل مختلف تھا۔ سندر بائی تو پہلے ہی سے کامتا پرشاد کی نیک چلنی، ملنساہت، خوش مذاقی اور صاف گوئی پر فریفتہ تھی۔ اس کے علاوہ کامتا پرشاد خوبصورت بھی بہت تھا۔ اس کا مردانہ حسن اور متناسب الاعضا بدن ریوتی شنکر سے بدرجہا بہتر تھا۔ مگر سب سے زیادہ جس بات نے

سندر بائی پر اثر ڈالا وہ اس کی جولانی اور خوبصورتی کی طرف سے کامتا پرشاد کا استغنا تھا! کامتا پرشاد کی کسی بات سے یہ کبھی ظاہر نہ ہوا کہ وہ سندر بائی پر عاشق ہیں سندر بائی کے لئے یہ ایک نئی اور تعجب خیز بات تھی۔ آج تک جتنے لوگ اس کے پاس آئے وہ سب اس کی شمع حُسن پر پتنگ کی طرح گرے۔ مگر کامتا پرشاد پر اس کے حسن کا جادو نہ چلا۔ دوسرے آدمیوں کے مقابلہ میں وہ اپنے حُسن و نزاکت پر ناز کرتی تھی۔ مگر کامتا پرشاد کے سامنے اسے اپنی خوبصورتی کا یقین نہیں رہتا تھا۔ بلکہ وہ انہیں کے حُسن میں محو ہو جاتی تھی۔

سچی شرافت و فضیلت ہمیشہ انسانوں کو مرعوب کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کامتا پرشاد پر سندر بائی اور بھی گرویدہ تھی۔

وہاں سندر بائی کا یہ حال تھا اور ادھر ریوتی شنکر اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے سندر بائی کسی دوسرے مرد کی طرف دیکھے ہی نہیں

جہاں ریوتی شنکر کا سندر بائی کی محبت میں یہ حال تھا۔ ادھر سندر بائی کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی کامتا پرشاد کئی دنوں تک اس کے ہاں نہ جاتے تو وہ بیمار ہونے کا بہانہ کر کے انہیں بلواتی تھی۔ اس وقت کامتا پرشاد کو صرف اپنے پیشہ کے خیال سے جانا ہی پڑتا تھا۔

ایک دن ریوتی شنکر شام ہونے کے بعد سندر بائی کے یہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ سندر بائی کامتا پرشاد کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہے اور کامتا پرشاد اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی کچھ لمحوں کے لئے ریوتی شنکر کے آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ ادھر انہیں دیکھتے ہی کامتا پرشاد نے جلدی سے اس کا سر اپنے زانو پر سے ہٹا دیا اور ریوتی شنکر کی طرف دیکھ کر کچھ جھینپے ہوئے سے بولے:

"اُن کے سر میں بڑے زور کا درد تھا۔ اس لئے انہوں نے مجھے بلوایا۔ میں نے دوا لگائی ہے۔ اب کچھ کم ہے"

ریوتی شنکر کامتا پرشاد کو سٹ پٹاتے ہوئے دیکھ ہی چکے تھے اس لئے وہ سمجھے کہ کامتا پرشاد صرف بات بنا رہے ہیں۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ "آپ کے ہاتھ لگیں اور درد کم نہ ہو؟ یہ تو ایک اَن ہونی بات ہے!" یہ کہکر ریوتی شنکر نے سندر بائی پر ایک نگاہ ڈالی جس کی وہ تاب نہ لا سکی اور اس نے اپنی آنکھیں نیچی کریں۔

کامتا پرشاد کھڑے ہو گئے اور سندر بائی سے مخاطب ہو کر بولے: "تو میں اب جاتا ہوں تم تھوڑی دیر کے بعد ایک بار اور دوا لگا لینا"

یہ سنکر ریوتی شنکر نے طعن سے کہا "بیٹھے بیٹھے آپ کی موجودگی درد کو دور کرنے میں بڑی سہاتا دیگی"

اس طعن آمیز جملہ کو سنکر کامتا پرشاد کسی قدر رنجیدہ ہوکر بولے : "اس میں کیا شک ہے۔ ڈاکٹر سے لوگ ایسی ہی امید رکھتے ہیں ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔" اتنا کہکر کامتا پرشاد چل دیئے ۔

ان کے چلے جانے کے بعد ریوتی شنکر نے سندر بائی سے کہا :

"اب تو معمولی باتوں میں بھی ڈاکٹر بلائے جانے لگے ۔"

سندر بائی نے جواب دیا

"تو پھر ؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جب کوئی بستر مرگ پر پڑا ہو تبھی ڈاکٹر بلایا جائے ؟"

"نہیں نہیں ۔ آپ جب چاہیں بلائیں ۔ منع کون کرتا ہے ؟"

"منع کر ہی کون سکتا ہے ؟ میرا جو جی چاہے گا کروں گی ۔ میں کسی کی لونڈی باندی تو ہوں نہیں !"

ہونٹ چباتے ہوئے ریوتی شنکر نے کہا : "ٹھیک ہے ! منع کر ہی کون سکتا ہے ؟" دو تین بار ریوتی شنکر نے اس جملہ کو دہرایا ۔ ان کا منہ لال ہو گیا تھا اور آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں ۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سندر بائی کی کلائی پکڑ لی اور دانت پیستے ہوئے بولے :

"کون منع کر سکتا ہے ؟ میں منع کر سکتا ہوں ۔ جس نے اپنا تن، من، دھن تمھارے پیروں پر ڈال دیا ہے"

سندر بائی نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا :

"اجی بس جائیے ایسے یہاں دن بھر میں نہ جانے کتنے آتے ہیں !"

"آتے ہوں گے مگر میں تمھیں بتا دوں گا کہ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں ۔"

سندر بائی نے ایک جھٹکا دیکر اپنی کلائی چھڑا لی اور بلند آواز میں کہا : "تم بیچارے کیا دکھا دو گے ؟ ایسی دھمکی میں میں نہیں آسکتی تم ہوتے کون ہو ؟ وہی کہاوت ہوئی : منہ لگائے ڈومنی گائے تال بے تال ۔"

ریوتی شنکر نے کچھ نرم ہوکر کہا : دیکھو سندر بائی یہ باتیں چھوڑ دو ورنہ اس کا نتیجہ برا ہوگا ۔"

"کیا برا ہوگا ؟ تم کر کیا لو گے ؟ خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ یہاں سے چلے جائیے اور آج سے یہاں پیر نہ دھریے گا نہیں تو پچھتائیے گا ۔"

ریوتی شنکر نے متحیر ہو کر کہا :

"اچھا یہ بات ہے ؟"

"جی ہاں ! یہی بات ہے ۔ میں آپ کی بیوی نہیں ہوں ۔ یہ باتیں وہی سنیگی ۔ میں نہیں سن سکتی ۔ ہونھ !

اچھے آئے! ہم لوگ ایسے ایک ہی کے ہو کے رہیں تو بس ہو چکا۔"

ریوتی شنکر کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد یکدم اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:

"اچھی بات ہے۔ دیکھا جائے گا۔"

اتنا کہہ کر ریوتی شنکر چل دیئے۔

(۴)

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد ایک دن صبح کے وقت منہ ہات دھو کر کامتا پرشاد چا پی رہے تھے کہ پولس نے ان کا گھر گھیر لیا اور ایک سب انسپکٹر ان کے کمرہ میں گھس آیا۔ اُس نے آتے ہی کامتا پرشاد سے پوچھا: "ڈاکٹر کامتا پرشاد آپ ہی ہیں؟" کامتا پرشاد نے حیران ہو کر کہا: "ہاں میں ہی ہوں۔ کہئے؟"

سب انسپکٹر نے کہا "میں آپ کو سندر بائی کا خون کرنے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔"

کامتا پرشاد نے از حد پریشان ہو کر کہا: "سندر بائی کا خون!" کامتا پرشاد صرف اتنا ہی کہہ پائے، اس سے زیادہ ان کے منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ سب انسپکٹر نے ایک پولس کے جوان سے کہا:

"لگاؤ ہتکڑی!"

اس کے بعد سب انسپکٹر نے اس کمرہ کی تلاشی لی اور ایک کوٹ اور ایک قمیص برآمد کی۔ قمیص کے داہنے کف میں خون کا داغ لگا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے اسے دیکھ کر سر ہلایا۔ اس کے بعد کوٹ کو دیکھا۔ کوٹ کے دو بٹن غائب تھے۔ انسپکٹر نے اپنی جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور اس میں سے دو بٹن نکالے، ان بٹنوں کو کوٹ کے دوسرے بٹنوں سے ملا کر دیکھا دونوں بٹن کوٹ کے بقیہ بٹنوں کے موافق تھے۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر نے کہا:

"ٹھیک ہے!"

اس نے قمیص اور کوٹ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور اسی وقت کامتا پرشاد کے والد بھی آ گئے۔ انہوں نے جو بیٹے کو ہاتھوں میں ہتکڑی لگی دیکھی تو گھبرا کر پوچھا: "کیوں؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟" سب انسپکٹر نے جواب دیا: "کل رات میں سندر بائی نامی طوائف کا قتل ہو گیا ہے۔ یہاں کچھ ایسی چیزیں پائی گئیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سندر بائی کا خون کامتا پرشاد نے کیا ہے اس لئے وہ گرفتار کئے گئے ہیں۔"

کامتا پرشاد کے والد نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"نہیں نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا؟ آپ غلطی کر رہے ہیں۔"

"ہماری غلطی ثابت کرنے کے لئے آپ کو کافی موقع ملے گا گھبرائیے نہیں!"

"اس میں شک نہیں۔ پتاجی! آپ گھبرائیے نہیں، اس میں کوئی بڑا راز ہے۔ ہمیں عدالت کے سامنے کافی موقع ملیگا"

سب انسپکٹر نے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں دیا اور کامتا پرشاد کو ساتھ لیکر سیدھا ان کے دواخانہ پہنچا۔ کامتا پرشاد نے دیکھا کہ ان کے دواخانہ پر بھی پولس کا پہرا ہے۔ دواخانہ کی کنجی سب انسپکٹر کامتا پرشاد کے گھر سے لے آیا تھا۔ دواخانہ کھولا گیا اس کی تلاشی لی گئی اور وہ بکس نکالا گیا جس میں جراحی کے اوزار تھے۔ وہ بکس بھی سب انسپکٹر نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔

مقررہ وقت پر کامتا پرشاد کا مقدمہ شروع ہوا۔ پولس کی طرف سے چار چیزیں پیش کی گئیں۔ ایک تو وہ چاقو جس سے خون کیا گیا تھا، کامتا پرشاد کا کوٹ قمیص اور ایک رومال جس کے ایک کونے پر ان کا نام کاڑھا ہوا تھا۔ یہ رومال خون سے رنگا ہوا تھا۔ سرکاری وکیل نے عدالت کو وہ دونوں بٹن دکھائے۔ یہ بٹن اس کمرہ میں جس میں خون ہوا تھا پائے گئے تھے۔ اور دونوں کامتا پرشاد کے کوٹ کے بٹنوں سے بالکل ملتے جلتے تھے رومال پر تو ان کا نام ہی کاڑھا ہوا تھا قمیص کا کف پر خون کا داغ تھا۔ وہ چاقو جس سے جان لی گئی تھی کامتا پرشاد کے سرجری کے اوزاروں میں سے دو اور چاقوؤں سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے علاوہ پولس کی طرف سے چار گواہ پیش ہوئے تھے۔ دو مسلمان دوکاندار جنکی دوکانیں سندر بائی کے مکان کے نیچے ہی تھیں۔ سندر بائی کی ماں اور اُن کی ایک نوکرانی۔

نوکرانی نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا:

"جس دن وہ واردات ہوئی۔ اس دن شام کو ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ سندر بائی کی ماں نوکر کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھیں۔ مکان پر صرف میں اور سندر بائی تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے (۸½) بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آئے سندر بائی اور وہ بیٹھک کمرہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اس وقت کھانا پکا رہی تھی۔ آدھ گھنٹہ بعد میں نے کچھ ایسی آواز سنی جس سے گمان ہوتا تھا کہ دو آدمی آپس میں لپٹا جھپٹی کر رہے ہیں۔ بیچ میں ایک آدھ دفعہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی آواز سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سندر بائی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب بڑی تیزی کے ساتھ کمرہ سے نکلے اور زینہ سے نیچے اتر کر چلے گئے۔

میں کھانا بناتی رہی۔ اس کے ایک گھنٹہ کے بعد سندر بائی کی ماں لوٹیں، وہ پہلے تو اندر آئیں اور مجھ سے پوچھا: "کھانا تیار ہے؟" اور میرے ہاں کہنے پر وہ سندر بائی کے کمرہ کی طرف چلی گئیں۔ وہاں جاتے ہی انہوں نے زور سے چیخ ماری، تب میں دوڑتی ہوئی گئی۔ وہاں جاکر دیکھا کہ سندر بائی کا کوئی خون کر گیا ہے۔ میں نے اسی وقت

سندر بائی کی ماں نے وہ سب کہا جو میں نے دیکھا سنا تھا۔"

کامتا پرشاد کے وکیل کے جرح کرنے پر اس نے کہا: "میں جہاں کھانا پکا رہی تھی وہ جگہ سندر بائی کے کمرہ سے تھوڑی ہی دور ہے میں جہاں بیٹھی تھی۔ وہاں سے زینہ پر سے کمرہ میں جاتا ہوا آدمی نہیں دکھائی دیتا تھا میں نے صرف آواز سے خیال کیا کہ اب ڈاکٹر صاحب جا رہے ہیں۔ ان کی تیزی کا اندازہ بھی میں نے ان کے پیروں کی آواز سے اور زینہ سے اترنے کی آواز سے کیا تھا۔ جس وقت ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔ اس وقت میں نے انہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ میں سندر بائی کو ایک گلاس پانی دینے گئی تھی جو کہ انہوں نے خود منگایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے جھگڑا ہونے کے وقت میں اُدھر نہیں گئی تھی۔ کیونکہ ہم لوگوں کو بغیر بلائے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے جھگڑا ہونے کی آواز کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے میں یہ سمجھتی کہ میں جاکر دیکھوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ کسبیوں کے یہاں ایسی باتیں اکثر ہوا کرتی ہیں۔ میرے لئے تو یہ ایک معمولی بات تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد اور سندر بائی کی ماں آنے کے وقت تک میں کھانا بنانے میں اس قدر مصروف رہی کہ مجھے کسی اور بات کا خیال بھی نہ ہوا۔"

دونوں مسلمان دوکانداروں نے اپنے بیان میں کہا:۔

"ہم لوگ دوکان بند کر رہے تھے۔ اسی وقت زینہ میں ایسی آواز ہوئی جیسے کوئی بڑی تیزی سے اُترتا چلا آتا ہے۔ اس کے بعد ہم نے ڈاکٹر صاحب کو نکلتے دیکھا۔ یہ بڑی تیزی سے ایک طرف چلے گئے ان کے کپڑے تر بتر تھے اس کے بعد ہم لوگ دوکان بند کر کے گھر چلے گئے۔

جرح میں دوکانداروں نے کہا: "ہم ڈاکٹر صاحب کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ یہ اکثر سندر بائی کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ سڑک کی قندیل کی روشنی ان پر اچھی طرح پڑ رہی تھی۔ اس میں ہم نے انہیں اچھی طرح دیکھا تھا۔ ہمیں کسی قسم کا شک وشبہ مطلق نہیں ہے۔"

سندر بائی کی ماں نے بیان کیا کہ "ڈاکٹر صاحب پہلے پہل ہمارے یہاں اپنے ایک دوست کے ساتھ آئے تھے۔ ان کا نام ریوتی شنکر ہے۔ وہ بڑے آدمی ہیں۔ وہ بہت دنوں ہمارے یہاں آتے جاتے رہے اس کے بعد انہوں نے آنا جانا بند کر دیا۔ ہمارے یہاں ان میں اور ڈاکٹر میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ سندر بائی نے ایک دن غصہ میں ان سے کہدیا تھا کہ ہمارے یہاں مت آیا کرو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندر بائی ڈاکٹر صاحب کو کچھ چاہتی بھی تھی۔ میرا گمان ہے کہ ڈاکٹر نے ہی اس سے کہا ہوگا کہ ریوتی شنکر کو مت آنے دو۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہیضہ سے بچایا تھا۔ تب سے ہم لوگ انہیں کو بلایا کرتے تھے۔ ایک بار سندر بائی نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا دل بڑا سخت ہے

ان کے جی میں ذرا بھی رحم نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا۔ تو اُس نے مجھ سے کچھ جواب نہیں دیا تھا
کامتا پرشاد نے اپنے بیان میں کہا: "میں سندر بائی کے یہاں کبھی کبھی چلا جاتا تھا۔ وہ اکثر مجھے اپنے یا اپنی ماں کے
علاج کے لئے بھی بلایا کرتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے سندر بائی کے طور طریق سے یہ شک ہوا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے
تب میں نے آنا جانا کچھ کم کر دیا تھا۔ مگر جب وہ مجھے علاج کے لئے بلایا کرتی تھی تب تو مجھے مجبوراً پیشہ کے خیال سے جانا
ہی پڑتا تھا۔ اکثر تو سندر بائی جھوٹ موٹ بیمار بنکر مجھے بلا بھیجتی تھی۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ سندر بائی مجھ سے محبت کرتی ہے
جس دن یہ واقعہ ہوا اس دن میں آٹھ بجے کے بعد دواخانہ بند کر کے گھر جانے لگا تو میری خواہش ہوئی کے یہاں
ہوتا چلوں میں اس کے یہاں گیا۔ ہم دونوں اندر کے کمرے میں بیٹھے۔ اس کے بعد سندر بائی نے مجھ سے محبت کی باتیں
کرنا شروع کی۔ میں نے اس سے کہا مجھ سے ایسی باتیں مت کرو مگر وہ نہ مانی۔ میں نے اسے پھر سمجھایا۔ میں نے
اس سے کہا: "میں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں کسی اور عورت سے پریم نہیں کر سکتا۔ یہ کہکر
میں اٹھ کھڑا ہوا سندر بائی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے چھوڑ دو۔ مگر وہ نہ مانی اور میری بیوی کے متعلق
اس نے کچھ ناشائستہ الفاظ کہے۔ انہیں سنکر مجھے غصہ آگیا میں نے اسے اپنے سے الگ کرنا چاہا۔ اس کوشش میں
میں نے اسے اتفاق سے کسی قدر زور سے ڈھکیلا۔ وہ پلنگ پر گر پڑی اور اس کا سر پلنگ کے پایہ کے سر سے ٹکرا گیا۔
جس کی وجہ سے اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھ میں ڈاکٹری فرائض کا احساس پیدا ہوا۔ میں نے جیب سے
جھٹ رومال نکالکر خون پونچھا اور زخم کو دیکھا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی معمولی تھا۔ صرف چمڑا پھٹ گیا تھا جس
وقت میں زخم پونچھ رہا تھا اسی وقت سندر بائی مجھ سے پھر لپٹ گئی۔ تب میں نے وہاں ٹھیرنا مناسب خیال نہ کیا۔ اور
اپنے کو اس سے چھڑا کر تیزی سے نیچے اُتر آیا اور اپنی گھر کی طرف چلا گیا۔"

چاقو کے متعلق سوال کئے جانے پر کامتا پرشاد نے کہا:

"چاقو میرے چاقوؤں کی طرح ضرور ہے۔ مگر وہ میرا نہیں ہے۔ میں اس کی بابت کچھ نہیں جانتا۔ جتنے چاقو
میرے بکس میں تھے۔ اس وقت میں اتنے ہی میرے پاس تھے۔ اس سے ایک بھی زیادہ نہ تھا۔"

کامتا پرشاد کے اتنا کہنے پر سرکاری وکیل نے عدالت کے سامنے ایک کاغذ پیش کرتے ہو کہا: "یہ اس کمپنی کا
انوائس (بیجک) ہے جہاں سے ملزم نے سرجری کا بکس منگایا تھا۔ انوائس میں تین چاقو لکھے ہوئے ہیں۔ ملزم دو کا ہونا
اقرار کرتا ہے۔ پھر یہ تیسرا چاقو کہاں گیا؟ بکس میں اس وقت دو ہی چاقو موجود ہیں۔"

عدالت نے انوائس، بکس اور جس چاقو سے قتل کیا گیا تھا دیکھ کر کامتا پرشاد سے پوچھا: "انوائس میں لکھا ہوا

تیرا چاچو کہاں ہے ؟"

کامتا پرشاد کا منہ بند ہو گیا۔ انہیں خواب میں بھی اس بات کا خیال نہیں ہوا تھا کہ پولیس نے دوکان تلاشی لیتے وقت اُس پر بھی قبضہ کر لیا ہوگا۔ کامتا پرشاد کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا:۔

"میں بے تصور ہوں۔ میں نے جان نہیں لی!"

(۵)

کامتا پرشاد سشن جج کے سپرد کر دیے گئے۔ کامتا پرشاد کے پتا نے انہیں چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ اکلوتا بیٹا پھانسی پر چڑھایا جاتا ہے یہ خیال کر کے انہوں نے سب کچھ لٹا دیا۔ اچھے سے اچھے وکیل کو مقرر کیا۔ لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ کامتا پرشاد کا کے خلاف ایسے سخت ثبوت تھے کہ وکیلوں کی بحث اور کھینچا تانی نے کچھ فائدہ نہیں پہنچایا۔ سشن جج نے کامتا پرشاد کو پھانسی کا حکم دیدیا۔ عدالت العالیہ میں مرافعہ کیا گیا۔ مگر وہاں سے پھانسی کا حکم بحال رہا اسوقت کامتا پرشاد کے ماتا پتا کی حالت کا کیا ذکر کیا جائے۔ جس کے اوپر اون کی سینکڑوں امیدوں کا دارومدار تھا۔ جوان کے بڑھاپے کا سہارا تھا؛ وہ ان سے چھینا جا رہا تھا اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔ ان کا گھر قبر سے بدتر ہو رہا تھا۔ کامتا پرشاد کی نوجوان بیوی روتے روتے نڈھال ہو گئی تھی اور کیوں نہ ہوتی؟ ایسے نوجوان، سندر، کماؤ، اور زندگی سے زیادہ عزیز شوہر کو آنکھوں کے سامنے بے وقت اور زبردستی موت کے منہ میں ڈھکیلا جاتا ہوا دیکھکر کونسی بیوی اپنے دل کو بس میں رکھ سکتی تھی۔

پھانسی ہونے سے دو دن پہلے کامتا پرشاد کے ماں باپ اور ان کی بیوی کو ان سے ملنے کا موقع دیا گیا تھا۔ اس وقت کا ذکر کرنا محال ہے۔ چاروں میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی تصویر کو ہمیشہ کے لئے دل میں جگہ دے لے۔ اور آخری مرتبہ بات چیت کر کے دل کے تمام ارمان نکال لیں۔ مگر آنکھوں کی جھڑی نے ایسا پردہ ڈال رکھا تھا کہ ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکے۔

ماں بچہ کو کلیجہ سے لگائے روتی جا رہی تھی۔ اس کے نسوانی بین سنکر کلیجہ پھٹا جاتا تھا "ارے میرے بچہ۔ میں نے کیسے کیسے دکھ سہکر تجھے پالا تھا۔ تو میری گود کا پالا ہے۔ میری آنکھ کا تارا ہے۔ ارے چاہے مجھے پھانسی دیدو پر میرے لال کو چھوڑ دو۔ ہائے میرا اکلوتا بیٹا ہے میری آنکھوں کا تارا ہے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ کیا سرکار کے گھر میں رحم نہیں ہے۔ کیا لاٹ صاحب کے بال بچے نہیں ہیں۔ ارے کوئی ان کے سامنے پہنچا دے۔ میں اپنے آنسوؤں سے ان کا کلیجہ پسیج ڈالونگی۔ ارے رام! تم اتنے کیوں خفا ہو؟ میں نے پاپ کئے تھے تو مجھے دوزخ میں بھیجدیتے

میرا بچہ کیوں چھینے لیتے ہیں۔ ارے میرے کلیجہ میں آگ لگی ہے..........،، کہاں تک لکھا جائے، وہ اس طرح کی باتوں سے سننے والوں کے دل کو بے چین کر رہی تھی۔ مجلس کے داروغہ کے بھی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں کامتا پرشاد کے پتا بھی چپ چاپ کھڑے تھے کامتا پرشاد کی بیوی شرم کے مارے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے دل کی آگ اوپر پھوٹ نکلنے کا راستہ نہ پاکر اندر ہی اندر کلیجہ میں پھیل کر تن من کو بھسم کیے ڈال رہی تھی۔ جب اس سے نہ رہا گیا تو ایک دم شوہر کے قدموں سے لپٹ گئی اور حسرت بھری آواز سے اتنا ہی کہنے پائی تھی، "مجھے اکیلا چھوڑ کر آپ کہاں جاتے ہیں،، کہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں اسے وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ ماں بھی روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور اب کامتا پرشاد اور ان کے والد خاموش کھڑے تھے۔ بیٹے نے شرمندگی سے آنکھیں نیچی کر کے محبت اور امید بھری آواز میں کہا۔

"پتا جی! یہ تو آپ کو یقین ہے نا، کہ میں بے قصور ہوں!،،

"کیا کہوں بٹیا۔ میرے لئے سدا بے قصور رہیگا۔،،

"پتا جی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں صرف بری صحبت کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں بری صحبت میں پڑ کر وشیا کے گھر جاتا اور نہ آج یہ نوبت آتی۔ خیر قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اب ایک خواہش یہ ہے کہ ذرا ریوتی شنکر کو میرے پاس بھیج دینا۔ اس سے بھی مل لوں۔ اگر دوست سے آخری وقت میں بھی ملاقات نہ ہوگی تو روح کو چین نصیب نہ ہوگا!،،

دوسرے دن ریوتی شنکر بھی پہنچا۔ ریوتی شنکر سے بات کرتے وقت کامتا پرشاد نے سب کو ہٹا دیا۔ جب وہ دونوں تنہا رہ گئے تو کامتا پرشاد نے ریوتی شنکر سے نظر ملا کر کہا۔

"ریوتی شنکر! جانتے ہو کہ میں کس لئے پھانسی پر چڑھ رہا ہوں؟"

اتنا سنتے ہی ریوتی شنکر نے شرم کے مارے نگاہ نیچی کر لی اور سر جھکا دیا۔

کامتا پرشاد نے اس کا منہ اوپر کر کے کہا۔

"میری طرف دیکھو۔ گھبراؤ نہیں۔ میں صرف اس لئے پھانسی پر چڑھ رہا ہوں کیونکہ میں نے تمہیں بچانیکا تہیہ کر لیا تھا۔ میں نے عدالت میں یہ نہیں کہا کہ وہ تیرا چاقو کہاں گیا۔ اگرچہ مجھے یاد تھا کہ وہ چاقو تم لے گئے تھے۔ میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ میری وجہ سے سندر بائی سے تمہارا کئی بار جھگڑا ہوا۔ تم نے اسے دھمکی بھی دی ریوتی شنکر! میں نے تمہیں پھنسا کر یا تمہارے اوپر شک پیدا کرا کے اپنی جان بچانا صرف انتہائی بزدلی بلکہ دوستی

کے بھی خلاف سمجھا۔ اگر میں پہلے ہی کہدیتا کہ میرا چاقو تم لے گئے تھے تو وہ الواس کی شہادت جو میرے لئے
موت کا پھندا ہوگئی کبھی پیدا نہ ہوتی۔ یہ میں مانتا ہوں کہ میرے صرف اتنا کہدینے سے کہ چاقو تم لے گئے
تھے میں فوراً رہا نہ ہو جاتا۔ میرے خلاف اور باتیں بھی تھیں۔ مگر پھر بھی میں ایک ایسی راہ نکال سکتا تھا جس سے
یہ ممکن تھا کہ میں چھوٹ جاتا۔ مگر میرے چھوٹنے کے یہ نتیجے تھے کہ تم پھنس جاتے۔ انصاف تو ایک کا بدلہ ایک سے
لیتا مجھ سے نہ لیتا تم سے لیتا!! ہم دو کے علاوہ کسی تیسرے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے میں تمہارے
متعلق شروع ہی سے بالکل خاموش رہا۔

خیر جو ہوا سو ہوا پر اب اتنا بتلا دو کہ میرا خیال ٹھیک ہے یا نہیں؟"

ریوتی شنکر کچھ لمحوں کے لئے کامتا پرشاد کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے آنکھیں نیچی کرلیں،
گردن جھکا دی اور کانپتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ دوست دوست سے آخری مرتبہ جدا ہو رہا تھا۔ اس موقع پر
کامتا پرشاد نے ریوتی شنکر پر جو نظر ڈالی وہ ایک مہاتما کی طرح ہی جو رحمدلی سے پاپی پر ڈالتا ہے۔

کامتا پرشاد کو پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے ایک ہفتہ کے بعد ریوتی شنکر کے عزیزوں کو یہ دیکھکر
سخت تعجب ہوا کہ اس کا کمرہ بند پڑا ہے۔ جب شبہات حد سے زیادہ بڑھ گئے تو اس کے کمرہ کا دروازہ توڑا گیا
کمرہ میں ایک خط پایا گیا جس میں لکھا تھا "سندر بائی کی جان کامتا پرشاد نے نہیں لی بلکہ میں نے۔ سندر بائی نے
میرے پریم کو ٹھکرایا تھا۔ اس کے لئے میں اس کو کبھی معاف نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے بغیر دنیا میرے لئے
قبر کا کونا تھی۔ جس دن سے اس نے مجھے اپنے گھر آنے سے روک دیا تھا۔ اس دن سے میں پاگل سا ہو گیا
تھا۔ میں اس دھن میں رہتا تھا کہ یا تو اسے اپنا بنا کر چھوڑوں یا نہیں تو اسے پھر دوسرے کے لئے اس دنیا میں
نہ رہنے دوں میں اس کے مکان کا چکر کاٹتا رہتا تھا پر اس حالت میں بھی مجھے دوسروں کی جان کا اس قدر خیال تھا کہ
مجھے اس کے مکان پر جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جس دن میں نے اس کا قتل کیا اس دن رات کے
نو بجے کے قریب میں ٹہلتا ہوا اس کے مکان کے نیچے سے گزرا۔ اس امید میں کہ شاید اسکی جھلک دیکھنے کو
مل جائے۔ میں اسکے مکان کے سامنے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے کھڑے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ
کامتا پرشاد اس کے مکان سے اترے۔ ان کی حالت دیکھکر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ان کے ستر بستر
کپڑوں سے میں نے کچھ اور ہی خیال کیا اس خیال کے آتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سندر بائی پر
میرے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہی ان سے محبت کرتی تھی۔ میں اپنے کو سنبھال نہ سکا۔

اور بغیر انجام کا خیال کیے میں چپ چاپ چور کی طرح و بے پیرون سندربائی کے کوٹھے پر چڑھ گیا - اور سندربائی کے کمرہ میں پہونچا - اس وقت سندربائی ہاتھوں سے منہ ڈھانکے ہوئے لیٹی تھی - اس کے بدن کے کپڑوں، تکیوں، اور چادر کی بے ترتیبی کو دیکھکر میں جلاپے کے مارے اور زیادہ بدحواس ہوگیا - اس کے قریب جاتے ہی ایکدم اس کا منہ داب لیا، جسکی وجہ سے وہ غل نہ مچا سکی - جس دن سے میں نے یہ مصمم ارادہ کیا تھا کہ یا تو سندربائی کو اپنا کروں گا یا نہیں تو اس کی جان ہی لوں گا - اس دن سے میں وہ چاقو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا - جو کہ میں نے کامتا پرشاد سے مانگ لیا تھا - میں جانتا تھا کہ یہ چاقو غضب کا تیز تھا - یہ چاقو نکال کر میں نے فوراً اس کی چھاتی میں گھسیڑ دیا - ایک ہاتھ سے میں اس کا منہ اس قدر زور سے دابے ہوئے تھا کہ وہ چلا بھی نہ سکی - جب وہ ٹھنڈی ہوگئی - تو میں اس طرح چپ چاپ اتر کر اپنے گھر چلا آیا - گھر آکر میں نے اپنے کپڑے فوراً جلادئے اور مطمئن ہوگیا -

"جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کامتا پرشاد پھنس گئے تو مجھے بڑی تکلیف ہوئی - میں نے اس وقت یہ نہیں سوچا کہ قتل کا شک کس پر ہوگا - "پریم کی آگ" نے میری عقل کو بیکار کر دیا تھا - دوست کے پھنسنے سے مجھے کس قدر پچھتاوا اور کس قدر دکھ ہوا اسے میں ہی جانتا ہوں - مگر موت کے خوف اور پھانسی پر لٹکنے کے بھیانک تصور نے مجھے اتنا بزدل بنا دیا تھا کہ میں اپنا گناہ قبول کرکے کامتا پرشاد کو نہ بچا سکا میں نے کئی بار خیال کیا کہ عدالت میں جاکر سب باتیں کہدوں، پر پھانسی کے تختہ نے مجھے ہر مرتبہ پیچھے ڈھکیل دیا - اگر مجھے یہ یقین ہو جاتا کہ میں پھانسی نہ پاؤں گا تو میں یقیناً اپنا بھید کھول دیتا - اس کے لیے پھانسی کے سوا میں دائمی قید بامشقت یا کالے پانی کی سزا بھگتنے کے لئے تیار تھا مگر موت! اس کے لئے میں اس وقت تیار نہیں تھا - کامتا پرشاد کو پھانسی ہوگئی - میں نے ایک قتل نہیں دو قتل کئے -"

"کامتا پرشاد کو یہ راز معلوم تھا - جیل میں آخری ملاقات ہونے پر مجھے یہ بات معلوم ہوئی اس وقت بھی میں اسی پھانسی کے خوف سے اپنے دوست سے اس گناہ کی معافی نہ مانگ سکا - خوف نے اس وقت بھی میرے منہ کو بند کر دیا تھا"

"اب میرے لئے یہ دنیا ایک عظیم تاریکی ہے - نہ سندربائی ہی ہے نہ میرا عزیز دوست ہے - دونوں جانوں کا میں جدا بدا ہوں - پشیمانی اور پچھتاوے سے میرا تن من جسم چور ہا ہے - اس روحانی ایذا کی زندگی سے مجھے اب موت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے اسلئے میں دنیا سے جا رہا ہوں - ایشور میرے گناہوں کو معاف

ورڈسورتھ کی فطرت نگاری

از

جناب میر حسن صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ

جب کوئی شخص پہلے پہل ورڈسورتھ کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہے تو اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اسکو ناپسند کرتا ہے۔ اسلئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اُن رکاوٹوں کا ذکر کریں جنکی وجہ سے پڑھنے والے کو ورڈسورتھ کے مقصد اصلی تک پہونچنے میں دقت ہوتی ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اُسکی زبان اور طرزِ ادا عام مذاق کے خلاف ہے، اسی وجہ سے اُسکی شاعری کے سیدھے سادھے اور پرشوکت الفاظ کے زیور سے مبرا محاسن کو عام نظر نہیں پہچان سکتی۔ مثلاً اسکی نظم "لوسی" کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔

بنفشہ جو کائی سے پٹی ہوئی چٹان کے قریب
اپنی کچھ کچھ جھلک دکھلا رہا ہے
خوبصورتی میں اُس تارے کی مانند ہے۔ جو اکیلا
آسمان پر چمک رہا ہو۔

اُس نے شاعری کے مسلمہ اصول اور روایات سے قطع نظر اس بات کی کوشش کی کہ اپنی نظموں میں انسان اور کائنات کے مظاہر اور حقائق کو انکے اصلی رنگ میں پیش کرے۔ جسکی وجہ سے بعض اوقات ہم اُسکی شاعری کی لطافت، جذبات نگاری، اور خیالات کی گہرائی کو نہیں پہونچ سکتے۔

اُسکی شاعری کے سمجھنے میں دوسری رکاوٹ کا تعلق خود پڑھنے والے سے ہے۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ اُسکی شاعری کے اکثر حصے میں موسیقی کا فقدان ہے، کہیں کہیں لطافت پیدا ہو جاتی ہے اور آمد صرف بعض بعض اوقات ہوتی ہے۔ آمد کے وقت تو بڑے بڑے شعراء بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن دیگر اوقات میں اُس نے ایسی ایسی خشک، غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ نظمیں لکھی ہیں کہ پڑھنے والے کو حیرت

ہوتی ہے کہ ورڈسورتھ جیسے شاعر نے اس قدر گری ہوئی نظمیں کس طرح لکھیں۔

ورڈسورتھ کا فلسفۂ فطرت ورڈسورتھ تاریخ ادب انگریزی میں سب سے بہتر فطرت نگار مانا جاتا ہے
اُسکی بہتر اور نادر نظموں کے مطالعہ سے اس کے کلام کی حسب ذیل خصوصیتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

ورڈسورتھ فطرت کا مزاجدان تھا۔ اسکی طبیعت بادبیما کی طرح غیر معمولی حسّاس واقع ہوئی تھی اسلیئے وہ اپنے ماحول کی معمولی معمولی تبدیلیوں کو محسوس کرلیتا تھا۔ اپنی مشہور نظم "پری لیوڈ" میں اُس نے خود کو ایک ہوا سے بجنے والے ساز سے تشبیہ دی ہے، جو ہوا کی معمولی جنبش سے بھی بجنے لگتا ہو۔ یہ تشبیہ بالکل درست ہے اور اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ پھول سے لیکر اور پرندونکی نغمہ سرائی سے لیکر آبشاروں کے شور تک، کوئی منظر یا نغمہ ایسا نہیں جس کا عکس اپنی خاص لطافت کے ساتھ اس کے کلام میں موجود نہو۔

تمام فطرت نگار شعراء میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، جو فطرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں ورڈسورتھ کا مدمقابل ہو سکے۔ برنس اور گرے کی فطرت نگاری پر اُن کے ذہنی تاثرات غالب ہیں۔ جسکی وجہ سے مظاہر فطرت کی اصلی صورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ورڈسورتھ پرندوں، پھولوں، درختوں اور دریاؤں کو اُنکے حقیقی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اور خود اُنکو زبان حال سے اپنی پیغام رسانی کا موقع دیتا ہے۔

دنیا کے کسی دوسرے شاعر نے مظاہر عالم میں اتنی خوبیاں محسوس نہ کیں۔ ورڈسورتھ نہ صرف بینا تھا بلکہ مبصر بھی۔ یعنے وہ نہ صرف اشیاء کائنات کا مطالعہ کر کے انکی تصویر کھینچتا ہے، بلکہ اُن کی اصلیت اور حقیقت تک پہونچ کر ایسی ایسی باتیں معلوم کرتا ہے جو سطحی نظر سے مخفی رہتی ہیں۔ اسکے لئے دنیا کی کوئی چیز نظری یا کریہ المنظر نہیں تھی۔ اُس نے اپنی نظموں سے جا بجا ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی چیز حسن اور دلکشی سے خالی نہیں۔

اُس نے فطرت کو ذی حیات قرار دیا، اور دنیا کو اُسکی شخصیت سے روشناس کیا۔ فطرت کی شخصیت کا یہ احساس دنیا کی اعلےٰ شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے۔ کوپر، برنس، کیٹس، اور ٹینی سن نے اپنے اپنے سلیقے کے موافق فطرت کے خارجی مناظر کو پیش کیا۔ لیکن ورڈسورتھ نے اسکو حیات سے مالا مال کر دیا۔ اور اس نے کہا کہ فطرت اپنی مستقل شخصیت کے ساتھ ہر اُس شخص کی دلچسپی اور مسرت کا باعث ہوتی ہے، جو کسی جنگل یا وادی میں سے اکیلا گزر رہا ہو۔

فطرت پرستی کے مدارج اب ہم ورڈسورتھ کی فطرت پرستی کے مختلف مدارج کی توضیح کرینگے، جو زندگی کے تجربوں، کہن سالی، اور فلسفیانہ دماغ کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس توضیح سے اسکی عمر کے مختلف حصوں کی نظمیں بآسانی سمجھ میں آتی ہے۔

اُسکی شاعری پر غور کرنے سے عشقِ فطرت کے ارتقاء کے مدارج سمجھ میں آتے ہیں، جنکو "پری لیوڈ" میں مکمل تفصیلات کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔

پہلا دور وہ ہے جسکو "ایک چاق وچوبند لڑکے کی کھلی ہوا اور مظاہرِ فطرت سے لذت گیر ہونے کی خواہش" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں یہ مادّی محبت وجدانی عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے اور فطرت کے دلچسپ اور جاذب مناظر سے فلسفیانہ اصول پر نہیں بلکہ حواس کی مدد سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن یہ دور بھی بالکل عارضی تھا۔

اس کے بعد اُس نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ اب اُسکی ذہنیت اور جذبات پر مذہبی رنگ پوری طرح چھا گیا۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہم ورڈسورتھ کی "شاعری فطرت" کی اہم خصوصیت سے دوچار ہوتے ہیں۔

بہر حال "حسن فطرت" کی پرجوش پرستش، خیالات کی گہرائی، اور مظاہر فطرت کی ہوبہو تصویر کشی ہی وہ نمایاں خصوصیات ہیں جنکو اُس کی شاعری کے مفردات سمجھنا چاہیئے۔

لیکن ایک اور خصوصیت جو اُسکی شاعری کی جان ہے اور جسکے آگے دوسری خصوصیتیں ماند پڑ جاتی ہیں، مظاہر کائنات کو گہرے روحانی رنگ میں پیش کرنا ہے۔

حسنِ فطرت سے لطف اندوز ہونے کے لحاظ سے ذیل کی نظم اپنا جواب نہیں رکھتی۔

(۱)

میں عالم تنہائی میں اُس ابر کی مانند سرگرم رفتار تھا
جو کہسار اور وادیوں پر سے گزر رہا ہو
کہ یکایک میری میری نظر ایک جھگٹے پر پڑی
یہ ایک تختہ تھا زریں نرگسوں کا۔
جو ایک جھیل کے کنارے۔ درختوں کے سایہ میں

ہوا کی جنبش سے محوِ رقص تھے ۔ اور فرط انبساط سے جھوم رہے تھے ۔

(۲)

ان تاروں کی مانند چمک رہے تھے
جو کہکشان پر دوامًا روشنی کرتے رہتے ہیں ۔
ان کا سلسلہ نا متناہی تھا
ایک نہر کے کنارے کنارے
ایک ہی نظر میں میں نے دس ہزار پھول دیکھے
جو جوشِ مسرت میں سر ہلا ہلا کر رقص کر رہے تھے

(۳)

اُنکے قریب ہی موجیں سرگرمِ رقص ہیں ۔ لیکن وہ
شادمانی میں اُن خیرہ کن موجوں پر سبقت لے گئے
کوئی شاعر بغیر احساس مسرت کے نہیں رہ سکتا
جب کہ وہ ایسے دلنواز ماحول میں ہو ۔
میں اُس منظر میں محو ہو گیا، اور مجھکو اس کا خیال تک نہ ہوا
کہ میں نے اس نظارے سے کونسی لذت حاصل کی

(۴)

کیونکہ اکثر جب کہ میں اپنے بسترِ خواب پر لیٹا ہوا ہوتا ہوں
خالی الذہن یا خیالات میں غرق
تو وہ میری چشمِ دل کو منور کر دیتی ہیں
جسکی وجہ سے عالمِ تنہائی میں مسرت اور شادمانی کی ایک رو دوڑ جاتی ہے
اور میرا دل فرطِ انبساط سے مالا مال ہو کر
ان نرگسوں کے ساتھ سرگرم رقص ہو جاتا ہے ۔

تصوف کا منصر | آبرتے ڈی ویر کے قول کے مطابق ورڈس ورتھ ایک بڑا اصولی تھا تصوف

اس کے کلام کا ایک بنیادی جزو ہے جو تقریباً اسکی تمام نظموں پر محیط ہے۔ ورڈ سورتھ فلسفہ کے اُن تمام مکتبوں (SCHOOLS) کا سخت مخالف تھا جن کے لحاظ سے صرف عقل ہی صداقت اور راستی کا آلہ کار ہے۔

ذیل کی نظم اس پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔

شاعر کی لوح تربت

(۱)

کیا تو کوئی سیاسی آدمی ہے
جس کی پرورش اور تربیت عوام کے لڑائی جھگڑوں کی مرہون منت ہے؟
— پہلے زندوں سے محبت کرنا سیکھ
پھر اس طرف متوجہ ہو۔

(۲)

کیا تو کوئی وکیل ہے؟ نزدیک نہ آ!
جا۔ اور کسی زیادہ موزوں جگہ لیجا
ان مشاق آنکھوں کی تیزی
اور بے رونق چہرہ کی سختی کو

(۳)

کیا تو کوئی خوش نصیب اور خوش باش آدمی ہے؟
تندرست و توانا، اور فربہی میں قابل دید؟
آ۔ لیکن اس قدر قریب نہیں۔
کچھ تیرا بھائی بند نہیں۔

(۴)

کیا تو کوئی نشۂ تہور کا متوالا سپاہی ہے۔

سپاہی — نہ کہ ایسا ویسا آدمی ؟
خوش آمدی — لیکن اپنے ہتیار کھولدے
اور معمولی عصا کا سہارا لے

(۵)

کیا تو کوئی طبیب ہے ! - مبصر
فلسفی ! یا کوئی دہوکہ باز غلام
جو جھانکتا ہے نباتی تحقیقات کے لئے
اپنی ماں کی قبر میں

(۶)

او جسم خاکی کے گرفتار
یہاں سے چلا جا — اور ریچا یہاں سے
تاکہ خفتۂ خاک آرام کی نیند سو سکے
اپنی روح کو جو معرض انحطاط میں ہے !

(۷)

ایک معلم اخلاق اس طرف نکل آتا ہے
خدا جانے کونسی قوت اس قبر کی طرف اسکی رہبری کرتی ہے
نہ وہ آنکھیں رکھتا ہے اور نہ کان
وہ ہے اسکی دنیا، اور اس کا خدا

(۸)

وہ جسکی روح زیر اثر نہیں آتی
حسین اشیاء یا جذبات کے — خواہ وہ کسی قسم کے ہوں
اور دلائل و براہین پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے
جو سو فیصدی عقلی ہوتی ہیں -

(۹)

دروازہ بند کر ـــ زنجیر لگا دے
اور اپنی قید عقل میں آرام کر
دس لمحے بھی بیکار صرف نہ کر
اس غیر نفع بخش قبر کے قریب

(۱۰)

لیکن وہ شخص کون ہے! جس کے چہرہ سے لطافت اور نرمی کے آثار ہویدا ہیں
اور جو معمولی قسم کا لباس پہنے ہوئے ہے
جو جھیل کے قریب کچھ گنگنا رہا ہے
اور جسکی آواز موسیقی موجۂ رفتار پر سبقت لیجا رہی ہے۔

(۱۱)

وہ عزلت نشین ہے دوپہر کی شبنم کی طرح۔
یا اُس جھیل کی مانند جو نصف النہار کے وقت درختوں کے سایہ میں بہ رہی ہو
تم کو چاہیئے کہ اُس سے محبت کرو۔ اس سے قبل
کہ تم اُسکو اس قابل سمجھو۔

(۱۲)

زمان و زمین کی نمائش ظاہری
اور کہسار اور وادیوں کی نظر فریبیاں اُس نے دیکھی ہیں
اور اُس پر دقیق حقائق کا انکشاف
خلوت اور تنہائی کے عالم میں ہوا ہے۔

(۱۳)

وہ ماحول کی معمولی اور مانوس چیزوں سے
بعض اوقات حقائق کا ثبوت دیتا ہے۔

یہ اُسکی چشم باطن کی نظر بازیوں کا نتیجہ ہے
جو غور کرتی ہے، اور بالآخر سو جاتی ہے اُسکے دل پر

(۱۴)

لیکن وہ کمزور ہے۔ لڑکپن اور جوانی
اُس نے صحرا نوردی میں صرف کر دی
اور اُن چیزوں کو صرف دیکھ کر خوش ہوتا رہا
جنھیں لوگ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱۵)

اِدھر آ۔ جب کہ تجھ میں آنے کی سکت ہے
آ۔ کمزور ہے برباد کن موجِ طوفانی کی طرح
تیرا جسم ۔ یہاں اُسکو سپرد خاک کر دے
یا اِس مزار پر اپنا مسکن بنا۔

اِس طرح ورڈسورتھ کے لئے اِس دنیائے آب و گِل میں ایک ایسا عالم روپوش تھا، جہاں تک انسان کی رسائی فہم و اِدراک کی مدد سے نہیں ہوسکتی۔ لیکن جس کا دروازہ شعورِ روحانی رکھنے والے انسان کے لئے ہمیشہ کھلا ہے۔

صدائے بازگشت

(۱)

ہاں وہ کہسار کی صدائے بازگشت تھی۔
خلوت زدہ، صاف، اور گہری۔
کوئل کی کوک کا جواب دے رہی تھی
اور اُسکی آواز پر آواز لگا رہی تھی

(۲)

غیر مطلوب جواب
اُس آوارہ "بکّو" کو دیا جا رہا تھا
اُسکی عام کوک کی طرح
اُسی طرح ـــ لیکن آہ ـــ کس قدر مختلف!

(۳)

کیا حیاتِ فانی نہیں سُن سکتی؟
کیا ہم نہیں سنتے؟ غافل انسان
حماقت اور نزاع کا بندہ ـ
دو مختلف النوع آوازیں؟

(۴)

کیا ہم نہیں رکھتے؟ ہاں رکھتے ہیں
جواب ـــ معلوم نہیں کہاں سے
قبر کے اس پار کی صدائے بازگشت
ایک آواز جس سے ہمارے کان آشنا ہیں ـ

(۵)

اِسی طرح پلٹا دیتا ہے ہمارا گوشِ باطن
اور بعض اوقات دور کی آواز کو سُن لیتا ہے ـ
سُن، سمجھ، اور اُن کو عزیز رکھ
کیوں کہ وہ بھی خدا کی ـــ خدا ہی کی مخلوق ہیں ـ

اِس نظم کا، جو باوجود سہل و سادہ ہونے کے نہایت موثر ہے، "دی اکسکرشن" کی چوتھی جلد کے ایک اقتباس سے مقابلہ کیا جاتا ہے، جس میں ورڈسورتھ نے انہیں خیالات کو زیادہ وضاحت سے اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے

ترجمہ نظم

میں نے دیکھا ایک متجسس بچے کو جو ساحل سمندر سے قریب رہتا تھا۔ اپنے کان کے قریب لیجاتے ہوئے۔
ایک پیچدار اور چکدار گھونگھے کو
جس کو سکوت کے عالم میں خود اسکی روح
بکمالِ توجہ سن رہی تھی ـــــ یکایک اس کا چہرہ
خوشی سے جگمگا اٹھا ـــ کیونکہ اُس مونگھے کے اندر سے
بربڑاہٹ کی آواز آرہی تھی ـــ کہنے والا بتلا رہا تھا
اپنا مخفی رشتہ اپنے پیدائشی سمندر سے
اس طرح تمام کائنات بھی ایک سونگھے کے مانند ہے
گوشِ حقیقت نیوش کے لئے ـــ اور بعض مواقع ایسے آتے ہیں
کہ بلاشبہ وہ تم پر ظاہر کر دیتی ہے
مخفی اشیاء کے مصدقہ راز
مدجزر اور دوامی قوتوں کے متعلق
اوسط خوشی ـــــ جسکی نشوونما ہوتی رہتی ہے
دوامی ہیجان اور انتشار میں ـــــ یہاں کھڑا ہو جا
محبت اور پرستش کر اسکی ـــــ جب کہ تو اُس سے لاعلم ہے
پھر تو اپنے ارادہ سے زیادہ متقی
اور اپنی خواہش سے زیادہ دیندار ہو جائے گا۔

ورڈسورتھ کے خیال کے مطابق روحانیت اور فطرت کے میل کی وجہ سے مظاہر عالم اور اوراک انسانی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور اسی کے توسط سے ہم ایک بہتر عالم تک پہونچ سکتے ہیں اس خصوصیت کو سمجھنا اس کی شاعری کی " روح " کا سمجھنا ہے۔ اور اگر کسی نے اس مسئلہ کو کما حقہ نہ سمجھا تو ورڈسورتھ کی ترجمانیٔ فطرت کا سمجھنا اس کے لئے ناممکن ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ

فطرت سے ہم آہنگی انسان کی وقتی موزونیت طبع پر موقوف ہے۔ یہ مقصد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان عالم بالا کے متعلق سوچ بچار میں مصروف ہو۔ یہی وہ مبارک گھڑی ہے جس میں ورڈسورتھ نے سرحد ادراک سے گزر کر ایسی سرحد میں قدم رکھا جہاں سے اُسکو کائنات کی اصلیت کی جھلک نظر آنے لگی اور اُس نے "ٹن ٹرن ایبی" والی نظم لکھی۔ ایسے اوقات کا ایک ایک لمحہ جب کہ حقیقت کائنات کے راز منکشف ہونے لگتے ہیں، بعض اوقات اتنا مواد فراہم کرتا ہے جسکی فراہمی بحالتِ دیگر کئی سال کے تفکر اور تجسس کے باوجود بھی ناممکن ہے۔

آخر میں ورڈسورتھ کے نظریۂ فطرت کا ایک پہلو اور رہ گیا ہے جسکی توضیح لازمی ہے۔

اس کا خیال تھا کہ مطالعۂ فطرت سے درس و تدریس کی نسبت، زیادہ معلومات اور نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اس خیال کا اثر بھی تقریباً اُسکے تمام کلام پر چھایا ہوا ہے۔

بعض نقادوں نے مخالفت کی اور کہا کہ درس و تدریس مطالعۂ فطرت پر مقدم ہے جسکے بغیر آدمی نرا جاہل رہتا ہے اور اس میں سوچنے سمجھنے کی قوت نہیں پیدا ہوتی۔

یہ خیال اس حد تک بالکل درست ہے۔ اور اگر خود ورڈسورتھ تعلیم یافتہ نہ ہوتا تو اُسکو مظاہر فطرت میں وہ باتیں نظر نہ آتیں جن کا اُس نے اپنی نظموں میں جا بجا ذکر کیا ہے۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ورڈسورتھ کا خیال یہ نہیں تھا کہ انسان درس و تدریس سے بالکل بیگانہ رہے۔ بلکہ اُس کا خیال تھا کہ سکون قلب کے ساتھ اگر کوئی شخص مظاہر کائنات کا گہرا مطالعہ کرے تو بعض اوقات اُس پر ایسے ایسے اسرار مخفی کا انکشاف ہوتا ہے، جنکو انسان کسی کتاب یا معلم سے حاصل نہیں کر سکتا۔

بالآخر ذیل میں ہم ایسی دو نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جن میں مطالعۂ فطرت کی غیر معمولی درسی اہمیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ ناظرین اُسکے حسن و قبح کا اندازہ کر سکیں۔

شکوہ اور جوابِ شکوہ

(۱)

"ولیم ۔ تو اِس پرانی بھوری چٹان پر
اِس طرح دو دو پہر تک
کیوں تنہا بیٹھا کرتا
اور عالمِ محویت میں وقت گزاری کرتا ہے؟"

(۲)

"تیری کتابیں کہاں ہیں؟ — جو سرچشمہ نور ہیں
اور جن کے بغیر خلائق بے کس اور اندھی ہو جاتی ہے!
اٹھ! اٹھ! اور پی لے وہ شراب
جو خفتگانِ خاک نے اپنی نوع کے لئے فراہم کی ہے"

(۳)

"تو اپنی مادرِ گیتی کو تجسس کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے
گویا کہ اُس نے تجھے بلا کسی مقصد کے پیدا کر دیا
یا یہ کہ تو ہی اس کا سب سے پہلا فرزند ہے
اور تجھ سے پہلے کسی نے یہاں زندگی بسر نہیں کی"

(۴)

ایک روز جب کہ میں جھیل ریسٹھ ورٹ کے قریب
نہیں معلوم کہ اس وقت زندگی کس وجہ سے غیر معمولی طور پر خوش آہنگ معلوم ہو رہی تھی
مجھ سے میرے دوست میاتھیو نے یہ سوال کیا
اور میں نے اسکو یہ جواب دیا

(۵)

"آنکھ — دیکھنے پر مجبور ہے
کانوں کو سننے سے باز نہیں رکھا جا سکتا
ہمارے تمام اعضا، اپنے فرائض ادا کرتے رہتے ہیں
ہماری مرضی کے خلاف یا موافق"؟

(۶)

"میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ بعض قومیں ایسی ہیں جو ہمارے دلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ہمارا دل نشو و نما پاتا ہے ایک خاص محویت سے۔

(۷)

کیا تیرا خیال ہے کہ اس انبوہ مظاہر فطرت میں جو ہمیشہ سرگرم کلام رہتا ہے ہمیں کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی اور ہم کو ہمیشہ تلاش و تجسس میں رہنا چاہیئے؟

(۸)

"پھر نہ پوچھنا کہ میں کس لئے یہاں تنہائی میں سرگرم جستجو رہتا ہوں اور اس بھوری چٹان پر بیٹھ کر محویت کے عالم میں وقت گزاری کرتا ہوں۔

(۲) کایا پلٹ

(۱)

اُٹھ! اُٹھ! اے دوست اور کتابوں کو چھوڑ دے ورنہ تو فریب خوردہ انسان ہو جائیگا اُٹھ اور خوش ہو جا اِس قدر مشقت اور عرق ریزی کی کیا ضرورت ہے؟

(۲)

آفتاب نے پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر سے اپنی فرحت بخش اور خوشگوار روشنی تمام سبز کھیتوں پر پھیلا دی ہے اپنی سرشام کی لطیف بسنتی کرنیں۔

(۳)

کتابیں یہ ایک غیر دلچسپ اور لاتناہی بکھیڑا ہیں اِدھر آ۔ اور جنگل کی چڑیا کی نغمہ سنجی پر کان دھر کتنی روح پرور موسیقی ہے! قسم ہے میری زندگی کی اِن نغموں میں علم و دانش کی ایک دنیا ہے

(۴)

اور سن! اُس چڑیا کی خوش الحانی کس قدر مسرور کن ہے! وہ بھی کوئی معمولی وعظ گو نہیں اِدھر آ۔ مظاہر فطرت کی روشنی میں اور فطرت کو اپنا معلم بنا۔

(۵)

فطرت اپنے اندر نغموں کی ایک دنیا رکھتی ہے ہمارے دل و دماغ کے فیضان کے لئے ذاتی علم، جو صحت اور تندرستی کا نتیجہ ہے اور صداقت جو انبساط کی ماحصل ہے۔

(۶)

بہار کے درختوں کی ایک جنبش تجھے انسان کی اصلیت سے زیادہ روشناس کر سکتی ہے اور اس کے محاسن اور صفات گنوا سکتی ہے بہ نسبت تمام عقلمندوں کے۔

(۷)

فطرت ہم کو مسرت بخش علم بخشتی ہے لیکن ہماری مداخلت بیجا کرنے والی عقل تخیلات کی حسین شکلوں کو مسخ کر دیتی ہے ہم حسنِ فطرت کی صورت بگاڑ دیتے ہیں۔ اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش میں۔

(۸)

بس اب علوم و فنون کا پیچھا چھوڑ اور ان غیر نفع بخش کتابوں کو بند کر آ۔ اور اپنا دل لیکر آ جو مشاہدہ کر سکے اور اس سے نتائج اخذ کر سکے۔

حسن رفتار

جناب مرزا اسد اللہ بیگ صاحب حیدر۔ عدالت العالیہ

وہ سحر کار ادا جلوۂ خراماں کی — وہ غارت دل و دیں دست برد ایماں کی

وہ بھینی بھینی چنبیلی کی سی کرزا لپٹیں — شمیم روح فزا زلف عنبر افشاں کی

دل حزیں کے لیے تیغ ابروئے پرخم — جگر کو تیر کماں جستہ نوک مژگاں کی

تبسم لب پاں خوردہ برق خرمن دل — وہ پیش خیمہ ادائیں تباہی جاں کی

حسیں وہ انگلیاں براق ساعد سیمیں — کہ دل میں شمع محبت مرے فروزاں کی

لچک وہ قامت رعنا کی مثل سرو رواں — نظر نواز وہ تصویر قد جاناں کی

وہ چال جس کا قیامت کو فخر پابوسی — وہ خون شریک حنا پائے فتنہ ساماں کی

نفس کی آمد و شد کا وہ نغمۂ پیہم — ادھر ادا طرب انگیز روح رقصاں کی

فرشتے چوم رہے تھے قدم جو اٹھتا تھا — بچھائے آنکھ وہاں کیا حقیقت انساں کی

نگاہیں ششدر و مبہوت تھیں تماشا سے — شبیہ آئینہ تھی دیدہ ہائے حیراں کی

لئے کسی نے پئے ہدیہ جان و دل بھی اگر — ہے جائے شکر کہ جنس محبت ارزاں کی

کسے بہ کبک روی بے درم خرید مرا
ہلاک کرد ز جلوہ مگر نہ دید مرا

جدید اردو شاعر کی پیدائش کا زمانہ

(از عبد القادر سروری)

محمد شاہ پادشاہ ثانی کی کمزور حکومت نے نادر شاہ کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی - دہلی کا اجڑنا تھا کہ مغل شہنشاہوں کی شائستگی، علم و فضل اور آرٹ کا شیرازہ بکھر گیا - دلی کے نامور شعرا میر اور سودا نے لکھنو میں پناہ لی، جہاں اتفاق سے نواب آصف الدولہ کا سایہ انھیں بروقت میسر آگیا - اب لکھنو علم وادب کا مرکز تھا۔ میر اور سودا کی محرک قوتوں نے دلی کے پراگندہ مجمع شعرا کے لیے بساط بچھا دی - ان اساتذہ کا آخری زمانہ تھا - اور جرات بڑھ کر ان کی جگہ لینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اجڑی دلی میں ایک نیا شاعر جنم لیتا ہے - لیکن ابھی ہوش بھی سنبھالے نہیں پاتا کہ تباہی پر تباہی نازل ہوتی ہے - احمد شاہ ابدالی کی بلا دلی پر ٹوٹ پڑتی ہے نظیر کی ماں انھیں چھپا کر آگرہ لے آتی ہیں - یہیں وہ نشوونما پاتے ہیں معلوم نہیں کہ اس آزاد مزاج شخص نے کیا افتادِ طبیعت پائی تھی کہ اپنے اطراف میر، سودا، انشا اور مصحفی کی طرز کی شاعری کو دیکھ کر بھی وہ ان سے متاثر نہیں ہوا - اور عام شعرا کی طرح لکھنو کا رخ کرنے کی بجائے اپنی جگہ جم کر بیٹھ گیا - اس تنہائی میں وہ شاعری شروع کی جو اپنی بے اصولی کے سبب اکثر نقادوں اور مورخوں کو محوِ حیرت بنا رہی ہے - مسٹر رام بابو سکسینہ مرتب "تاریخ ادب اردو" لکھتے ہیں -

"ان کا طرز کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے - قدما میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہوسکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانہ حال کا معلوم ہوتا ہے، متوسطین شعرائے دہلی میں بھی یہ نہیں لیے جا سکتے، اس وجہ سے کہ ان کے کلام میں بہت آزادہ روی ہے انکے اور ان کے مضامین اور انداز میں زمین آسمان کا فرق ہے - لکھنو کا

قدیم طرز تو ان میں چھو نہیں گیا ہے۔ کیونکہ ان میں بناوٹ اور رنگینی جو طرز لکھنو کی خاص پہچان ہے، مطلق نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح دور جدید کے شعرائے دہلی مثلاً غالب، ذوق اور مومن وغیرہ سے بھی یہ بالکل علیحدہ ہیں۔ اس وجہ سے کہ ان کے یہاں سادگی ہے۔ اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا ان کو مثل ان کے مطلق شوق نہیں ہے۔[۱]"

آرٹ اکثر اوقات ایسا ہی بے اصول ثابت ہوا ہے۔ نظیر کی شاعری پر قابل قدر بحث کرنے کے بعد مسٹر سکسینہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

"زمانہ موجودہ کی فطری اور قومی شاعری، جس کی ابتدا مولانا آزاد اور حالی سے کہی جاتی ہے، اس کے پیشرو بلکہ موجد نظیر اکبر آبادی کہے جاسکتے ہیں۔[۲]"

بلاشبہ نظیر حقیقی ہندوستانی شاعر ہیں۔ اور اُن کی شاعری میں جدید اردو شاعری کے تخم موجود ہیں، لیکن اصلاحی دور سے یہ اس قدر پہلے آپڑے ہیں کہ ان کا کلام جدید شاعری کا موجد نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان کا اثر انھیں تک محدود رہا۔ ان کے بعد بھی برسوں قدیم طرز کی شاعری کا دور دورہ رہا۔ طرہ یہ کہ اب سے چند سال پہلے تک نقاد انھیں شاعروں کے زمرہ میں شریک کرنے سے حذر کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا کلام، عام طرز سے جدا تھا۔ ایسے مخالف ماحول میں نظیر کی شاعری کسی نئے عہد کی آفرینش نہیں کرسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ، نظیر کے کلام کی تمام جدتوں کے باوجود، کسی کے دل میں یہ خیال نہیں گذرا کہ جدید شاعری کی ابتدا کے سلسلہ کو ان تک پہنچائیں۔ جدید شاعری، رسم پرستی کے خلاف احتجاج ہے، شعر کا اصلی معیار سادگی اور صداقت ہونا چاہئے۔ یہی معیار نظیر کے ذہن میں تھا، جس کو زیادہ وسیع معنوں میں حاصل کرنے کی جدید شاعری بھی کوشاں ہے۔

غرض نظیر کا دور جدید شاعری کے آغاز کا دور نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بعد بھی ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ اس پر، جدید شاعری کی ابتدا کا دھوکا ہوسکتا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ لکھنو میں اردو شاعری اوج پر تھی۔ گو آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کی علمی و ادبی سرپرستیوں کا دور دورہ ختم ہوچکا تھا، اور میر اور سودا،

۱۔ تاریخ ادب اردو، (ترجمہ) صفحہ ۳۲۵ و ۳۲۶۔

۲۔ " " " " صفحہ ۳۲۶۔

جرات اور انشا جیسے قدیم طرز کے اساتذہ میں سے بھی کوئی باقی نہیں رہا تھا، تاہم اردو شعر کی جو روش اساتذہ نے قائم کردی تھی، وہی مقبول تھی۔ بلکہ آخری زمانے میں قدیم طرز کی شاعری کا دائرہ اور بھی زیادہ وسیع ہوگیا تھا۔ اور یہ ذوق شعر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ دلی کے آخری مغل شہنشاہوں کے تتبع میں، لکھنؤ کے حکمرانوں نے بھی شاعری شروع کردی۔ کیونکہ یہ چیز اس زمانے کی سوسائٹی کے محاسن میں شمار ہونے لگی تھی۔ آصف الدولہ شعر کہتے تھے اور آصف تخلص کرتے تھے۔ یہ سلسلہ آصف الدولہ سے چلا تو تقریباً آخری حکمران اور وہ نواب واجد علی شاہ تک برابر قائم رہا۔ واجد علی شاہ بھی شاعر تھے اختر تخلص اختیار کیا تھا۔ بہت کچھ رطب دیا بس ان کے افکارات سے اب بھی باقی ہے۔

نواب واجد علی شاہ کے عہد میں بادشاہ اور رعایا سب عیش و عشرت کی زندگی میں پڑ گئے تھے۔ لکھنؤ کی اس دور کی شاعری درحقیقت، اس تعیش کا ایک پہلو بن گئی تھی۔ چنانچہ نواب کے اکثر عمائد سلطنت، تبرکاً یا رسماً شعر لکھا کرتے تھے۔ ان میں سے آفتاب الدولہ خلق، مہتاب الدولہ درخشاں، فتح الدولہ برق، قاضی محمد صادق خاں اختر، سید آغا حسن امانت، میر مظفر علی اسیر وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ قبول، بیخود، ہنر، عطارد، شفق، ہلال، سرور وغیرہ کے نام اور زیاد کر لیجئے تو اس دور کے شعرا کی ایک منتخب فہرست سامنے آجائیگی۔

اس میں شک نہیں کہ ان شاعروں میں بہت سے ایسے بھی، جو اپنے مذاق میں معیاری اور اپنے عہد کے استاد سمجھے جاتے تھے، ان کے کلام میں پختگی اور ادبیت بھی موجود لیکن آج تاریخ ادب اردو میں ان کا کیا پایہ ہے؟ شعرا کے ایک بڑے انبوہ کا یہ بھی ایک جزبن کر رہ گئے ہیں، کیونکہ ان کے افکار کی بلندی اردو شاعری کے معماروں کی سطح تک نہیں پہنچی۔ امانت جیسے ایک دو شاعروں کو چھوڑ کر باقی سب کا کلام کسی انفرادی خصوصیت سے خالی ہے ان کا کلام بھی انہیں مختص مضامین اور اسالیب پر مشتمل ہے، جو دلی سے لیکر شمالی ہند کے ابتدائی دور کے آخری شاعر کے کلام میں موجود ہیں۔

اسی رسمی شاعری کی فضا میں میر انیس اور مرزا دبیر جیسے شاعروں کا بھی نشوونما ہوتا ہے۔ یہ باکمال قدیم اصناف سخن سے ایک صنف مسدس اور قدیم موضوعات شعر سے ایک موضوع اہل بیت کبار کی محبت کو لیکر، اپنی شاعری کا آغاز کرتے ہیں اور اپنی زندگی ہی میں، اپنی شاعری کو اس بلند رتبہ تک پہنچا دیتے ہیں کہ یہ خود اردو شاعری کا ایک مستقل اور مہتم بالشان باب بن جاتا ہے۔ مرثیہ کی شاعری کا میدان انھوں نے اس قدر وسیع کیا کہ اس میں حیات کے کئی پہلو، اور شعر کے اکثر مضامین آگئے۔ اس میں شک نہیں کہ انیس اور

دبیر کے کلام کا موضوع بھی ان کے عہد کا کوئی واقعہ نہیں ہے لیکن تمام باکمال شاعروں کی طرح انھوں نے بھی اپنی شاعری کو اپنے زمانے کی سوسائٹی، اس کے طرزِ زندگی، اس کے خیالات، جذبات اور اعتقادات کا پورا پورا مظہر بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری قدیم شعرا سے بالکل ممیز ہو گئی ہے۔ اور اردو کے چوٹی کے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

اس دور میں مرثیہ کی ترقی کے لئے قدرتی اسباب فراہم ہو گئے تھے، ایک طرف تو اردو کے حکمرانوں کا مذہب شیعی تھا، خصوصاً آخری حکمرانوں نواب واجد علی شاہ کے عہد میں، مذہب کا رنگ بڑھ کر غلو کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ ہر چیز جو شیعیت کے عقائد سے واسطہ رکھتی تھی، قدر کے ہاتھوں لی جاتی تھی۔ دوسرے خود واجد علی شاہ اختر نے مرثیہ نگاری کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ایسے دور میں جب قدیم شاعری کے تمام مضامین اور اسالیب بھی نپٹ چکے تھے۔ اور اس طرز میں امتیاز پیدا کرنا قابل سے قابل شاعر کے لئے بھی آسان کام نہیں تھا۔ انیس اور دبیر کا نیا راستہ اختیار کرنا کچھ زیادہ خلاف توقع نظر نہیں آتا، لیکن اصل یہ ہے کہ ان رعایتوں سے یک حبہ فائدہ اُٹھانے کے لئے بھی اعلیٰ دماغی کی ضرورت ہے۔ جب تک غیر معمولی اُپج نہ ہو، کوئی شاعر کسی صنف میں بھی یہ کمال نہیں پیدا کر سکتا جو انیس یا دبیر نے کیا۔ اس لحاظ سے انیس اور دبیر کی شاعری، قدیم طرز سے علیحدگی، عام سطح سے بلندی، اور رسمی قیود سے آزادی اور اعراف کے احساس ابتدا ہے۔ تاہم انیس یا دبیر کی کو جدید شاعری کی پیدائش سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ معاصرین کے لئے خود مرثیہ، تقلید کا ایک نیا باب بن گیا۔ اور باوجود دربار کی مدد کے انیس اور دبیر کے شعرا کا کلام کچھ فروغ نہ پا سکا۔ جب خود مرثیہ ہی کا یہ خیال ہے، جس کا اعلیٰ نمونہ اردو شاعروں کے سامنے موجود تھا، تو پھر شعر کی دوسری صنفوں پر انیس اور دبیر کی شاعری کا کیا اثر مترتب ہو سکتا تھا؟ اس نے انیس اور دبیر کا عصر جدید شاعری کی پیدائش کا وقت نہیں ہو سکتا۔

اردو کی جدید شاعری درحقیقت غدر کے بعد پیدا ہوئی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی پیدائش انگریزی ادب کے اثر سے ہوئی۔ انگریزی اثرات نے جدید شاعری کی پیدائش کے لئے زمین تیار کر دی تھی۔ آزاد اور حالی نے اس میں تخم بکھر دئے۔ قدیم ذہنیت، نظیر اور انیس کے عہد کی طرح اب بھی کار فرما تھی، چنانچہ حالی اس کا شکوہ کرتے ہیں

سر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی

غل تو بہت یاروں نے مچایا پڑ گئے آخر مان ہمیں

لیکن فرق یہ ہے کہ ماحول اب قدیم ذہنیت کا مساعد نہیں تھا، اس لئے، جدید شاعری کے معماروں کی کوششیں تمام و کمال مشکور ہو سکیں۔

جدید شاعری کے آغاز کا زمانہ ۱۸۶۷ء کے قریب ہے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ نے زیادہ قطعیت سے کام لیکر ۱۸۶۷ء کا سال معین کر دیا ہے۔ کیونکہ آزاد نے اسی سال کے ماہ اگست میں بمقام لاہور، اردو شاعروں کے جدید نظریے پر ایک لکچر دیا تھا۔ نیز انگریزی کی پہلی نظم کا ترجمہ بھی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے اسی سال کیا[1] لیکن ہم اردو (آ) اور اردو شاعری پر غور کرتے وقت آزاد کے لکچر اور اسماعیل کے ترجموں سے زیادہ اہمیت آزاد اور حالی کی ان اولین نظموں کو دینگے جو لاہور کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھیں۔ اور حالی کے مقدمہ "شعر و شاعری" کو دینگے، جو اردو شعری تنقید میں ایک عہد آفریں کارنامہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید شاعری کے مطالع کی اشاعت میں "مقدمہ" کی اشاعت نے سب سے زیادہ اہم اور وسیع ترین حصہ لیا۔ (

مقدمات عبدالحق

(حصہ اول)

مولوی عبدالحق صاحب۔ بی۔ اے (علیگ) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد انجمن ترقی اردو کو مقدمہ نویسی و دیباچہ نگاری میں جو شہرت حاصل ہے وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں یہ مولوی صاحب کے کل مقدمات کا ایک گراں قدر مجموعہ ہے۔ جس میں مذہب و فلسفہ، تاریخ و تذکرہ زبان و ادب مختلف موضوعات پر وہ عالمانہ اور بسیط مقدمے ہیں جو اردو زبان کی متعدد بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ہیں اور جو بجائے خود بھی اپنے موضوع پر فاضلانہ مقالے ہیں۔ قیمت مجلد (عہ)

مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محی الدین بلڈنگ حیدرآباد دکن

---

[1] مقالہ "موجودہ اردو شاعری کی چند خصوصیات" پاش ص۳۱

جدید مطبوعات

زبان اور ادب

پردہ مجاز منشی پریم چند اڈیٹر ہنس (بنارس) کے اسی نام کے قصے کا دوسرا حصہ۔ لاہور میں چھپا اور لاجپت رائے اینڈ سنس کے اشاعت خانے کی طرف سے شایع ہوا ہے سوا دو سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت عہر

چار چاند جناب خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی کے مختصر قصوں کا مجموعہ ہے یہ پہلے رسالہ "ساقی" دہلی میں شایع ہوے تھے۔ فراق صاحب کے عزیز مولوی شاہد احمد صاحب بی، اے نے اسکو شایع کیا ہے اور دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپی ہے قیمت ۱۰/

مثنوی ناسخ مولوی حبیب اللہ خاں غضنفر ام، اے ریسرچ اسکالر نے الہ آباد یونیورسٹی میں یہ مثنوی اڈٹ کی ہے۔ یہ کتاب بھی ٹایپ میں غالباً "ادو لیان" کی طرف سے شایع ہوی ہے۔ ابتدا میں مرتب کا مقدمہ ہے جو ۴۴ صفحوں پر مشتمل ہے۔

سوانح عمری

جمال الدین افغانی مشرق کے مشہور مصلح سید جمال الدین افغانی کی یہ مختصر سوانح عمری ہے۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی طرف سے شایع ہوئی ہے اسکے مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا ہے کتاب کی ابتدا میں افغانی کی تصویر بھی ہے۔ کتاب ننھی ٹایپ میں (۱۰۰) صفحوں پر چھپی ہے۔ قیمت ۱۰/

تاریخ

ایورسٹ کی کہانی ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی ایورسٹ کے طبعی جغرافی کچھ تاریخی حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایورسٹ کی تحقیقاتی مہارت کی تفصیل دی گئی ہے۔ کتاب کے مرتب جے آر، رائے ہیں۔ اور دار الاشاعت پنجاب لاہور شایع کی ہے۔ قیمت عہر

سائنس

ایک ہندوستانی گاؤں کے پرندے یہ ماہر علم طیور جناب ڈگلس ڈیور صاحب کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جو منشی نولکشور لکھنو کے مطبع سے شایع ہوا ہے۔ پہلے یہ یوپی وار جرنل میں چھپی تھی ایک میں ایسے پرندوں کا ذکر ہے جو عام طور سے ہندوستان بھر میں پائے جاتے ہیں ہر پرندے کے حالات کے ساتھ اسکی قلمی تصویر بھی ہے قیمت ۱۰/

تنقیدیں

کھیتی

اردو ادب میں تمام اصناف سے زیادہ ڈراموں کی قلت ہے۔ اور اس سلسلے میں جو کوشش کی جا رہی ہے وہ باوجود اپنی خامیوں کے بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔

یہ ڈراما جو محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طبعزاد تصنیف ہے، جدید ڈراما کے اسلوب پر لکھا گیا ہے۔ لیکن مغربی مصنفین (غالباً گالزوردی) کے تتبع میں ڈراما کو اس قدر زیادہ خشک بنا دیا گیا ہے کہ خود مغرب کا ترقی یافتہ اسٹیج بھی اس کی تاب نہیں لاسکتا۔ شاعری کی طرح ڈرامہ میں بھی ادبی شعلہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بغیر سامعین ہرگز لطف اندوز نہیں ہو سکتے اس ڈرامے کی طرح جو ڈرامے کسی خاص مقصد کے لیے لکھے جاتے ہیں ان میں بھی بیک گراونڈ کے طور پر ڈرامائی خصوصیتوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔

مکالمہ اس قدر طویل ہے کہ برنرڈ شا نے بھی ابھی تک اپنے کسی کردار کے زبان سے اس قدر طویل مضامین ادا نہیں کرائے اور جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب قلم جو ہاتھ میں لیے برابر لکھے چلے گئے اور اس اصول کو بالکل نظر انداز کر گئے کہ ڈراما نگار کو اسطرح الفاظ تراشنا پڑتے ہیں جس طرح سنگتراش مرمر تراشتا ہے۔

جدید ڈراما کے اصول کے لحاظ سے مصنف کا فرض یہ ہے کہ وہ ہر سین کے متعلق مفصل ہدایات دے۔ لیکن یہاں ہدایات تقریباً مفقود ہیں۔ اور جو ہیں بھی وہ عجیب و غریب قسم کے مثلاً تقریباً ہر سین کے خاتمے پر ایک کردار دوسرے کردار کی طرف "لمبی سانس بھر کر دیکھتا ہے"

مکالمہ میں اس بات کا تک خیال نہیں کہ ہر کردار کی زبان سے جو گفتگو ادا ہو اس میں الفاظ کے استعمال اور انداز بیان سے اس کیرکٹر کی خصوصیت نمایاں ہو۔ صرف میرے ایکٹ کے دوسرے سین میں چند مزدوروں وغیرہ کی گفتگو کردار کے لحاظ سے لکھی گئی ہے۔ ورنہ سب کا انداز بیان بالکل یکساں ہے۔

ڈرامہ کا پلاٹ یہ ہے کہ عبدالغفور صاحب مسلمانوں کے گم کردہ رہبر سب کو راہِ راست پر لیجانے کے بجائے

اپنی کم فہمی سے سب کو پریشان اور بدل کرتے ہیں۔ دلدار حسین صاحب ممبر میونسپل بورڈ سے لیکر مولا بخش نوہار ایک ہر ایک شروع میں اُن کے اثر میں آتا ہے، اور پھر اُن کی خدمتوں کی قدر کرنے اور حب اسلام کے باوجود انکے حلقۂ اثر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں کس خاص مصلحت سے اس ڈرامے کا عنوان "کھیتی" تجویز کیا گیا۔ عبد الغفور کا کردار ابسن کے ڈرامے "جنگل بط" کے ہیرو گریگرس ورل سے بہت ملتا جلتا ہے۔

اب تک اس ڈرامے کو صرف فنّی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔ لیکن روحِ عمل کے لحاظ سے یہ ڈرامہ یقیناً بہت تعریف کا مستحق ہے، یہ ڈرامہ اسٹیج کے قابل نہیں، ہاں پڑھنے میں بہت کافی سبق آموز ہے بہتر تھا کہ لائق ڈراما نگار اپنے مقصد کو ادا کرنیکے لئے کسی اور صنفِ ادب کو اختیار کرتے، اور اگر ڈراما کو انتخاب کیا تھا تو اس میں "ڈرامائیت" باقی رکھتے

یہ ڈراما مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ قیمت ۶ر

میلاد النبی پروجکٹ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہونہار نونہالوں کے مذہبی شغلوں کا جدید ترین نتیجہ یہ میلاد النبی پروجکٹ ہے جس میں بچوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بہت سے مضامین لکھے اور اس زمانے کے چند تاریخی نقشے بنائے ہیں یہ مضامین جلسۂ میلاد میں پڑھے گئے۔ اس قسم کی کوششیں مذہبی، قومی، اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بچوں کے لئے بہت مفید ہے اور انکے ان کارناموں کی اشاعت انکی لئے بہت ہمت افزا ثابت ہوگی۔

حفظان صحت

مولفہ جناب مخدوم علی صاحب بی، ڈی۔ ناظر تعلیمات ضلع گلبرگہ۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے قیمت ۵ر

مولوی مخدوم علی صاحب، ابتدائی جماعتوں کے تعلیم پر بہت اچھا کام کر رہے ہیں انہوں نے اب تک کئی کتابیں لکھیں جنکا یہ چھٹا سلسلہ ہے "حفظان صحت"۔ ان تمام امور پر سرسری روشنی ڈالی ہے جو ہماری عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً خاص خاص بیماریوں کے پیدا ہونے کے اسباب ان کی روک تھام، علاج کے طریقے اور حفظ ما تقدم کی تدابیر وغیرہ۔ تمام باتیں بچوں کی سمجھ کے موافق بیان کی ہیں۔ بلکہ　　انداز) انھوں نے استعمال کیا ہے اس سے اور متاثر ہونگے۔ ہم سمجھتے ہیں اس طرح کی کتابوں کی اردو کو بہت ضرورت ہے۔ لیکن دو امور خاص طور سے توجہ طلب ہیں۔ اُیان اور ہر ایک آسان اور بے حد سلیس ہونی چاہیے تھی۔ اگر اس میں تصویریں بھی دیدی جاتیں تو بچے زیادہ شوق سے ان کتابوں کو پڑھتے۔

جغرافیہ کی تعلیم

موءلفہ جناب مخدوم علی صاحب۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے قیمت درج نہیں۔

مخدوم علی صاحب کی تصنیفات کے سلسلہ کا یہ چوتھا حصہ ہے۔ جو جغرافیہ کی تعلیم قاعدوں اور اصول پر مشتمل ہے طلبہ نہیں بلکہ اساتذہ ہیں مصنف نے ایسے مدرسین کے لئے ایک آسان سا مضمون تیار کر دیا ہے جنکی آسانی اس فن کی تعلیم کے جدید اصول تک نہیں ہو سکتی۔

مے دو آتشہ

حکیم المشرق عمر خیام کے نام سے کون واقف نہیں یہ اسی شہرۂ آفاق شاعر کی رباعیات اور ان کے انگریزی و اردو ترجموں کا مجموعہ ہے۔ اردو ترجمہ جو رباعی کی شکل میں ہے، بلگرام کے مشہور شاعر شوکت بلگرامی کے زورِ طبع کا نتیجہ ہے نو انگریزی، شہرۂ آفاق وِن فیلڈ کا۔ کتاب کے آغاز میں حکیم المشرق اور شوکت بلگرامی کے حالات اور ان کی تصاویر بھی دیگئی ہیں طباعت وکتابت نہایت بہتر اور سر ورق رنگین خوبصورت، اور کتاب مجلد ہونے کے علاوہ قیمت صرف عہ

مکتبہ ابراہیمیہ (امداد باہمی) متصل صدر ڈاکخانہ انگریزی حیدر آباد دکن

پیام تعلیم

(عبدالغفار سروری)

طلبہ کا سب سے اچھا اخبار۔ جو تقریباً چھ برس سے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شایع ہو رہا ہے چندہ سالانہ عہ۔ اردو کے تمام اخبارات و رسائل میں طلبہ کیلئے پیام تعلیم سے زیادہ مفید کوئی اخبار نہیں ما اخبار کیا ہے ایک شفیق اُستاد ہے۔ جغرافیہ، تاریخ سائنس کے مضامین اور اخلاق پند و نصائح، کہانیوں۔ نظموں۔ معموں و تصویروں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ جماعت میں جن مضامین سے لڑکے جی چراتے ہیں پیام تعلیم میں خوشی سے پڑھتے ہیں۔

پیام تعلیم

سالانہ امتحان میں کامیاب کر دیتا ہے

تعلیمی ضرورت بھی پوری ہو گئی

کیونکہ۔ پیام تعلیم میں وہ تمام باتیں ہوتی ہیں جن کی اسکول کے لڑکوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس اخبار کی یہی خوبی دیکھکر ماہرین تعلیم نے اسکولوں کیلئے سرکاری طور پر خرید کیا ہے اور طلبہ کو اردو کے عام گندہ لٹریچر سے بچانے کیلئے واحد اخبار تجویز کیا ہے۔ ہر ماہ میں دو بار شایع ہوتا ہے چندہ سالانہ صرف عہ (نمونہ مفت)

مینیجر پیام تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ڈھائی سو روپیہ کے پانچ انعام

مجلہ مکتبہ کے قلمی معاونین کو

سال بھر کے بہترین مضامین کے لئے حسب تفصیل ذیل عطا کئے جائینگے

انعام	عطیہ	رقم	مضمون
پہلا انعام	ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ	۵۰	مختصر ڈرامہ — ایک ایکٹ کا ہو اور ہندستان کی معاشرت کے مطابق ہو۔
دوسرا〃	مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال۔ال۔بی پروفیسر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ۔۔۔	۵۰	تاریخی مقالہ — ریاست حیدرآباد اور خاص کر گولکنڈہ کی سلطنت کے متعلق ہو
تیسرا〃	مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ام اے پروفیسر کلام کلیہ جامعہ عثمانیہ	۵۰	تنقیدی مضمون — اردو کے کسی مصنف یا شاعر پر تحقیقی اور انوکھے رنگ میں
چوتھا〃	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نائب مددگار دیوانی ریاست حیدرآباد	۵۰	تحقیقی مضمون — تاریخ اسلام سے متعلق
پانچواں〃	منجانب مدیر مکتبہ ۔۔۔۔۔۔۔۔	۵۰	مختصر افسانہ — حیدرآباد کی زندگی کے کسی پہلو پر

نوٹ:۔ (۱) تاریخی اور تنقیدی مضامین نہایت تحقیقی ہوں اور ڈرامے اور افسانے بالکل اچھے (۲) کوئی مضمون رسالہ کے تین صفحوں سے زیادہ طویل نہ ہو (۳) جو مضامین انعام کے اہل قرار دیے جائیں گے ان کا اعلان ماہ آبان (ستمبر) میں ہوگا (۴) انعاموں کی تقسیم ماہ آذر (اکٹوبر) میں عمل میں آئے گی (۵) مضامین کی مجلس مبصرین معطیوں کے علاوہ فی الحال حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہوگی۔

(۱) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ام اے پی ایچ۔ ڈی پروفیسر فلسفہ (۲) ڈاکٹر میر سیادت علی خاں ام۔ اے۔ال۔ال۔بی ڈی فل۔ بی سی ال پروفیسر قانون

(۳) مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری [illegible]

رجسٹرڈ نشان سرکار آصفیہ (٦٥)

رجسٹرڈ نشان انگلشیہ

دارالاشاعت انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر عبدالقادر سروری ام اے - ال - ال - بی

جلد | ابتہ فروردی ۱۳۴۱ف | فہرست | مطابق ماہ فروری ۱۹۳۲ء | شمارہ (۵)

شذرات

۱۹۳۱ء کا سال بھی تاریخ عالم میں یادگار رہے گا اس سنہ میں جس قدر سیاسی اور قومی انقلابات ہوئے ہیں ان کی نظیر شاید ہی کسی اور سنہ میں ملے گی۔ اجناس اور اشیا کی عالمگیر ارزانی ہر طرف خسارے ہی خسارے کی صورت میں نمودار ہوئی اور اس خسارے سے مملکتوں کی سیاست جو گہرے اثرات مرتب ہوئے اور ہو رہے ہیں، ان کی زندہ مثال موجودہ عالمی ہلچل اور پریشانی ہے جس سے شاید ہی کوئی قوم محفوظ ہوگی۔ انگلستان جیسے مستحکم ملک میں بھی سیاسی تہلکہ اور وزارت کا رد و بدل اسی کا نتیجہ ہے مزدور وزارت کا ٹوٹنا لازمی تھا۔ اس وقت ایسی وزارت کی ضرورت تھی جو اپنے تامینی حصار کے ذریعہ ملک کے خسارے کا انتظام کر سکے۔ یہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی دوسری وزارت ہے انہوں نے اپنے نقطہ خیال کو بدل کر قدامت پرستوں کی شرکت غالب کے ساتھ اتحاد عمل کیا اور اس طرح ملک کی راہنمائی کر رہے ہیں۔

فرانس کی وزارتوں میں تبدیلیاں کوئی غیر معمولی اور انوکھی بات نہیں، جہاں "نظام گروہی" یعنے گروپ سسٹم ہو وہاں کوئی جماعت دیرپا نہیں ہو سکتی مختلف اجزا کا شیرازہ صرف چند مہینوں کے لئے قائم رہ سکتا ہے۔ عالمی ٹریڈنگ کا موزی اثر فرانس پر یہ پڑا کہ لاوال کی وزارت ٹوٹ گئی نیٹلیو سے ترتیب وزارت کی توقع کی جارہی تھی۔ لیکن پوری نہ ہوئی۔ آخرکار ٹاردہ جو پہلے بھی کئی دفعہ وزیر رہ چکے ہیں۔ وزارت پر فائز ہوئے ہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ جاپان نے روس پر فتح حاصل کی تھی اس وقت ہمارے ہم وطنوں کے دلوں پر جاپان کی عظمت کا گہرا سکہ بیٹھا۔ جاپان کی ترقی سے ہم کو بہ حیثیت ایشیائی کے، ایک گونہ محبت بھی ہوگئی تھی، لیکن اس وقت ہم جاپان کی کارناموں کو کن نظروں سے دیکھ رہے ہیں؟ اس وقت جاپان کی مد مقابل ان ہی کی ایک مملکت ہے چین اور جاپان کی جنگ کو ایشیا کی تاریخ ہی میں اہمیت نہیں ہے بلکہ یہ تاریخ عالم کا ایک معنی خیز واقعہ ہے۔ اب تک مغربی اقوام کی فرعونیت اور قیصریت ہماری آنکھوں میں کھٹکتی تھی، لیکن اس جنگ نے ثابت کردیا کہ ایشیائی قوموں میں بھی یہ خواہش موجود ہے جاپان نے اوروں کی طرح قیصریت کی خواہش میں بھی اپنے آپ کو یورپ کا سچا پیرو اور شاگرد ثابت کردیا۔

اس جنگ کو روکنے کی ناکامی میں مجلس بین الاقوامی کے بے دست و پائی کا بھانڈا پھوٹ گیا اب تک تھوڑا بہت اعتماد تو تھا کہ یہ دنیا میں امن و سلامتی [illegible]

مجلس بین الاقوام ایک طرف تو تخفیف اسلحہ کے متعلق نہایت متانت سنجیدگی اور سرگرمی کے ساتھ بحث کر رہی ہے دوسری طرف اس کے دو رکن ایک دوسرے کے گلے پر خنجر پھیرنے کے لئے تل گئے ہیں۔

لندن میں گول میز کانفرنس کے دو زبردست اجلاس لاکھوں روپے کے صرفہ سے منعقد ہوئے لیکن کام تکمیل طلب ہی رہا۔ اس کی تلافی کے لئے مختلف کمیٹیاں ہندوستان میں سرگرم کار ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے لئے کیا نسخہ تیار کرتی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی علمی مصروفیتوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور قابل ذکر حسن شاہد صاحب سہروردی کے پانچ توسیعی لکچر تھے۔ ان میں سے پہلے دو لکچر موجودہ انگریزی شاعری پر دئے گئے تھے۔ ان دونوں لکچروں میں قابل مقرر نے موجودہ انگلستان کے شعرا کا بہت جامع اختصار سے ذکر کیا، اور ان کی خصوصیتوں پر بہت نفاست سے نظر ڈالی۔ اس کے بعد کے دو لکچر موجودہ ادب پر تھے۔ ان لکچروں میں انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی کے ادیبوں، ان کے نظریوں اور ان کے اسالیب بیان کو بہت خوبی سے پیش کیا گیا تھا۔ آخری لکچر جدید مغربی اسٹیج پر تھا جو ان تمام لکچروں میں سب سے زیادہ پسند کیا گیا اس میں قابل مقرر نے اسٹیج کے روسی مصلح اسٹینسلوسکی کے اصول کو بہت وضاحت سے بیان کیا اور دوران تقریر میں تھیٹر کے عناصر پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ مشہور فرانسیسی ایکٹرس سارا برنہارڈ اور اطالوی ایکٹرس الینورا دوزے کا تقابلی مطالعہ کیا اور اسی سلسلہ میں گارڈن کریگ کے نظریوں پر روشنی ڈالی۔ ایک خاص امر جو ان توسیعی لکچروں کو بقیہ لکچروں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ ہے کہ ان خشک مضامین کو اس خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا تھا کہ حاضرین مسلسل پانچ دن تک دلچسپی سے سنتے رہے۔

حیدرآباد میں جاپانی مصوری کے شاہکاروں کی نمائش بھی اس فصل کی فنی دلچسپیوں میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔ تمام عملی اور علمی سرگرمیوں کی طرح فنون لطیفہ میں بھی جاپان یورپ کے دوش بدوش ہے۔ قدیم چینی اثرات کے ساتھ جدید مغربی تخیلات نے جاپانی مصوری میں یکجا ہوکر ایک پرلطف رنگ پیدا کر دیا ہے۔ فنون لطیفہ سے شوق رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ بہت نادر موقعہ تھا کہ وہ جاپانی مصوری کے اصلی شاہکاروں کو دیکھ سکیں۔

ان تصاویر میں خاص طور پر قابل ذکر ایک تصویر "بقائے روح" تھی اور اس کے علاوہ بکثرت مناظر کی تصاویر جاپانی حسن کے تاثرات او رپرندوں کی تصویریں تھیں۔

تذکرہ گردیزی کے دکھنی شعرا

از

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

شعرائے اردو کا یہ ایک قدیم اور نایاب تذکرہ ہے جو ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہوا ہے اور ہنوز طبع نہیں ہوا شعر الہند میں مولانا عبد السلام ندوی نے شعرائے اردو کے تذکروں کی جو فہرست گارسیاں دتاسی کے حوالہ سے دی ہے اس میں یہ تذکرہ شامل ہے۔ مگر اس کے متعلق کوئی یادداشت دیگر تذکروں کی طرح درج نہیں ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس تذکرہ کے تین[1] مخطوطات محفوظ ہیں۔ مرتب کیٹلاگ نے کوئی تفصیلی وضاحت اس کے متعلق نہیں کی ہے۔ جو صراحت اس نے کی ہے اس کے ضروری حصے کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"ریختہ کے شعرا کا ایک تذکرہ مصنفہ علی الحسینی گردیزی ۱۱۶۵ھ میں دہلی میں تالیف ہوا ہے۔ اس کا ذکر اسپرنگر کے کیٹلاگ میں ہے اور ایو کی فہرست میں بھی شامل ہے دتاسی نے بھی ذکر کیا ہے۔

اس تذکرہ میں حروف تہجی کے لحاظ سے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے کل (۹۷) شعرا کا حال لکھا گیا ہے۔ سراج الدین خاں آرزو سے ابتدا اور عبد الوہاب یکرو پر اختتام ہوا ہے۔ انڈیا آفس کا یہ نسخہ نہایت قدیم ہے جو ۱۱۸۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کا مالک اڈی ہوڈ ہال تھا" صفحہ ۶۹۷

برٹش میوزیم میں اس کا نسخہ نمبر (اورنیٹل ۱۲۱۰۸) پر موجود ہے۔

یہاں ہم کو یہ مقصود نہیں ہے کہ اس تذکرہ کے متعلق وضاحت سے بحث کی جائے یا اس کے فروگذاشت کا ذکر کیا جائے بلکہ یہاں ہم ان دکھنی شعرا کا حال درج کرتے ہیں جن کا اس تذکروں میں ذکر ہے اس سے

---

[1] دیکھیے نمبر (۶۹۸) و (۶۹۹) و (۷۰۰)

نہ صرف یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ۱۱۶۵ھ میں دکن کے شعرا کے حالات سے شمالی ہند کے تذکرہ نویس کس قدر واقف تھے بلکہ ایک نایاب مخطوطے سے دکھنی شعرا کا حال بھی شائع ہو جاتا ہے جو شائقین کے لئے فائدہ سے خالی نہیں۔

آزاد خوش ذہن بلند استعداد محمد فاضل، از دکھنی، دکن است وطبعش موجد سخن، با ولی ہم طرح بود و عمر را آزادگی بسر برد۔

آئیں جہاں کے سارے آزاد صنعتیں
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

میر قائم اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کیا ہے۔ مگر وہ فقیر اللہ کے نام سے موسوم کئے ہیں۔ طبقات الشعرا میں مولوی کریم الدین نے آزاد تخلص کے دو دکھنی شعرا کا ذکر کیا ہے ایک کو وہ فقیر اللہ آزاد سے موسوم کرکے معاصر ولی بتاتے ہیں اور شعر اس طرح لکھا ہے ؎

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

دوسرے آزاد کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"محمد فاضل آزاد۔ یہ ایک ظریف اور نکتہ داں مصنّف ہے۔ اصل اس کی حیدرآباد دکن کے ہے اس کی تصنیف صاف و شستہ ہے اور اس کے اشعار موافق طرح ولی کے ہیں جس کا وہ ہم وطن تھا۔ وہ ان فقیروں سے تھا جن کو آزاد کہتے ہیں اس واسطے اس نے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ میر کے تذکرہ اور علی حسینی کے بیان سے ثابت ہے کہ اس نے ایک کتاب ظفر نامہ تصنیف کی ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے جس میں بیان کیا ہے۔ ان فتوح کا جو کہ محمد حنیف ابن حنیفہ نے کئے ہیں۔ یزید پر۔ یہ بیٹے حضرت علی اور حنیفہ کے جو کہ دوسری بیوی حضرت علی کے اور اس شخص نے بہت واقعہ نگاری کیا تھا۔"

کریم الدین کا یہ بیان اس لئے صحیح نہیں ہے کہ نہ تو میر نے اور نہ علی الحسینی گردیزی نے ظفر نامہ کو اس کی تصنیف ظاہر کی ہے۔ البتہ ظفر نامہ میر غلام علی خاں لطیف کی تصنیف ہے جو قطب شاہی عہد کے آخری دور کا شاعر تھا کریم الدین کو یہ بھی دھوکہ ہوا ہے جو دکن میں ایک ہی زمانہ میں دو شخصوں کو آزاد تخلص سے مخاطب کرکے فقیر اللہ اور محمد فاضل سے موسوم کرتے ہیں۔

قائم اور میر حسن اس کو فقیر اللہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں یہ بھی صحیح نہیں ہے ان کا نام دراصل محمد فاضل تھا۔ اور عام طور سے فقیر اللہ مشہور تھے۔ دکن کے مشہور تذکرہ نویس لالہ لچھمی نارائن شفیق نے ان کو محمد فاضل ہی کے نام سے موسوم کیا ہے اور بڑی تعریف کی ہے انکا حسب ذیل شعر نقل کیا ہے ؎

آئیں جہاں کی ساری آزاد ضعفیں پر
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

دکن کے مشہور شاعر ولی نے اسی آزاد کے اسی مصرع کو اپنی غزل میں تضمین کی ہے ؎

آزاد سے سنا ہوں یہ مصرع مناسب
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

(۲) بیکل سید عبدالوہاب زاد گاہش دولت آباد است و در سخن میر عبدالولی عزلت استاد

میرا دل گلرخوں نے سات لے گئے   حنا کے رنگ ہاتھوں ہاتھ لے گئے

عالم کو لعل و گوہر و تاج دلوایا   اے آسمان تو مجھے تو نے کیا دیا

کب تلک اس کی شکایت ہو نہ لب سے آشنا   ایک بیگانہ ہے مجھ سے اور سب سے آشنا

میر، قائم، میر حسن کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ شفیق ان کی صراحت کرتا ہے اپنے دوست ہونے اور رمزیوں میں ماتی تخلص کرنے کا اظہار کرتا ہے۔

۳ تجرد میر عبداللہ شاگرد عزلت زاد گاہش دکن است و طبعش موجد سخن

تجھ منہ میں لطف ہے سو ملک کو خبر نہیں   خورشید کیا ہے اس کی فلک کو خبر نہیں

میر تقی۔ قائم اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں عزلت کے حوالہ سے اس کے شاگرد ہونے کا ذکر کر کے یہی شعر نقل کیا ہے۔ کریم الدین نے ان کا ذکر نہیں کیا شفیق کو بھی اس کے حالات کی خبر نہیں صرف دکھنی ہونے کے ذکر کے ساتھ چند شعر کا اضافہ کرتے ہیں

(۴) جلیب مولد و منشائش حیدر آباد است و در سخن عزلت استاد۔

قواعد کیا ہے گھوڑا ست جوں تیر اے کماں ابرو   کشش کر زور سے دل کھینچ پھر کیوں چھوڑ دیتے ہو

گلبدن پھول کی ست توڑلے ڈالی آرے   دیکھ ابھی شور کریں بلبل و مالی آرے

میر نے اپنے تذکرہ میں ان کو حبیب لکھ کر یہی شعر نقل کیا ہے۔ میر حسن نے حبیب تخلص لکھا ہے۔ مگر کوئی شعر نہیں دیا۔ قائم کے تذکرے میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ کریم الدین نے حبیب کے تخلص کے ساتھ حسب ذیل صراحت کی ہے۔

"وہ حیدرآباد میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم پائی میر عبدالولی عزلت اس کا استاد تھا۔"

شفیق اس کا ذکر محمد حبیب نام اور حبیب تخلص کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ حیدرآباد کا مشہور شاعر تھا۔ جس کے اشعار عام طور سے لوگوں کو یاد تھے

نہ گئی چشم سے آنسو کی روانی آخر   رہ گئی یار کی الفت کی نشانی آخر

ہنس پڑا باغ میں بیتابی بلبل کو دیکھ   کھل گئی یار کی سب غنچہ دہانی آخر

موند کر آنکھ کو کیا ذوق سے سویا تھا حبیب   نہ سنی حیف میری ہیم کہانی آخر

(۵) داؤد

میرزا داؤد تربیت یافتگان دکن است۔

زلف دلبر ہے مجکو دلبر ہے   خلق کہتے ہیں تجکو سودا ہے

میر تقی نے داؤد کا ذکر کیا ہے اور اس کی تعریف میں چند جملے لکھے ہیں۔ شعر بھی کسی قدر تغیر سے لکھا ہے

زلف دلبر ہے مجکو سودا ہے   خلق کہتی ہے تجکو سودا ہے

تذکرہ قائم میں اس کا ذکر نہیں ہے مگر میر حسن نے اس کا ذکر کیا ہے اور شعر وہی پیش کیا ہے جو میر تقی نے نقل کیا ہے۔

طبقات الشعرا میں مولوی کریم الدین نے حسب ذیل صراحت کی ہے۔

"میرزا داود بیگ مشہور نام داود یہ شاعر ذی قدر محمد شا کے عہد میں تھا عزلت کے شاگردوں میں ہے ۱۱۴۷ھ میں موجود تھا یہ شعر اس کا ہے۔"

چاندنی کی سیر کو کس طور نکلے وہ صنم   دیکھنے مہ کا تماشا آفتاب آتا نہیں

شفیق نے داؤد کا ذکر صراحت سے کیا ہے۔ بیان کرتا ہے کہ یہ موجد خیالات اور خوش بیان شاعر تھا۔ اکثر ولی کا تتبع کیا کرتا تھا ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا۔ پانچ شعر کا ایک دیوان اپنی یادگار چھوڑا۔ مرزا جمال اللہ عشق اس کا فرزند تھا۔

سند کو بس ہے تجھے مصرع ولی داؤد کہ تجھ کو شور قیامت سے بے نیاز کیا

قانون شفا نطق میں ہے یار کے موجود
اے دل نہ ہو محتاج طبیباں کی دوا کا

ہوا ہے ابر گریاں دیکھ میری چشم گریاں کو پڑا ہے شور دریا میں مرے ہی اشک جاری کا

---

(۶) سعدی دکھنی از شعرائے قرار دادۂ دکن است ۔ و آنکہ بعض اورا بہ سبب اتحاد تخلص مغالطہ افتادہ ریختہ ہائے سعدی دکھنی از عدم . . . تتبع بنام سعدی شیرازی مرقوم ساختہ اند . . . . . . از جہل دانستہ است و من داعی فعلیہ الند :-

ہم نے تجھن کو دل دیا تم نے لیا اور دکھ دیا تم یہ کیا ہم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے

میر تقی اور میر حسن نے ان کا ذکر کیا ہے اور دکھنی ہونے کی صراحت کی ہے۔ کریم الدین نے کسی قدر صراحت سے لکھا ہے کہ :-

"سعدی تخلص ایک شاعر کا ہے جو کہ سعدی دکھنی مشہور ہے وہ درمیان دکن کے قبل وجود شمس ولی اللہ المتخلص بہ ولی کے گزرا ہے یہ شاعر علم استادی کا دکھن میں بلند کئے ہوئے تھا موافق رواج اپنے زمانہ کے اشعار کہتا تھا۔ صاحب اشعار متفرقہ ہے اس کا کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ اکثر مصنفوں نے خصوصاً مرزا رفیع سودا وغیرہ نے اپنے تذکرے میں اس سعدی دکھنی کے شعر اس سعدی شیرازی قدس سرہ کے طرف منسوب کئے ہیں اس سعدی دکھنی کے اور اس سعدی شیرازی میں کچھ فرق نہیں کیا حالانکہ یہ ایک بڑی غلطی ہے انہیں مصنفین کے پیروی سے ایک مصنف ملک فرانس نے جس کا نام یاد نہیں غلطی کی ہے۔ یہ شعر جو میں آگے لکھتا ہوں اس نے سعدی شیرازی ہی کی طرف منسوب کئے ہیں غرضکہ یہ ان تذکرہ نویسوں کی غلطی ہے۔

یہ سعدی دکھنی اپنے زمانہ میں یہ کہا کرتا تھا کہ سعدی شیرازی میرے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ جو میں شعر کہتا ہوں وہ نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ اسی ضد کے واسطے اپنا تخلص اس نے سعدی رکھا ہے۔ یہ تین شعر کے ہیں۔ اس کو قریب چار سو برس کے گزرے ہیں"

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے گفت اکہ در ہواوے اس شہر کے یہ ریت ہے

ہم نے تمن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے

سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ در ریختہ

شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

شیفق بھی سعدی کو دکھنی خیال کرتا ہے - چنانچہ اس کی صراحت بھی قابل ملاحظہ ہے :-

"سعدی از شعرائے سلف دکن است - زبانش با روزمرّہ دکن آشنا - مرقدش در جوار برہان پور مشہور است - اشعار او سوائے ایں ریختہ کہ تذکرہ نکات الشعرا مذکور است دیگر بنظر نرسیدہ از وست "

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

(ص ۳۹۶)

ان قدیم تذکرہ نویسوں کے برخلاف حکیم شمس اللہ قادری صاحب مولف اردوئے قدیم سعدی کو دکھنی قرار نہیں دیتے بلکہ شمالی ہند کا باشندہ قرار دیتے ہیں اپنی رائے کی تائید میں ملا نظام الدین مولف طبقات اکبری بختاور خاں اور عبدالقادر بدایونی کے آرا کو پیش کیا ہے (ص ۱۲۳) -

ہم نے اپنی کتاب دکن میں اردو میں شفیق کے بیان کے بموجب سعدی کو دکھنی شاعر لکھا ہے -

قدیم تذکرہ نویسوں کے خلاف جو تحقیقات حکیم صاحب لائے کی ہے وہ صحیح معلوم ہوتی ہے میں اس وجہ سے بھی اس بیان سے متفق ہوں کہ دکن میں ولی سے پہلے کسی نے اردو کو ریختہ سے موسوم نہیں کیا ہے - بلکہ دکھنی اور ہندی سے موسوم کیا ہے چونکہ سعدی کا زمانہ ولی سے پہلے کا ہے اس لئے یہ امر غور طلب ہو جاتا ہے کہ سعدی آیا دکھنی ہے یا نہیں -

(۷) سراج میر سراج الدین سراج نشو و نمائش از خاک دکن است و طبع روشنش شمع بزم سخن -

رفو گر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے

اگر دیکھے میرا سینہ رفو چکر سی آجا وے

اور اشعار ہیں جن کو نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ سراج اورنگ آباد کا ایک مشہور شاعر ہے اور اس کا دیوان غالباً انجمن ترقی اردو میں زیر طبع ہے -

(۸) مغل خاں صفت از اقربائے نواب نظام الملک آصف جاہ است و ایں اشعار بر معنی تابش گواہ است

سینے میں آہ دل میں طپش اشک چشم میں
شہرہ یہ عاشقی کا میرا جابجا ہوا

غمزے سے مارتا ہے جلاتا ہے ناز سے
کیا ملک حسن کا صنما تو خدا ہوا

یار گھر جاتا ہے یارو کیا کروں
ہائے گھر جاتا ہے یارو کیا کروں

میر تقی - قائم ، میر حسن یا کریم الدین کسی کے تذکرہ میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ شفیق نے اس کا ذکر کیا ہے ۔ مگر حوالہ اس زیر بحث تذکرہ کا دیا ہے ۔ افسوس ہے کہ کسی تاریخ سے بھی ان کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔

(۹) صاحب طبع والا فطرت سید عبد العلی عزلت پسر سید سعد اللہ تصفیۂ ظاہر و باطن مجلی است و بدریافت علوم کسبی وہبی محلی اصلش از معمورہ بریلی است و مولد و منشائش سورت کتب متداولہ عربیہ آموختہ است و از فارسیہ نیز بہرہ اندوختہ خوش گو خوش صحبت کسی است خدایش ..... سلامت دارد۔

نخل امید بے وفایوں سے
دل سلامت بھرا تو پھل پایا

مقام زندگی سے کوچ کر گئے جلد یار اپنے
وہ منزل پہنچے اور ہم باندھتے رہ گئے ہیں بار اپنے

عزلت نے اورنگ آباد کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ یہاں ان کے بیسوں شاگرد ہوئے جو شعر گوئی میں اپنا نام کر گئے۔

عزلت کا حال ہر ایک تذکرہ نویس نے لکھا۔ اس لئے کسی دوسرے تذکرہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔

(۱۰) مصر سخن عزیز شاہ عزیز اللہ عزیز طبعی رسا داشتہ و فکر والا شعر را عارفانہ گفتہ و گل چاک جنوں از گریبانش شگفتہ۔

ڈرتا نہیں ہوں بانکے کٹاری کے زخم سے
بانکپن نگاہ دیکھ ترے ٹل گیا ہوں میں

کان نمک ہوا ہوں ترا حسن دیکھ کر
لونی برہ کی جب سے لگی گل گیا ہوں میں

میر تقی اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کیا ہے اور ایک شعر لکھا ہے ؎

مجھ نوجواں میں کیا سکت بولوں جو ولیاں کی صفت
عاجز عزیز اللہ او پر دکھن کے سب پیراں ... مدد

شفیق نے بھی غالباً اسی تذکرہ فتح علی الحسینی سے مواد حاصل کیا ہے۔

(۱۱) معتبر خاں

عمر تخلص از تربیت کردہائے ولی دکھنی است و از منصبداراں سرکار والا بود در سخن تلاش معنی تازہ می نمود

اثر سے رونے سے میرے ابرو کماں کے بھونے مین
کس طرح ٹھہرے کماں اس بارش برسات میں

بس کرو زلف کو لپیٹ رکھو　　کیا اسیروں کو مار ڈالوگے
ایک رسوا ہیت ہے شہرت کو　　جمع کر کیا اجار ڈالوگے

کسی دوسرے تذکرہ نویس نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ شفیق کے تذکرے میں شامل ہیں بعض شعر ملاحظہ ہوں۔

اپنی آنکھوں اوپر نگاہ رکھو　　آج مخمور ہیں پیا کیا ہے
گر نہیں ہیں میرے صید کے قابل　　تل بنانے کا مدعا کیا ہے

(۱۲) نور محمد عاصی

از برہان پور است طبع سلیم و ذہن مستقیم دارد

مجھے ہیں ہم کو اب کہیں تم نے بھی دل دیا　　بیٹھے کہیں ہو بات کہیں اور نظر کہیں
آتا تھا تیرے منہ کے مقابل ہو آفتاب　　ایسا گرا کہ تیغ کہیں اور سپر کہیں

شمال کے کسی اور تذکرہ نویس نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ شفیق نے صراحت کے ساتھ ان کا بیان کیا ہے نصیر الدولہ صوبہ دار برہان پور کے ہاں داروغگی قلمدان پر مامور تھے اس کے بعد آصف جاہ کے ملازم ہوئے اور پھر میر عبد الحی خاں صوبہ برار کے پاس متعین کئے گئے تھے۔ شفیق سے ان کی ملاقات بھی تھی۔

(۱۳) میر یحییٰ

مخاطب بہ عاشق علی خاں عاشق مولد و منشائش دکھن است فکرش بلند و سخنش ارجمند در مرثیہ حضرت سید الشہدا گوید

ہیں شہید کربلا سب سرخ پوش　　مصطفے کے آل کا کیا رنگ ہے

ہات میں ہاتھ میرے دہر کے چلے آئے سات　　دیکھو طالع کی مدد آج میرے ہاتھ پڑی

کسی اور شمال کے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں۔ شفیق نے صراحت کے ساتھ ان کا بیان کیا ہے نواب مغفرت مآب (آصف جاہ اول) کی سرکار میں مامور تھے۔ منصبدار تھے اشعار میں ایہام ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے

خاص و عام میں مشہور تھے ؎

جام کو لب سے آشنا مت کر | نام اس کا پیا کٹورا ہے
جس وقت جان نکلی مجھ پاس کوئی نہ آیا | شمشیر تیری اک دم بھٹی تھی میرے سر پہ
سلونے سجن تیرے کوچے منے | شب و روز عشاق کا شور ہے

(۱۴) علی خاں عاجز

ریختہ را ہموار میگوید۔ و در ریختہ بنیادے گذراند۔

ترے برگشتہ مژگاں کا خیال آتا ہے یوں دل میں | دکھن کی فوج جوں بھالے پکڑ بنگالہ پر آوے
جنجال زندگی سے کیا ہو گیا جو چھوٹے | عاجز ابھی پڑا ہے ملک عدم کا جھگڑا
ہمارے شرح بے آبی کتیں تحریر کر سکتے | جو بجلی کے تڑپھنے کی طرح تقریر کر سکتے

کسی دوسرے تذکرہ میں ان کا ذکر نہیں ہے

(۱۵) شاہ فضلی دکھنی

طبع بلند و فکر ارجمند دارد و برخے بر زبان خامہ و سینہ کاغذمی سپہ

مصور گر تری تصویر چاہے اب کہ گر کھیچے | لگا دے ایک سارا چاند چہرے کے بنانے کو
زلف کے سلسلے کے طالب کو | پیچ دے کر مرید کرتے ہیں
مست شراب بند قبا وا کئے ہوئے | پوچھا میں اس طرح سے چلے ہو کہاں میاں
کہنے لگے لے تیغ کو غصہ سے ہاتھ میں | سنتے نہیں یہ کون رہا ہے میاں میاں

میر تقی نے ایک فضلی کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس کے دکھنی ہونے کی صراحت نہیں کی۔ البتہ کریم الدین نے فضلی کا ذکر کیا ہے۔ مگر کوئی شعر نہیں پیش کیا چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"افضل الدین خاں فضلی۔ وہ دکھن کے متقدمین شعرا میں سے ہے اس نے دکھنی زبان میں ایک راجہ کے بیان میں ایک مثنوی لکھی ہے اس کی عبارت متعلق ہے میر اس کو اچھا شاعر نہیں جانتا" (طق ۶۶)

اس کے بعد فضل تخلص کے ساتھ پھر ایک دوسرے شاعر کا حسب ذیل ذکر کیا ہے :-

"شاہ فضل دکھنی یا فقط فضلی بموجب فتح علی حسینی کے جو ہم عہد شاہ نجم الدین آبرو کا تھا مصنفین اس کی استعداد کی تعریف کرتے ہیں"

کریم الدین کو اس میں دھوکہ ہوا ہے فتح علی نے فضلی دکھنی کو شاہ نجم الدین آبرو کا ہمعصر نہیں بتایا ہے

اور اسی فضلی نے مثنوی لکھی ہے۔ مگر اس کا نام افضل الدین نہیں تھا بلکہ شاہ فضل اللہ تھا شفیق نے صراحت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی شاہ عطاء اللہ کے فرزند ہیں غازی الدین خاں فیروز جنگ کے ساتھ مدت تک رہے۔ نواب عضدالدولہ بہادر نے ان کو ایک قرآن تحفتاً دیا تھا جو امام رضا کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا، ظاہر و باطن سے آراستہ تھے۔ رسالہ زاد راہ علم سلوک میں لکھا تھا اس کے علاوہ "قصہ بره بھو کا" "قصہ پدم لوکا" ان کی تصانیف ہیں۔ کلام میں ایہام زیادہ ہوتا تھا۔ ان کے بعض شعر یہ ہیں"

مجھ کون ترے فراق میں دن کاٹنگے | بھوت عاشق ہیں ار کھاتے ہیں (؟)
جس کا دل ہے کباب ہو جانے | تجھ ملاحت کے لوں کی لذت
مجھ کو تلووں سوں آگ لاگی ہے | دیکھ کر تیرے پاوں کی مہندی

(۱۶) قاسم

دکھنی است از تربیت کردہ ہائے عزلت است

اڑ گیا آج کہربا کا رنگ | دیکھ مجھ چہرۂ طلا کا رنگ
اک دام بھی تجھ سے نہ لیا مولسری کا | میں ہار دیا جان تجھے مولسری کا

شمال کے دیگر تذکروں (میر تقی۔ میر حسن۔ قائم۔ کریم الدین) میں ان کا ذکر نہیں ہے البتہ شفیق نے صراحت سے ذکر کیا ہے وہ حیدرآباد میں ان سے ملا تھا شاہ قاسم ان کا نام تھا کلام کے صاف اور رشتہ ہونے کی بھی تعریف کی ہے۔

خوش رہو میر ابھی اللہ یار ہے | دل تمہارا مجھ سے گر بیزار ہے
نہ ڈالے حق کسی کو کام ان چشم سیاہوں سے | مرا دل خوف کرتا ہے تری بانکی نگاہوں سے
اس دوستی کے بیچ میں آنا بھلا نہیں | دنیا میں دل کسی سے لگانا بھلا نہیں
اب ہم کو ایسے وقت میں جانا بھلا نہیں | بیتاب و بے قرار مجھے چھوڑ کر سجن
قاسم میں کیا کروں کہ زمانہ بھلا نہیں | میں جس کو دل دیا سو وہ دشمن ہوا مرا

(۱۷) سید خلیل قادری

ریختہ ہموار می گوید و در دکن بسر می برد

پشم کر بوجھتا ہوں دنیا کو | خوش لگا جب سے فقیر کا کمل

کسی دوسرے تذکرے میں ان کا ذکر نہیں ہے حتی کہ شفیق نے بھی اسی تذکرہ (فتح علی گردیزی)
سے ان کا بیان اخذ کیا ہے کوئی جدید معلومات اور اشعار کا اضافہ نہیں کیا۔
انڈیا آفس میں ایک مثنوی (۵۷) شعر کی موجود ہے جس میں حضرت موسیٰ کے متعلق ایک قصہ درج ہے
اس کا مصنف شاہ خلیل اللہ خلیل ہے بہت ممکن ہے یہ مثنوی جس کو ہم نے طبیب موسیٰ نام دیا ہے اسی کی تصنیف
ہو (تفصیل کے لئے دیکھو یورپ میں دکھنی مخطوطات)

(۱۸) موزوں

نواب خواجم قلی خاں ذوالفقار الدولہ موزوں تخلص از دکن است طبع موزوں
دارد ؎

موزوں نے راہ عشق میں پھر اب قدم رکھا ہے مصلحت سے دور نہ جانو کرے گا گیا

میر تقی اور میر حسن نے ان کا ذکر کیا ہے بہادر شاہ کے زمانہ میں برہان پور کا صوبہ دار تھا شفیق نے
بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ ناصر جنگ شہید کے زمانہ میں ہونے اور فارسی غزلیں آپ کی طرح پر کہنے کی صراحت
کی ہے ؎

آیا ہے رشک حور نہ جانوں کریگا کیا برپا کیا فتور نہ جانوں کریگا کیا

(۱۹) میر میراں

مخاطب سید نوازش خاں ظاہر از دکن است ؎

آہ کر باغ سے وہ سرو خراماں گزرے اشک قمری کا گلستان میں طوفاں گزرے

قائم کے تذکرہ میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ میر حسن نے صراحت کی ہے مگر دکھنی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔
میر تقی نے سید تخلص کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ شفیق نے بھی تفصیل کے ساتھ صراحت کی ہے چنانچہ وہ کہتا ہے:۔
"میر میراں تخلص خلف الصدق نواب علی مردان است خطاب سید نوازش خاں می داشت و اکثر گاہ
طبع معنی رس خود را بہ تسخیر مضامین می گماشت۔ میر تقی میر می نویسد کہ بھید تخلص اوست و فتح علی خاں
او را بہ تخلص میراں در حرف میم تحریر نمودہ۔۔۔ الخ"
تعجب ہے شفیق نے میر تقی کے حوالہ میں دھوکہ کھایا ہے کیونکہ میر تقی نے بھید کے تخلص سے نہیں بلکہ "سید"
کے تخلص کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے (ص ۱۱۲)

(۲۰) ولی

مظہر کمالات خفی و جلی محمد ولی در دکن چہرۂ ہستی افروختہ و از بدو شعور دولت معنی اندوختہ و کمال نیاز
سخن را بہ نبردی فکرت کشیدہ و ناوک اندیشہ اش بہدف معنی رسیدہ ہر چند اشعار آبدارش زیب صحیفۂ لیل و نہار

است وگوشوارہ سوامع سخن سرایاں روزگار لیکن بنا برالتزام تہ زینی چند بایجاز و انتقار پرداخت ۔

نہ پوچھو عشق میں جوش وخروش دل کی ماہیت بزنگ ابر دریا بار ہے رومال عاشق کا

غرورِ حسن نے تجھ کو کیا ہے اسقدر سرکش کہ خاطر میں نہ لاوے تو اگر تجھ گھر ولی آوے

یہ ہیں تذکرہ فتح علی الحسنی گرویزی کے دکھنی شعرا۔

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدر آباد کے علاوہ معزز حکما اور ڈاکٹروں نے صد ہا مریضوں پر امتحان کرکے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹر اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ جب ذیل امراض پر آنا فانا میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنی کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ، پلیگ، بخار، پیچش، متلی، کھانسی، دمہ بواسیر، خارش سانپ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ آزمائیے۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔

شیشی نمبر (۱) ۸؍ نمبر (۲) ۸؍ نمبر (۳) ۸؍ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی معاف ہوگا۔ پتہ اور تار کا

زندہ طلسمات حیدرآباد دکن

(پتہ اس مقام کا یاد رکھنا چاہیے جہاں مال سستا اور اچھا ہو۔)

اسٹیشنری کی ارزاں دوکان

کو نہ بھولئے کیونکہ بہترین اور رفیشن ایبل مال کا نیا اسٹاک آیا ہوا ہے۔ نیز چھاپے کی جملہ سیاہیاں اور دیگر سامان بھی موجود ہے اضلاع پر مال کی روانگی کا خاص انتظام ہے زیادہ مال کے خریدار کو معقول کمیشن بھی دیا جائیگا۔

خصوصاً طالب علموں کی سہولت کے لئے اکسرسیز بک ورو شنائیوں کا خاص انتظام کیا گیا ہے مختلف کارخانوں کے بہترین فونٹین پن ادنی سے اعلی تک واجبی قیمت پر دے جاتے ہیں۔

جی بال کرشنیا

چارمینار حیدر آباد دکن

نمبر (۲۵۰۰)

آہ یہ سحر!

از

جناب علی حسنین صاحب زیبار

دیدنی ہے باغِ عالم میں نمودِ صبح بھی
نور اک ہلکا سا ہے آفاق پر چھایا ہوا
ڈوبتے تاروں کی آنکھیں درد سے لبریز ہیں
چھپ گیا اُترا ہوا چہرہ بھی دیکھو چاند کا
کس لئے بے نور مہ پاروں کی آنکھیں ہو گئیں
ایک ستارہ رہ گیا ہے یادگارِ بزمِ شب
وہ دھندلکا صبحِ کاذب کا وہ اس کی آب و تاب
یا کہ اس زاہد کی پلکوں پر ہے آنسو کی نمود
دے رہا ہے آسماں سے اک پیامِ اضطراب
بے حسی پر تیری چشمک زن ہے کیوں اس کی تڑپ
روح پرورنے کی تجھ میں بھی ہے خاکستر مثال
میں نے مانا نا امیدی سے یہ حالت ہو گئی
لیکن اے بیگانۂ شکوہ طرازی کچھ تو کہہ

مائلِ گفتار ہے اس دم چمن کی ہر کلی
چاند کا چہرہ نظر آتا ہے سونلایا ہوا
صورتیں دم توڑتی شمعوں کی حسرت خیز ہیں
اور فضا پر ایک روشن سا اندھیرا چھا گیا
روتے روتے خشک کیا تاروں کی آنکھیں ہو گئیں
ہے تبسم زیرِ لب، روحِ بہارِ بزمِ شب
گلستاں پر حکمراں ہے اک تر و تازہ گلاب
جس کی نظروں میں قبول ہے اس جہاں کی ہست و بود
تو بھی اب کروٹ بدل ہاں اے دلِ حسرت خراب
اک ذرا دکھلا تو اس مغرور کو اپنی تڑپ
کوئی چنگاری تو اپنی راکھ سے باہر نکال
میں نے مانا کس مپرسی سے یہ حالت ہو گئی
آہ اے دیوانۂ حسنِ مجازی کچھ تو کہہ

ساعتے آمد ہزاراں نغمہ ہا باید زدن
نالہ ہا باید کشیدن نعرہ ہا باید زدن

گیسیں

از

جناب سید شاہ محمد صاحب بی اے

سائنس کائنات کو مادہ اور توانائی پر مشتمل سمجھتی ہے مادہ تو وہی ہے جسے ہم دیکھتے اور جانتے ہیں۔ توانائی سے مراد فطرت کی وہ قوتیں ہیں جو جسمانی حقیقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً تجاذب حرارت نور وغیرہ انکا احساس انکے مادہ پر عمل سے ہوتا ہے۔ ہمیں یہاں صرف مادہ سے بحث ہے طبیعیات میں مادہ کی حالتیں قرار دی گئیں ٹھوس۔ مائع اور گیاس۔ اول الذکر سے تو ہر شخص بخوبی مانوس ہے۔ مائع کی عمدہ مثالیں پارہ اور پانی ہیں۔ اور ہوا اور بھاپ وغیرہ گیس کی مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اصول طبیعیات کی رو سے ایک ہی شے مختلف حالتوں میں متغیر ہوسکتی ہے مثلاً پانی برف اور بھاپ میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ ہوا کو بھی مائع میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ تاہم فطرت میں اشیاء جس حالت میں پائی جاتی ہیں اس کو ان کی طبعی حالت کہا جاتا ہے اور ہر طبعی حالت کی مخصوص خاصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ بس ہم اسی نقطۂ نظر سے گیسوں کا حال مختصراً درج کریں گے

یہ بتانا غیر دلچسپ نہ ہوگا کہ انسانی ذہن میں "گیس" کے تخیل نے کس طرح جگہ لی۔ گیس کی اصطلاح بہت قدیم نہیں اس کو سب سے پہلے ولندیزی عالم فان ہلمان (Von Helmont) نے سترہویں صدی میں استعمال کیا یہ ایک یونانی لفظ (Chaos.) سے ماخوذ ہے جس کے معنی بغیر شکل یا بے ڈول کے ہیں اس لفظ سے گیس کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے گیس کی اصطلاح سے قبل بالعموم "ہوا" کا لفظ مستعمل ہوتا تھا۔ یونانیوں کے نزدیک ہوا اربعہ عناصر میں سے ایک تھی انکساغورث (Anaxagoras.) اور ایمپی ذوکلس (Empedocles.) وغیرہ نے ہوا کی خاصیتوں پر تجربات کئے یونانیوں نے ہوا کو انسانی زندگی سے متعلق قرار دیا۔ چنانچہ ایک ہی لفظ (Pneuma) ہوا۔ انسانی روح۔ اور خدا کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا تاہم یونانیوں نے گیسوں کے مطالعہ کو آگے نہیں بڑھایا۔ یہ لوگ زیادہ تر فلسفہ اور شاعری کے شائق تھے تجربی سائنس ان کے لئے ناموزوں تھی اور سائنس میں کچھ ترقی نہیں ہوسکتی قرون وسطی کے کیمیا گروں نے بھی گیسوں پر زیادہ توجہ نہ کی کیونکہ وہ زیادہ تر سنگ فلاسفی کی دھن میں رہتے تھے۔

نشاۃ جدیدہ کے بعد وسط سترہویں صدی سے کرہ ہوا کا مطالعہ شروع کیا گیا سنہ ۱۶۱۲ء میں گیلیلیو

(Galileo.) نے ثابت کیا کہ ہوا میں وزن ہوتا ہے۔ لیکن اس کے شاگرد طرسیلی (Torricelli.) نے بتایا کہ ہوا کا دباؤ بھی ہوتا ہے۔

گیلیلو سے پہلے پمپ وغیرہ کے استعمال سے نلیوں میں خلا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی انہی تجربات میں دیکھا گیا کہ خلا دار نالی میں پانی اوپر چڑھتا ہے۔ گیلیلو نے بتایا کہ ایسی نلی میں پانی ۳۵ فیٹ سے زیادہ بلند نہیں چڑھتا۔ طرسیلی نے استدلال کیا کہ اگر پانی کے بجائے کوئی کثیف تر مائع مثلاً پارہ استعمال کیا جائے تو وہ کمتر بلندی تک چڑھیگا۔ چنانچہ اس نے ایک گز لمبی موٹی شیشہ کی نلی لی اور اس میں پارہ بھر دیا اور اس کے کھلے سرے کو انگوٹھے سے بند کر دیا اس کے پارہ کے ایک پیالہ میں اس سرے کو ڈبویا اور نلی کو سید کھڑا کر دیا۔ پارہ نلی کے سرے سے کچھ نیچے اتر گیا اور تھوڑی جگہ خالی ہوگئی اور پیالہ میں پارہ کی سطح سے اوپر نلی میں صرف ۳۰ انچ بلند پارہ تھا۔ یہی طرسیلی کا مشہور تجربہ ہے نلی کے اندر پارہ سے اور خالی جگہ کو طرسیلی خلا کہا جاتا ہے
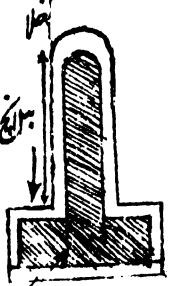
خلا

۳۰ انچ

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پارہ صرف تھوڑی نیچے اتر آیا؟ کیوں وہ پورا نیچے نہیں گر پڑا؟ طرسیلی نے اس کی توجیہ اس طرح کی کہ بند نلی میں پارہ ۳۰ انچ بلند اس وجہ سے چڑھتا ہے کہ بیرون سے دھاتی مائع (پارہ) کے ذریعہ کرہ ہوا کا دباؤ عمل پیرا ہوتا ہے پس نلی کے اندر پارہ کی بلندی سے کرہ ہوا کے دباؤ کی پیمائش ہوسکتی ہے اور دباؤ کے تغیر سے کالم کی بلندی بھی بدل جاتی ہے۔ یہ گویا سب سے پہلا بار پیما (Barometer.) تھا جس سے مراد دباؤ کی پیمائش کا آلہ ہے۔

پاسکل (Pascal) نے خیال ظاہر کیا کہ اگر اس آلہ کو پہاڑ پہ لے جائیں تو پارہ کا کالم کمتر ہونا چاہیے کیونکہ بلند سطح پر ہوائی دباؤ کم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ۱۶۴۸ء میں پیریر PERRIER نے تجربہ سے اس کی تصدیق کی۔

کرہ ہوا کے دباؤ پر مزید تجربات فان گیورک (Von Guericke.) نے ۱۶۵۴ء میں کئے ان میں سب سے مشہور نیکروں والا تجربہ ہے دو مضبوط دھاتی نیکرے اس طرح بنائے گئے کہ وہ ایک دوسرے پر ٹھیک طور پر بیٹھ کر ایک خول دار کرہ بنا سکیں۔ نیکروں کے ساتھ دستے لگے ہوئے تھے اور ایک دستہ پر ایک ٹونٹی لگی ہوئی تھی۔ جس کے ذریعہ پمپ کے عمل سے ہوا خارج کی جا سکتی تھی جب اس طرح اندرون کی پوری ہوا خارج کر دی گئی تو دیکھا گیا کہ دونوں نیکرے پیوست ہوجاتے ہیں اور ان کو جدا کرنے کے لئے سولہ[16] ایسی طاقت کی ضرورت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بیرون کرہ ہوا کا دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے اور نیکروں کو جدا کرنیکے لئے کرہ ہوا کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے۔

شکل ٹونٹی

کلیۂ بائل

اس کے بعد ہمیں رابرٹ بائل کے تجربات کا ذکر کرنا چاہیئے۔ اس نے اپنے تجربات سے بتایا کہ ہوا میں لچکی قابلیت ہوتی ہے اس کا خیال تھا کہ ہوا اصوں پر مشتمل ہوتی ہے جو دباؤ عمل سے کمانی کی طرح کمتر فضا میں سما سکتے ہیں یا یہ ممکن تھا کہ ہوا ذرات پر مشتمل ہوتی ہے اس طرح کہ وہ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں اور حسب موقع گیس پھیل کر مزید فضا لیتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آخرالذکر خیال مبنی بر صداقت تھا۔ یہ گویا نظریہ تحرک کا پیش خیمہ تھا۔

ایک ل نما نلی لی گئی اس میں ہوا کا کالم ا ب ۱۲" لمبا ہے۔ نما و ب ج پارہ سے بھرا ہے ب اور ج ایک ہی سطح پر ہے یعنی ا ب کالم کی ہوا کرۂ ہوا کے دباؤ کے تحت ہوتی ہے جو تقریباً ۳۰ انچ بند پارہ کے برابر ہوتا ہے اس کے بعد نلی میں (ع ۲) مزید پارہ نقطہ ج تک ڈالا گیا۔ اس عمل سے ہوا پہنچتی ہے اور کالم کی لمبائی ا ب ہوجاتی ہے اب اس ہوا پر دباؤ مساوی ہے۔ کرہ ہوا کا دباؤ اور لمبائی ب ج پارہ کے مجموعہ کے بائل کے تجربات کے نتائج حسب ذیل ہیں

(۱) ہوا کا حجم کالم ا، ب میں	(۲) ہوا کا دباؤ	(۳) حاصل ضرب
۱۲ انچ	$۲۹\frac{۱}{۸}$ (کرہ ہوا کا دباؤ)	$۳۴۹\frac{۱}{۲}$
۱۰ "	$۲۹\frac{۱}{۸} + ۶\frac{۳}{۱۶} = ۳۵\frac{۵}{۱۶}$	$۳۵۳\frac{۱}{۸}$
۸ "	$۱۵\frac{۱}{۱۶} + ۲۹\frac{۱}{۸} = ۴۴\frac{۳}{۱۶}$	$۳۵۳\frac{۱}{۲}$
۶ "	$۲۹\frac{۱}{۸} + ۲۹\frac{۱۱}{۱۶} = ۵۸\frac{۱۳}{۱۶}$	$۳۵۲\frac{۷}{۸}$

مشاہدات بالا کی بنا پر بائل نے یہ فرضیہ پیش کیا کہ دباؤ اور پھیلاؤ میں باہم بالعکس رشتہ ہے مزید تجربات سے بائل نے اس کو ایک کلیہ کی صورت میں پیش کیا جو اب کلیۂ بائل کے نام سے مشہور ہے: "مستقل تپش پر گیس کا حجم اس کے دباؤ کے بالعکس متناسب ہوتا ہے یعنی دباؤ اور حجم کا حاصل ضرب مستقل ہوتا ہے"

(دج = و)

کلیہ بالا میں مستقل تپش کی شرط ہے جس سے ظاہر ہے کہ تپش کی تبدیلی سے حجم میں تبدیلی ہوتی ہے گیس گرم ہو کر پھیلتی ہے بشرطیکہ اس کو اس کا موقع دیا جائے۔ لیکن اگر ایک معین فضا میں گیس بند ہو تو گرم کرنے

سے دباؤ بڑھتا ہے۔ تاہم رابرٹ بائل کے بعد اس مسلہ کی مزید تحقیق نہیں ہوئی اور تقریباً ایک صدی بعد چارلس نے ۱۷۸۷ء میں دیکھا کہ آکسیجن ہائیڈروجن کاربن ڈائی اکسائڈ اور ہوا ۰° اور ۸۰° کے مابین یکساں طور پر پھیلتے ہیں " لیکن چارلس نے اپنی تحقیق کو شائع نہیں کیا اور فرانسیسی عالم گے لوسک نے تپش اور گیسی حجم کے مابین رشتہ کو کلیہ کی صورت میں پیش کیا۔

گے لوسک نے ہوا کو ۰° سے ۱۰۰° تک گرم کیا اور دیکھا کہ ۱۰۰ حجم ہوا پھیل کر ۱۳۷٫۵ حجم ہو جاتی ہے۔ یعنی ہوا کا فی اکائی حجم پھیلاؤ ۰٫۳۷۵ ہوتا ہے چونکہ یہ پھیلاؤ ۱۰۰° تپش کے اضافہ سے ہوا اس لئے فی اکائی تپش پھیلاؤ ۰۰۳۷۵ ۔ ۰ ہوتا ہے پس ہوا کے پھیلاؤ کی شرح ۰٫۰۰۳۷۵ ہے۔ گے لوسک نے اس کے بعد آکسیجن ہائیڈروجن۔ نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ پر تجربات کئے اور اس اہم نتیجہ پر پہنچا کہ "تمام گیسیں عام طور پر تپش کے مساوی درجوں سے یکساں طور پر پھیلتی ہیں بشرطیکہ ان کو یکساں حالات کے تحت رکھا جائے۔ الغرض تمام گیسوں کا شرح پھیلاؤ یکساں ہوتا ہے۔ اس کو چارلس اور گے لوسک کا کلیہ کہا جاتا ہے۔

یہاں تک ہم نے گیسوں کے عام خواص کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کئے یعنی گیسی حالت کے صرف اساسی خصوصیات ہمارے زیر بحث تھے۔ اب ہم مختلف گیسوں کے انکشاف کا تذکرہ کریں گے جو بہت دلچسپ ہے۔

کاربن ڈائی اکسائڈ

فان ہلمان (von Helmant.) پہلا شخص تھا جس نے مختلف گیسوں کا مطالعہ کیا اس طرح سترہویں صدی گیسی کیمیا (Pneumatic chemistry) کا آغاز ہوا۔ یہ ذی التجربہ واقع بر سلز میں تجربات کرکے اس نے اس کو "gas Silvester" یا جوبی گیس" سے موسوم کیا کیونکہ لکڑی کے جلنے سے یہ گیس پیدا ہوتی ہے اس نے یہ بھی دیکھا کہ شراب کے کھرا پر عمل سے بھی یہ گیس پیدا ہوتی ہے اور جلتی بتی کو بجھا دیتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ آبی بخار فضائی ہوا سے مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ بخارات آبی کو دوبارہ بآسانی پانی میں تکثیف کیا جا سکتا ہے فان ہلمان کو پانی پر گیسوں کا جمع کرنا معلوم نہ تھا۔ اسٹفن ہیلس (S. Hales) نے سب سے پہلے یہ طریقہ استعمال کیا۔

بعد ازاں گیسوں پر اہم تجربات بلاک۔ کیونڈش۔ پرسٹلی اور شیلے نے انجام دئے۔ یہ لوگ سب اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کے تھے جو کیمیائی اکتشافات کا اہم دور ہے۔

بلاک (Black.) نے کاربن ڈائی اکسائڈ کا مطالعہ کیا اور اس کو Fixed air. یا "محبوس ہوا" کا نام دیا۔ کیونکہ یہ کھریا اور نرم نلیوں میں بند رہتی ہے اور ان سے خارج کی جا سکتی ہے۔ کیونڈش نے ہائیڈروجن

گیس تیار کیا جب اس نے Inflamalle air یا "اشتعال پذیر ہوا" سے موسوم کیا۔ اس نے اس کو جست لوہے یا قلعی پر ہلکائے ترشہ کے عمل سے تیار کیا تھا کیونڈش کو گیس کے خشک کرنے کا طریقہ نیز پارہ پر جمع کرنیکا طریقہ معلوم تھا۔ اس نے پانی کی ترکیب اور ساخت پر بھی اہم روشنی ڈالی ہے۔

پریسٹلی کی تحقیقات جوزف پریسٹلی کے سر (؟) یا، گیسوں کے انکشاف کا سہرا ہے اس نے "نائٹرس ہوا" کو جسے اب نائٹرک آکسائیڈ گیس (NO) کہا جاتا ہے نائٹرک ترشہ کے مختلف دھاتوں پر عمل سے حاصل کیا۔ اس نے یہ دیکھا کہ متذکرہ گیس ہوا کے ساتھ تماس کھاکر سرخ ہوجاتی ہے اور جب اس کو لوہے کے ساتھ مس کرتا ہوا رکھا جاتا ہے تو اس کا حجم کم ہوجاتا ہے اور ایک دوسری گیس پیدا ہوتی ہے جو ہوا میں سرخ نہیں ہوتی اس نے اس کو "تخفیف شدہ نائٹرس ہوا" کا نام دیا۔ اس کو آج کل نائٹرس آکسائیڈ (N_2O) گیس یا عامیانہ زبان میں ہنساور گیس laughing gas کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے سونگھنے سے گدگداہٹ اور ہنسی پیدا ہوتی ہے "روح نمک" (مرتکز ہائیڈروکلورک ترشہ) کو گرم کرکے پریسٹلی نے ایک "غیر مرئی ہوا" حاصل کی جسے پارہ پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اس کو "Marine acid air" یا "سمندری ترشہ کی ہوا" سے موسوم کیا یہ گویا موجودہ ہائیڈروکلورک گیس (HCL) ہے پریسٹلی نے "روح نوشادر" کو (Spirit of Sal Amonic) [جسے آج کل مرتکز امونیا محلول کہا جاتا ہے] گرم کرکے ایک "قلوی ہوا" (Alkalnie air) حاصل کی جو فی الحقیقت امونیا گیس تھی۔ جس کو پارہ پر جمع کیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی "ترشی ہوا" (موجودہ HCl) اور قلوی ہوا" (موجودہ NH_3) کو باہم ملاکر یہ توقع کی کہ ان کی باہمی تعدیل سے معمولی ہوا حاصل ہوگی لیکن ایک خوبصورت سفید دخان حاصل ہوا جو سفید سفوف کے طور پر تہ نشین ہوگیا اس کا امتحان کرنے پر پریسٹلی کو تعجب ہوا کہ یہ سفوف نوشادر (امونیم کلورائیڈ NH_4Cl) ہے

پریسٹلی نے "تھوتے والے ترشہ (vitriolic acid) [موجودہ سلفیورک ترشہ] کو گرم کرکے ایک "ہوا" حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے (حسب شکل) ایک صراحی میں ترشہ رکھا اور اس کو قرنبیق لگادیا قابلہ میں پارہ رکھا تاکہ گیس کو اس پر سے جمع کیا جاسکے

قرنبیق
صراحی
مشعل
قابلہ
پارہ

اس نے ترشہ کو دیر تک گرم کیا لیکن کوئی گیس حاصل نہیں ہوئی اور اس نے تجربہ ختم کرنے کے خیال سے مشعل بجھادی جس کی وجہ ایک حادثہ واقع ہوا قابلہ

کا پارہ ترشے والے برتن میں گھس گیا جس سے ترشہ اور پارہ میں تند تعامل واقع ہوا اور صراحی ٹوٹ گئی جس کی چو پریسٹلی کو زخم لگے۔ لیکن اس نے مشاہدہ کیا کہ "ایک ترشی ہوا" پیدا ہوئی جس کی بو جلتی گندک کی سی ہوتی ہے۔ اس کو پریسٹلی نے (vitriolic acid air.) تھوتھے دار ترشہ کی ہوا سے موسوم کیا یہ گویا سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس کے انکشاف کی دلچسپ تاریخ ہے۔

پریسٹلی نے فلورسپار کو سلفیورک ترشہ کے ساتھ شیشہ کے برتن میں گرم کر کے "فلور ترشہ کی ہوا" حاصل کیا جو سلیکن ٹیٹرا فلورائیڈ (SiF_4) ہے لیکن پریسٹلی کا شہرہ آفاق تجربہ پہلی اگسٹ ۱۷۷۴ء میں ہوا جو آکسیجن گیس کے انکشاف کا باعث ہوا۔ پریسٹلی کو تمام قسم کے کیمیائی اشیاء گرم کر کے ان سے پیدا شدہ "ہواؤں" کی تحقیق کا شوق ہو گیا تھا چنانچہ (Red calx.) سرخ کالکس (پارہ کا سرخ آکسائیڈ) کی طرف بھی اس کی توجہ ہوئی۔ اس کے نظری عقیدوں کی بنا پر ایک ناقابل تحلیل عنصر تھا جس کو گرم کرنا بیکار تھا تاہم اس نے دلچسپی کی خاطر یہ تجربہ انجام دیا۔ تھوڑے سے مرکب پر سورج کی روشنی عدسے کے ذریعہ مرتکز کر کے ڈالی کافی دیر کے بعد ایک گیس نکلنے لگی اور سرخ سفوف میں کمی ہونے لگی۔ یہ گیس عجیب خواص کی مالک تھی اس میں موم بتی ہوا کے مقابلہ میں زیادہ روشن جلتی ہے۔ چوہیا اس میں زیادہ دیر تک زندہ رہتی ہے اور خود پریسٹلی نے اس کو سونگھا تو "اس کا سینہ تھوڑی دیر تک عجیب طور پر ہلکا اور پرسکون معلوم ہوا" اس طرح آکسیجن کا انکشاف ہوا

کلورین گیس

سویڈن کے طبیب شیلے (Scheele.) نے پریسٹلی سے دو سال قبل آکسیجن گیس کا انکشاف کیا تھا لیکن اس نے اپنی تحقیق ۱۷۷۷ء تک شائع نہیں کی۔ کلورین گیس کا انکشاف بلا شرکت غیرے اسی کا کارنامہ ہے۔ وہ ۱۷۷۴ء میں سیاہ میگنیشیا "(میگنیز ڈائی آکسائیڈ) پر تحقیق کر رہا تھا۔ اس پر ہائیڈرو کلورک ترشہ کے عمل سے ایک گیس پیدا ہوتی ہے جس کا رنگ سبزی مائل تھا جس کی بنا پر اسی نے "کلورین" یا (سبز گیس) کا نام دیا۔ اس گیس میں خراش آور اور رنگکٹ خواص پائے جاتے ہیں شیلے نے انہیں تحقیقات کے دوران میں آکسیجن کا بھی انکشاف کیا۔ سیاہ میگنیشیا کو گرم کرنے پر ایک گیس خارج ہوتی ہے جو آکسیجن ہے۔ سیاہ میگنیشیا میں اگر پوٹاسیم کلوریٹ ملا دیا جائے تو آکسیجن آسانی سے خارج ہوتی ہے یہی طریقہ آج کل عمل میں استعمال ہوتا ہے۔

لیوازیر

تاریخ کیمیا کا شاندار دور لیوازیر (Lavoisier.) کی تحقیقات سے اپنی انتہائی چوٹی پر پہونچتا ہے۔ پریسٹلی اور شیلے بڑے ماہرین تجربات تھے۔ لیکن ان کے تجربات کیفی تھے اور وہ

ایک غلط نظری مسلک کے پابند تھے ۔ لیکن لیوزائر نے کمی تحقیقات کی جن کے بغیر سائنس کی حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی علاوہ ازیں لیوزائر نے نئے خیالات پیش کر کے "کیمیائے جدید" کو فروغ دیا

لیوزائر فرانس کے عہد انقلاب کی پیداوار تھا جہاں نپولین اور اس کے ساتھیوں نے فرانس کے سیاسی انقلاب میں حصہ لیا انہیں کے ایک ہم وطن (لیوزائر) نے سائنس میں ایک عظیم الشان انقلاب کی علمبرداری کی اس نے اپنے ہمعصر انقلابیوں کی طرح پرانے خیالات ۔ اعتقادات اور ان کو سختی اور بے رحمی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی ۔ گو بالآخر زمانہ کی عداوت اور اپنے ہم وطنوں کی ناقدری نے باہمت اور نیک نفس لیوزائر کو سولی پر چڑھایا ۔ جن عظیم الشان ہستیوں کے خون نے سائنس جدید کی آبیاری کی ۔ ان میں لیوزائر سب سے زیادہ ممتاز ہے ۔ لیوزائر کے نئے اور انقلابی خیال کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پرانے نظریہ کا جو عام طور پر نظریہ فلاجسٹن کے نام سے مشہور ہے مختصراً ذکر کر دیا جائے

نظریہ احتراق

ابتدائے آفرینش سے آگ کے متعلق مختلف خیال آرائیاں کی گئیں ۔ اکثر اقوام کے علم الاصنام میں آگ کے دیوتا کو خاص حیثیت حاصل ہے ۔ ہمیں یہاں صرف اس کے سائنٹفک پہلو سے غرض ہے "احتراق" اور جلنے کے متعلق مختلف زمانوں میں مختلف خیال پیش کئے گئے لیکن کسی خیال کو کسی زمانہ میں کامل سائنٹفک اہمیت حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ قرون وسطیٰ میں نظریہ فلاجسٹن کو اس نظریہ کا زبردست مربی سٹال (Stahl.) تھا اس کے خیال میں فلاجسٹن احتراق پذیری کا عنصر تھا یہ ایک نامعلوم اور غیر مرئی شئے تھی جو ہر احتراق پذیر شئے میں پائی جاتی ہے جلنے پر وہ اس شئے سے خارج ہو جاتا ہے ۔ یعنی کسی شئے کا جلنا گویا فلاجسٹن کے اخراج کے مترادف تھا اور اس نظریہ کی رو سے اگر کسی دہات کو جلایا جائے تو اس سے پیدا ہونے والی راکھ (calx) اس دہات سے سادہ تر ہوتی ہے پس راکھ (calx.) ایک عنصر ہے اور دہات اس عنصر اور فلاجسٹن عنصر کا مرکب ہے ۔ کیمیائی مساوات سے اس طرح واقعات بالا کو ظاہر کریں گے ۔

(۱) راکھ = دہات - فلاجسٹن — calx = Metal - Phlogiston.

(۲) راکھ + فلاجسٹن = دہات — calx + Phlogiston = Metal.

لیوزائر کے عہد میں یہی خیالات پھیلے ہوئے تھے ۔ پرسٹلی اور شیلے اور دیگر ممتاز علماء اسی مسلک کے پابند تھے

جس طرح پرسٹلی کو اکثر کیمیائی مرکبات کو گرم کر کے ان سے حاصل شدہ گیسوں کے مطالعہ کا شوق تھا ۔ اس طرح لیوزائر ہر کیمیائی مسئلہ میں ترازو کے استعمال کو ناگزیر سمجھتا تھا ۔ اس کی انہیں کوششوں نے کیمیا کو ایک کمی سائنس

کا درجہ عطا کیا لیوزائر نظریہ فلاجسٹن پر ہمیشہ اشتباہی نظر ڈالتا یہ بات اس کے نزدیک غیر معمولی علوم ہوتی تھی کہ کوئی دھات جلنے کے بعد اپنے سے سادہ تر شئے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس نے اس کے بعد تجربات کا ایک سلسلہ انجام دیا۔ اس نے پہلے دھات کا وزن کرلیا۔ پھر اس کو جلایا۔ حاصل شدہ راکھ کا وزن کیا گیا۔ اس نے دیکھا کہ راکھ کا وزن ابتدائی دھات سے زیادہ ہوتا ہے۔ پس دھات کے جلنے سے حاصل شدہ راکھ ابتدائی دھات سے سادہ تر نہیں ہوتی یعنی تجربہ نظریہ فلاجسٹن کے مطابق نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ نظریہ فلاجسٹن غلط ہے۔ اور تجربہ اس کی تردید کرتا ہے۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ دھات جلنے کے دوران میں کسی بیرونی شئے سے ترکیب کھاتی ہے اور یہی وجہ اس کے وزن میں اضافہ کی ہے لیکن لیوزائر یہ نہیں بتا سکا وہ کونسی بیرونی شئے ہے جو دھات سے جلنے کے دوران میں ترکیب کھاتی ہے۔ لیوزائر نے سائنٹفک طبیعت پائی تھی۔ اس میں تحقیق اور تجسس کا بہت شوق تھا۔ نیز مختلف واقعات کو اکٹھا کرنا اور ان میں تطابق کرنا جانتا تھا۔ چنانچہ لیوزائر کو جب پرسٹلی کی پہلی اگسٹ والی تحقیق کا علم ہوا تو گویا وہ چیز اس کے ہاتھ آئی جس کی ذہن میں وہ عرصہ سے تھا۔ پرسٹلی نے پارہ کے سرخ آکسائیڈ کو جلانے سے جو گیس حاصل ہوئی اس کا نام غیر فلاجسٹن ہوا رکھا تھا لیکن لیوزائر نے اس کا نام آکسیجن رکھا اور اس نے بتایا کہ یہی وہ بیرونی شئے ہے جو تمام عناصر اور اشیاء کے جلنے میں ممد ہوتی ہے۔ کسی دھات کا احتراق گویا ایک تکیڈی عمل ہے جس میں دھات کے ساتھ آکسیجن کا اتحاد ہوتا ہے۔ چنانچہ حاصل شدہ راکھ ایک مرکب ہوتی ہے جسے آکسائیڈ کہا جاتا ہے۔ لیوائزر نے اپنے نظریہ کا دلچسپ ثبوت پیش کیا۔ اس نے پارہ کو خوب گرم کیا اس سے پارہ کا سرخ آکسائیڈ حاصل ہوتا ہے جو پارہ اور ہوائی آکسیجن کے اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اب اگر اس مرکب کو گرم کیا جائے یا سورج کی مرکز روشنی ڈالی جائے تو وہ تحلیل ہوتا ہے۔ جس سے آکسیجن گیس خارج ہوتی ہے لیوزائر کا نظریہ بجلی کی طرح تمام علمی دنیا میں پھیل گیا اور اس کے ممتاز معاصرین نے اسکو صحیح تسلیم کرلیا اور آج تک بھی خیال صحیح سمجھا جاتا ہے۔

موت

از

جناب صاحبزادہ ڈاکٹر میر طاہر علیخاں مسلّم ام اے پی ایچ ڈی

اک بلاخانہ ہے دنیا پیشِ چشمِ اعتبار — دام گاہِ سخت ہے اور مزرعہ بے برگ و بار

نقش و زینت دہر کی داغِ پرِ طاؤس ہے — مدعا کی زشت پائی درخورِ افسوس ہے

خوار ہو جس جا بشر وہ مجلسِ امکاں ہے یہ — وحشت آبادِ ازل معمورۂ ویراں ہے یہ

رونے دے ہمدم مجھے رونے سے بہتر لے نہیں — قسمتِ انساں سے بہتر اور کوئی شے نہیں

اصل سے اپنی کوئی شے دور ہو جب ہمنشیں — زندگی برباد ہو برباد ہو جانِ حزیں

دیکھ کیا بیرونِ دریا ماہی بے آب ہے — دردِ پیہم، سوزِ پیہم پارۂ سیماب ہے

لعل ہے بیرونِ معدن خون میں ڈوبا ہوا — ہے صدف سے دور گوہر اشک میں ڈوبا ہوا

آبرو کچھ بھی نہیں ہر چیز کی "دور از وطن" — پھول میلے جاتے ہیں جا جا کے بیرونِ چمن

نکہتِ گل دور گل سے ہو کے آوارہ ہوئی — کارواں سے چھوٹ کر جمازہ آوارہ ہوئی

اشک جب آنکھوں سے ٹپکا ہو گیا قوتِ زمیں — دل میں رہ کر دل کو گرماتی ہے آہِ آتشیں

نالۂ نے پر گماں ہے نغمۂ داؤد کا — ہے ترنم گریۂ پیہم صدائے عود کا

نے نیستاں سے جو نکلی ہو گئی شرحِ فراق — ساز کے پردے سے باہر ہے صدا شرحِ فراق

چشمۂ شیریں ہوا ہے جب سے منبع سے جدا — کون ہے جس نے نہیں دیکھا اسے روتا ہوا

جا ملے محبوب سے خواہش ہے یہ مہجور کی — ہے اسی نقطے میں پوشیدہ حقیقت نور کی

موت گل کی ہے تبسم زینت افزائے چمن — جب نہاں آنکھوں سے ہو سورج ہے سورج کی کرن

موت سے ڈرتا ہے ظالم کس قدر ناداں ہے تو — واقفِ اسرارِ کل ہے سوچ بھی انساں ہے تو

لازمی دو رخ ہوا کرتے ہیں ہر تصویر کے
پشت و دم جیسے کہ دو حصے ہوں اک شمشیر کے

زندگی تصویر ہے شہ کارِ نقاشِ ازل
جس کے دو پہلو ہیں یعنی زندگانی و اجل

نامکمل زندگی ہے موت گر اس کو نہ ہو
موت مہمل چیز ہو گی زندگانی جو نہ ہو

کثرتِ تخلیق سے ہوتے ہنگامے بپا
جنگ چھڑ جائے کسی جا اور کہیں آئے وبا

زندگی ہوتی وبالِ جان ہے بعدِ شباب
زندہ رہنا عہدِ پیری میں ہے جانفرسا عذاب

ہاں مگر خاکِ فنا اس جا سرِ تمکیں پہ ہے
فطرتِ اللہ بھی جاری اسی آئیں پہ ہے

ہستی نو کرتی ہے اشیائے پارینہ کو دور
آئے دن ہوتا ہے دنیا میں حوادث کا ظہور

موت رحمت ہے یقیناً یاں پسِ طولِ حیات
موت اعمالِ بد دنیا کی ہے وجہ نجات

ہے بقا تیری عدم کی زندگی کا بندِ باب
ہے فنا تیری حیاتِ دنیوی کا انقلاب

زندگی ہے گر جہاں میں غنچہ باغِ ارم
موت ہے فرحت فزائے لذتِ خوابِ عدم

باعثِ تزئید قدر و منزلت باآب و تاب
شبنم افتادہ کو ہے یاں نگاہِ آفتاب

جب ہوا سیماب کشتہ خاک پر تاثیر ہے
کیمیا گر کے لئے بے جان ہی اکسیر ہے

ٹکڑے دو زنجیر کے ہیں اک شہود اور اک عدم
موت آ کر متصل کرتی ہے دونوں کو بہم

مر گیا انساں تو وجہ شورشِ میخانہ ہے
یعنی اس کی خاک سے جام و خم و پیمانہ ہے

چشمہ اک باریک آیا کوہ سے بہتا ہوا
کھو دیا خود کو جو دریا میں تو دریا ہو گیا

زندگی کا گر نہ سامانِ تجمل موت ہو
ہنس کے کیوں گل ہو فنا کیوں گا کے بلبل فوت ہو

بے اجل سازِ نفس اک سازِ بے آواز ہے
مرگ مرغِ روح کو گویا پرِ پرواز ہے

کشتی عمرِ بشر کا سچ کہوں ساحل ہے موت
کاروانِ زندگانی کی بے شبہ منزل ہے موت

مجرم ضمیر

از

جناب محمد اعظم خاں صاحب متعلم کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

میں ہفتہ بھر کی رخصت خلد آباد میں گزار کے حیدر آباد واپس آرہا تھا۔ پاسنجر عموماً مسافروں سے بھرا ہوتا ہے۔ مگر اورنگ آباد کے اسٹیشن پر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سکنڈ کلاس میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میں ایک سیٹ پر لیٹا تھوڑی دیر تک کتاب دیکھتا رہا مگر بار بار ہارڈی اینڈ کوڈ "ماہرین بصارت" کی یہ ہدایت یاد آتی کہ "کسی متحرک سواری میں کتاب دیکھنا آنکھوں کے لئے سخت مضر ہے" وہم بھی عجیب چیز ہے۔ تھوڑی دیر تک جب متواتر یہ خیال دل میں آتا رہا۔ تو واقعی مجھے آنکھوں میں کچھ تکلیف محسوس ہونے لگی۔ میں نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور سوچنے لگا کہ "ریل میں بہترین مشغلہ کونسا ہو سکتا ہے؟"

(۱) کتاب دیکھنا ؛ آنکھوں کے لئے نہ صرف مضر ہے بلکہ ریل میں کتب بینی کچھ اچھی طرح ہو بھی نہیں سکتی۔ ریل کی گھڑ گھڑ۔ ساتھیوں کی بک بک۔ اسٹیشنوں کی آمد اور وہاں کا ہنگامہ غرض دماغ کو بالکل سکون نہیں ہوتا ایسی صورت میں جو لوگ کتب بینی کرتے ہیں یقیناً ان کا مقصد نہ صرف ہم سفروں کو بلکہ خود اپنی ذات کو دھوکا دینا ہوتا ہے

(۲) مناظر قدرت کی سیر کرنا ؛ بے شک اچھا مشغلہ ہے مگر تھوڑی دیر میں اس سے بھی طبیعت بھر جاتی ہے اور بعض دفعہ پٹری کے دونوں جانب ٹیلیفون کا ایسا سلسلہ چلا جاتا ہے کہ اس کے سوا کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی یا گرد و پیش کا منظر ایسا یکساں اور غیر دلچسپ ہوتا ہے کہ جی اکتا جاتا ہے۔

(۳) ایک مشغلہ اپنے ہمراہیوں سے باتیں کرنے کا تھا جس میں دل بھی خوب بہلتا اور نئے نئے لوگوں سے ملنے مختلف طبائع کا اندازہ کرنے اور آپس کے تبادلہ خیالات سے معلومات عامہ میں وسعت اور خیالات میں جدت پیدا ہوتی۔ مگر آج کل مغربی اصول کی تقلید میں انجان آدمی سے باتیں کرنا بدتمیزی سمجھی جاتی ہے یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو انسانی فطرت ہم جنسوں کی صحبت چاہتی ہے اور دوسری طرف سوسائٹی کا خود ساختہ قانون بغیر تعارف کے کسی سے ہمکلام ہونے کی اجازت نہیں دیتا خدا جانے مغرب نے (جس کے اکثر اصول بہت سائنٹفک

ہیں اجان آدمی سے بات چیت کرنے کو کیوں معیوب قرار دیا ہے حالانکہ اس میں بہت سے فوائد اور مصالح مضمر
ہیں شاید یہ خیال ہو کہ جس طرح متکلم کے لئے یہ سلسلہ کلام خوشگوار ہوتا ہے بعض دفعہ مخاطب کے حق میں اتنا ہی عذاب ہو
مگر میرے خیال میں یہ اندیشہ چنداں صحیح نہیں۔ اس لئے کہ متکلم اپنے مخاطب کے چشم و ابرو سے باسانی معلوم کر سکتا
ہے کہ اس کی گفتگو میں وہ کس حد تک دلچسپی لے رہا ہے۔ اگر اسے یہ شبہ ہو کہ اس کی باتیں سننے والے کے لئے
کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں تو یقیناً وہ دو ایک سوالات کر کے خاموش ہو جائیگا اور اگر سامع نے مستعدی کے ساتھ
اس گفتگو میں حصہ لیا تو ایک خوشگوار اور دلچسپ سلسلہ کلام کا قائم ہو جانا بالکل قرین قیاس ہے غرض اس میں کوئی
شک نہیں کہ سوسائٹی کا یہ امتناعی حکم اکثر سفر کے موقعوں پر بہت شاق گذرتا ہے۔ مگر خیر مجھے تو خوش قسمتی
یا بدنصیبی سے ایسا موقع ہی نہیں پیش آیا تھا میں چپکا لیٹا انہی خیالات میں غلطاں رہا۔ آخر تنہائی سے طبیعت اکتا
گئی اور جس طرح تیسرے درجے کے مسافر ہر اسٹیشن پر اس کی پیش بندی کرتے رہتے ہیں کہ کوئی ان کے ڈبہ کا رخ
نہ کرے میں یہ کوشش کرنے لگا کہ خواہ مخواہ بھی کوئی میرے ساتھ بیٹھ لے۔ مگر ہر شخص کو میری طرح دل بہلانے والے
ساتھی کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ دیر تک میں اپنی کوششوں میں ناکام رہا ... "سیلو" کا اسٹیشن میرے حق میں
بڑا مبارک ہے۔ اس سے پہلے ایک دفعہ اسی اسٹیشن پر مجھے حسن نسوانی کا ایک ایسا مکمل نمونہ نظر آیا تھا کہ اس کے
دیکھنے کو اب تک آنکھیں ترستی ہیں اور اس دفعہ بھی میری ہمسفری کی آرزو یہیں پوری ہوئی۔ گاڑی چھوٹنے سے
کچھ پیشتر میں نے ایک خوبرو نوجوان کو اپنے ڈبے کے سامنے ٹہلتے دیکھا میرے دل میں یونہی خیال پیدا ہوا کہ
کیا اچھا ہو کہ اگر یہ نوجوان میرا ہمسفر ہو جائے، مگر اس کی بے پرواچال دیکھ کر مجھے اس کی کوئی امید نہ تھی یکایک
کیا دیکھتا ہوں کہ جونہی گاڑی حرکت میں آئی وہ نوجوان میرے ڈبہ کی سیڑھی پر چڑھ گیا اور دروازہ کھولنے کی کوشش
کرنے لگا۔ گھبراہٹ کے ساتھ اس نے ہینڈل کو ادھر ادھر گھمایا اور دروازہ کو پیچھے دھکیل دیا۔ دروازہ کسی طرح
نہ کھلا۔ گاڑی کی رفتار اب تیز ہوتی گئی۔ وہ مایوسی کے ساتھ دونوں طرف کے دستے پکڑ کر لٹک گیا یہ دیکھ کر میں نے
ایک جست کی اور دروازہ کا کھٹکا جو اندر سے بند تھا کھول دیا۔ نوجوان نے ڈگمگاتے ہوئے قدم اندر ڈالے اور منہ ہی
منہ میں شکریہ کے کچھ الفاظ کہتا ہوا آ کر ایک سیٹ پر دراز ہو گیا۔ اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ اس کی سانس
تیز چل رہی تھی۔ ان کی کشادہ پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟" میں نے تمام مغربی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر پوچھا "شکریہ آپ کا
میں بالکل اچھا ہوں۔ مگر۔ مگر" اس نے ہانپتے ہوئے کہا "دروازہ کھلنے میں جو دیر ہوئی اس سے میں پریشان

ہو گیا۔"

"ارے! میں نے تعجب سے کہا۔ آپ اتنی سی بات میں پریشان ہو گئے"

"تھوڑا سا پانی ہو تو ــــــ" اس نے کچھ تامل کے بعد کہا "میں ممنون ہوں گا!"

میں نے اسے صراحی سے پانی انڈیل کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی طبیعت سنبھلی ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ لڑکا بہت سمجھ دار اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ مختلف موضوع پر وہ نہایت بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ اظہار خیال کرتا رہا۔

مگر ایک چیز میں نے یہ محسوس کی کہ دورانِ گفتگو میں اکثر کھو سا جاتا جیسے کسی فوری خیال نے اسے چونکا دیا اس کے بعد تھوڑی دیر تک وہ غوطے میں رہتا پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتا۔ اتنے میں گاڑی کی رفتار سُست ہوئی مجھے اس لڑکے کے چہرے پر کچھ بے اطمینانی کے آثار نظر آگئے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کھڑکی میں منہ ڈال کر باہر دیکھنے لگا۔ وہاں سے پلٹ کر وہ سیٹ کے آخری کونہ میں جا بیٹھا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ مگر اس وقت اس کی گفتگو کچھ بے ربط اور پریشان سی تھی جیسے کسی کی خاطر جمع نہ ہو۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ہم میں پہلے کی طرح ایک طویل اور دلچسپ بحث کا سلسلہ چھڑ گیا۔ مگر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ جب گاڑی کی رفتار کے ساتھ میں نے اپنے ساتھی کی باتوں کی رفتار بھی دھیمی ہوتے دیکھی۔ یہاں تک کہ جب دوسرے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری تو میرے ہم سفر کی ساری خوش طبعی اور زندہ دلی بھی ٹھیر چکی تھی مجھے اس کے چہرہ پر پھر اُسی پریشانی کی جھلک نظر آنے لگی۔ اب میرے لئے معاملہ کی تہ تک پہنچنا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ جذبہ اور عقل کی وہی پرانی جنگ ہے ایک طرف اس لڑکے کا جذبہ عزت پسندی اور راحت طلبی اسے سکنڈ کلاس میں بیٹھنے پر مجبور کر رہا تھا تو دوسری طرف عقل نتیجہ کا تصور پیش خاطر لاکر ڈراتی تھی۔ دل میں آیا کہ اسے اس بارے میں کچھ نصیحت کروں مگر اس کی دلشکنی کے خیال سے خاموش ہو گیا۔۔۔۔۔۔

چھوٹی لائن پر سفر کرنے والوں کو معلوم ہو گا کہ "سیلو" کے بعد پیلا بڑا اسٹیشن "پربھنی" آتا ہے۔ پربھنی پر بہ مشکل گاڑی ٹھیری تھی کہ میرا ساتھی پلیٹ فارم پر کود پڑا اب مجھے اس کے افعال کی نگرانی میں ایک خاص لطف آرہا تھا میں نے دیکھا کہ وہ ادھر ادھر دیکھتا لوگوں کی نظریں بچاتا۔ ریفرشمنٹ روم کی طرف بڑھا راستے میں ہر شخص کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گویا یہ بھانپ رہا ہے کہ کہیں کوئی شخص اس کا ٹکٹ تو نہیں چیک کرنا چاہتا حالانکہ اس آپا دھاپی میں کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی نے سیٹی دی تو میں نے اپنے نئے دوست کو پلیٹ فارم پر ڈبہ کے بالکل قریب ٹہلتے دیکھا وہ کوری کوری نگاہوں سے ہمارے ڈبہ کو دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی ٹکٹ کلکٹر تو اس میں نہیں کھڑا ہے۔ آخر گاڑی چلنے سے کچھ پہلے وہ آکر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ دو چار چھوٹے چھوٹے اسٹیشن آئے اور چلے گئے۔ یہاں تک کہ پونا جنکشن پر ہماری گاڑی غیر معمولی شور مچاتی جا پہنچی۔ میرا ساتھی ہمیشہ سے زیادہ ہراساں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں یہاں بھی اس نے وہی حرکت کی۔ یعنی بمشکل گاڑی ٹھیرنے پائی تھی کہ وہ کود پڑا اگر اس دفعہ قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ دو چار قدم سے زیادہ جانے نہ پایا تھا کہ ایک ٹکٹ کلکٹر نے اس سے پوچھا "آپ یہیں اتریں گے؟"

"جی ہاں" ۔ بدحواسی میں اس نوجوان نے کہہ دیا

"اچھا تو ٹکٹ مجھے دیدیجئے"

"اوہ! معافی چاہتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں یہاں نہیں اترونگا - مجھے حیدرآباد جانا ہے" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دبی آواز سے کہا۔ ٹکٹ انسپکٹر کو اس پر شبہ ہوا "اچھا خیر مجھے اپنا ٹکٹ دکھلائیے تو" اس نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نوجوان کا افسردہ اور پسیجا ہوا چہرہ دیکھ کر میرا دل اندر سے دکھنے لگا۔ میں نے اسکی ٹکٹ کی قیمت خود ادا کرنے کا قطعی تہیہ کر لیا۔ مگر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں نے کیا دیکھا؟ مجھے بڑا تعجب ہوا جب میری آنکھوں کے سامنے اس نے جیب سے ٹکٹ نکال کر ٹکٹ انسپکٹر کے ہاتھ میں دے دیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا ہر لمحہ میں سمجھ رہا تھا کہ اب ٹکٹ کلکٹر اس پر کچھ اعتراض کرتا ہے۔ مگر نہیں۔ اس نے غور سے ٹکٹ دیکھا اور اپنی قینچی سے کتر کر اسے واپس کر دیا۔ ٹکٹ لے کر وہ نوجوان آگے بڑھ گیا۔ اب میں سوچ میں تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ اگر اس کے پاس ٹکٹ موجود تھا تو اس گھبراہٹ کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ آخر میری سمجھ میں آیا کہ غالباً اس کے پاس تیسرے درجہ کا ٹکٹ ہوگا اور ٹکٹ کلکٹر نے شاید اسے ہمارے ڈبہ سے اترتے نہیں دیکھا۔ جس قدر میں نے غور کیا یہ خیال میرے دل میں پختہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ گاڑی پونا سے بھی روانہ ہو گئی۔ میرا ساتھی اب پھر اپنی جگہ پر واپس آ بیٹھا تھا اس کے چہرے سے بے چینی اور اضطراب کے آثار اب تک نہیں مٹے تھے۔ مگر اب مجھے اس قدر نیند آ رہی تھی کہ میں نے اس معمہ کو اس کے حال پر چھوڑا اور جھولے پر چڑھ کر اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

"آپ کے ساتھ شاید بچھونا نہیں ہے" میں نے پاؤں پر لحاف ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جی ہاں نہیں ہے" اس نے کچھ تامل اور تردد کے بعد کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو میرا المبا کٹ اور یہ تکیہ حاضر ہے" میں نے اپنے سرہانے کے دو تکیوں میں سے ایک کو کھینچتے ہوئے کہا۔

"شکریہ - آپ کا بہت بہت شکریہ" اس نے ہاتھ بڑھا کر دونوں چیزیں لے لیں اس کا چہرہ فرط مسرت سے چمکنے لگا گویا میرے اس فعل سے اس کی ایک بڑی پریشانی رفع ہوگئی۔ اس کے بعد میں روشنی کی طرف پیٹھ کر کے سو گیا۔ رات کو درمیانی اسٹیشنوں کی گڑبڑ اور ہنگامہ سے جب کبھی میری آنکھ کھلی میں نے اپنے ساتھی کو بے چین اور پریشان دیکھا۔

وہ کبھی آنکھیں بند کئے چپکے لیٹا دکھائی دیا کبھی کھڑکی کھول کر جھانکتا نظر آتا۔ نظام آباد کے اسٹیشن پر دو تین اور مسافر ہمارے ڈبہ میں آگئے۔

میں نے دیکھا کہ میرا نوجوان ساتھی جو اب تک دم سادھے پڑا تھا۔ فوراً المبا کٹ منہ پر ڈال کر خراٹے لینے لگا کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ معمہ کیا ہے۔ اس لڑکے کی صورت سے یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ وہ چور ہے یا کوئی اور جرم کرکے آیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اپنے پاس یہ سمجھا تھا کہ اس کے پاس ٹکٹ نہ ہوگا سو یہ خیال بھی غلط نکلا۔ اب بجز اس کے اور کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ شاید تیسرے درجہ کا ٹکٹ لے کر وہ دوسرے درجہ میں سفر کر رہا ہے۔ غرض اسی ادھیڑ بن میں میں بے خبر سو گیا۔ اس کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو روز روشن تھا میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ گاڑی کی چال سست ہونے لگی۔ میں نے جھک کر سامنے کے شیشے میں سے دیکھا تو ایک اودے رنگ کے تختہ پر سفید حروف سے "بلارم" لکھا نظر آیا میں جلدی سے نیچے اتر پڑا اور اپنا سگار بکس لے کر غسل خانہ کی طرف چلا۔ اپنے ساتھی کو میں نے دیکھا کہ وہ تمام ضروریات سے فراغت کرکے کپڑے پہنے سیٹ کے ایک کنارے بیٹھا ہے سلام علیک کرکے میں حمام میں چلا گیا جس وقت میں دروازہ بند کرنے کے لئے پلٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا المبا کٹ اور تکیہ جو رات میں نے اس نوجوان کو دیا تھا میرے بچھونے پر لحاف کے قریب رکھا ہے اپنی ضروریات سے فراغت کرکے میں حمام سے باہر نکلا ہی تھا کہ سکندرآباد کا اسٹیشن آگیا۔ گاڑی پوری طرح ٹھہرنے نہ پائی تھی کہ ایک ٹکٹ کلکٹر ہمارے ڈبہ پر چڑھ آیا۔ ان تینوں مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے کے بعد جو نظام آباد سے ہمارے ڈبہ میں آئے تھے وہ میرے قریب آیا اور میرے ٹکٹ کی تنقیح کرکے اس نوجوان کی طرف پلٹا اس وقت میری نگاہیں پوری طرح اس لڑکے کے چہرہ پر جمی تھیں نوخیز آفتاب کی ہلکی شعاعیں اس کے چہرے پر چمک رہی تھیں۔ اندرونی جذبات کے اثر سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ اس کی چوڑی اور گوری پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے اس کے پتلے ہونٹ خشک ہوگئے تھے۔ اس کمسن بھولے چہرے کو اس طرح خوف و ندامت کا شکار ہوتے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

میں جلدی سے اپنا بٹوہ سنبھال کر دو ایک قدم اس کی طرف بڑھا۔ مگر آپ کیا سمجھتے ہیں میں نے کیا دیکھا؟ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی جب میں نے اس نوجوان کو نیلے رنگ کا ایک ٹکٹ پیش کرتے دیکھا۔ اس کا خوف زدہ چہرہ دیکھ کر غالباً ٹکٹ کلکٹر بھی کھٹک گیا تھا۔ اس نے ٹکٹ لیا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ کبھی مقام روانگی کو دیکھتا اور کبھی منزل مقصود کو۔ اس نے ایک طرف الٹ کر ٹکٹ کی تاریخ کو دیکھا تو دوسری طرف پلٹا کر اس کی قیمت پڑھی۔ جب اس کی دو آنکھوں نے مع عینک کے دو شیشوں کے اسے یہ یقین دلایا کہ ٹکٹ "ان جی۔ ایس۔ آر" کے سکنڈ کلاس کا سیلو سے حیدرآباد دکن تک ہے تو وہ مشتبہ نظروں سے نوجوان کو دیکھتا ہوا ٹکٹ پر پنسل سے کچھ نشان کر کے واپس چلا گیا۔ اس اثنا میں نوجوان کے چہرے پر مردنی چھا رہی تھی۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اٹھ کر میری صراحی میں سے نہار منہ ایک گلاس پانی پیا۔ میری عقل گم تھی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ آخر میں نے اس نوجوان سے ٹکٹ مانگا۔ اس نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا اور ٹکٹ دے دیا۔ میں نے لے کر دیکھا تو واقعی ٹکٹ سیلو سے حیدرآباد تک سکنڈ کلاس کا تھا تاریخ بھی کل ہی کی پڑی کسی طرح یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر گاڑی پہنچ گئی اور [illegible] شش و پنج میں تھا۔ میرا نوجوان ساتھی بہت سے شکریوں کے بعد مجھ سے رخصت ہو کر زنانہ سکنڈ کلاس پر پہنچا۔ اور اس میں سے ایک برقع پوش عورت کو اتار کر سامنے کے پل کی طرف روانہ ہوا میں بھی اپنا سامان اتروانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میری نظر اسٹیشن کے وسیع گیٹ پر پڑی اس کے قریب میں نے اپنے نوجوان دوست کو اسی برقع پوش عورت کے ساتھ جاتے دیکھا۔ یکایک میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح دوڑ گیا۔ میں نے اپنا سامان قلی ہی پر چھوڑا اور ریلوے لائن کو عبور کر کے بے تحاشا پھاٹک کے پاس پہنچا۔ واقعی میرا خیال صحیح نکلا اس نے گیٹ کے ٹکٹ کلکٹر کے ہاتھ میں صرف ایک سکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیا اور دوسرا تھرڈ کا

غزل

از

جناب محمد عبد السلام صاحب ذکی

شیشہ وہ دل کا توڑ کے کہتے ہیں ناز سے — آواز اس شکست کی بہتر ہے ساز سے

تعمیر دل میں صرف ہوئی قدرتِ خدا — یہ گھر بزرگ تر ہے حریم حجاز سے

تر دامنی جدا ہے جدا پاک دامنی — پاکی دل عیاں ہے رخِ پاکباز سے

ہے منحصر بلندیِ دل قدر عشق پر — محمود بڑھ کے ہو نہیں سکتا ایاز سے

بندے جو عشق کے ہیں نہیں ہے انہیں غرض — واعظ کے حکم غیر جواز و جواز سے

قصدِ گنہ کے قبل گنہگار کے لئے — ہے حکم عفو رحمتِ بندہ نواز سے

رکھنے سے خاک پا پہ تیری جگمگا گئی — روشن نہیں ہے مہر جبینِ نیاز سے

ہے داغِ عشق دل میں کہ اک آفتاب ہے — گرمی جہاں میں ہے مرے سوز و گداز سے

جز شوق راہ زادِ سفر کچھ نہ تھا ذکی — تا دوست پہنچے ہم رہِ دور و دراز سے

جارج برکلے

از

جناب غلام گوہر علی خاں صاحب

حقیقت کی تلاش، حقیقت کی کنہ اور حقیقت کا پتہ لگانے کا نام فلسفہ ہے ہر انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ غور کرے کائنات کا دریائے ناپیدا کنار جس کے ایک گوشہ میں آفتاب ومہتاب و دیگر سیارے تیر رہے ہیں اور جس میں ہر آن وہر لحظ کروروں ہستیاں اگتی اور فنا ہوتی ہیں آخر اس کا نقطہ آغاز و انجام کیا ہوگا۔

بہت سے مفکرین نے اس سوال کا جواب علوم عقلیہ کی روشنی میں ڈھونڈا عقلی علوم کی بہت سی شاخیں ہیں لیکن لیکن ان کو اجمالی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کا نام سائنس اور دوسرے کا نام فلسفہ ہے۔ اول الذکر کا تعلق زیادہ تر فطرت کے ان واقعات سے ہے جو ہمارے زیر تجربہ ہیں اور جو چیزیں ہمارے احساس ومشاہدہ سے خارج ہیں سائنس کو ان کے انکار و اقرار سے کچھ بحث نہیں چنانچہ لیتھر جو فرانس کا ماہر سائنس ہے لکھتا ہے کہ "کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدہ کی رسائی ممکن نہیں اس لئے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں جس طرح انکار ہمارا کام نہیں اسی طرح اس کے وجود کو بھی ثابت کرنا ہمارے مقصد سے باہر ہے یعنی ہمارا کام انکار و اثبات دونوں سے الگ ہے" اسی خیال کی تائید ہکسلے نے ان الفاظ میں کی ہے "اس سائنس کا آغاز اشیا کی جانب چند سلسلوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے تو پھر آخری نقطہ تک اس کی رسائی کیسے ممکن ہو سکتی ہے" اور دوسری جگہ کہتا ہے" اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی ہے۔ اور نہ اس کو دینا چاہیے" اس سے معلوم ہوا کہ سائنس "حقیقت" کے متعلق زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ فلسفہ والوں نے اس سوال کو چھیڑا اور اس کوشش میں فلسفہ کے نتائج کبھی کبھی مذہب سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ یہی تصادم ہیں جن کی وجہ سے دنیا میں شور غوغا بپا ہے کہ فلسفہ، مذہب کا سخت ترین دشمن ہے، جو غلط ہے فلسفہ میں جن امور کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے ان کا تعلق مشاہدے اور حس سے نہیں ہوتا ہے بلکہ انسان محض اپنی عقل کے زور سے ان غیبی امور تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مختلف لوگوں (فلسفیوں) کی رائے مختلف ہو اور تاریخ

فلسفہ کے مطالعہ سے ہوتا ہے کہ ان کی مثال ٹھیک اس اندھے کی سی ہے جو صرف ہاتھ سے چھو کر ہاتھی کی شکل و صورت کے متعلق رائے قائم کر رہا ہو۔ ع صورت ندیدہ راتقیں بہ تخمین کردہ اند۔ فلسفیوں کے عام اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ میں فلسفہ کو چار مکتبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق تھوڑی سی بحث کرنے کے بعد ہم اپنے اصلی مقصد لینے برکلے کی زندگی طرف واپس ہونگے۔ ان ابتدائی امور سے برکلے کے فلسفہ کی توضیح ہوتی ہے

(۱) ثنویت (دوئی)

اس گروہ کا خیال ہے کہ صفت کے مختلف مظاہر ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔ اس لئے ان کے سرچشموں کو بھی علیحدہ ہونا چاہئیے اسی بنا پر انہوں نے عالم کی بنیاد دو چیزوں پر قائم کی ہے۔ ایک روح یا خدا جو حیات مطلق ہے اور دوسرا مادّہ۔

(۲) مادیت :-

اس گروہ کا خیال ہے کہ غیر حیاتی صفات کا سرچشمہ جس طرح ارسطو وغیرہ کے نزدیک مادہ ہے۔ اسی طرح حیاتی صفات بھی دراصل مادہ ہی کی ایک مثال ہیں۔ مادہ اپنی ابتدائی حالت میں صرف طول، عرض، سختی، نرمی، وغیرہ کی صفات سے موصوف ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس میں مزید صفات کا اضافہ ہوتا ہے جیسے نشوونما و بالیدگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور ارتقا کا ایک درجہ یہ بھی ہے کہ اس میں ذہنی ادراک و شعور و ارادہ وغیرہ کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں گویا یہ ساری صفات براہ راست مادہ کی ہیں یعنی مادہ قادر کائنات ہے جو خود اپنے رحم سے تمام نتائج برآمد کرتا رہتا ہے۔

(۳) ارتیابیت (لاادریت) :-

ارتیابیت کے معنی شک کے ہیں۔ اس گروہ نے ہنگامہ آرائیوں کو دیکھکر اعلان کیا کہ ہم کو کچھ نہیں معلوم کہ اس عالم محسوس کا اصلی اور آخری سرچشمہ کیا ہے مادہ ہے یا خدا؟ یعنے اس جماعت کا خیال ہے کہ ہم کو خدا اور مادہ دونوں کے انکار و اقرار سے کچھ بحث نہیں

(۴) تصوریت (روحیت)

اس گروہ کا خیال ہے کہ جس طرح حیاتی صفات کا سرچشمہ خدا یا روح ہے اسی طرح غیر حیاتی صفات بھی اسی روح کی جلوہ آرائیوں کا نام ہے یہاں کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے روح ہے۔ اسی کی مختلف صفات کا ظہور مختلف چشموں سے ہو رہا ہے کہیں پر اس کا نام شعور ادراک علم و ارادہ ہے اور کہیں اس کو طول و عرض سختی اور نرمی سے موسوم کرتے ہیں۔ مادہ ایک بے معنی سی چیز ہے صرف روح یا خدا ہی ہے جو اپنی مختلف شانوں کے ساتھ جلوہ آرائے عالم ہے

برکلے جس کا نام نامی اس مضمون کا عنوان ہے اس جماعت کا زبردست علمبردار ہے۔

یہ قدرت کا عجیب راز ہے کہ جب وہ کسی قوم یا ملک کی حالت کو درست کرنا چاہتی ہے تو اس قوم و ملک کے واقعات کو یک دم بدل دیتی ہے اور اس میں ہمدردان قوم پیدا کرتی ہے بالکل یہی واقعہ سترہویں صدی میں یورپ اور انگلستان کے ساتھ پیش آیا۔ سترھویں صدی میں یورپ اور انگلستان میں ایک عجیب قسم کی بیکلی پھیلی ہوئی تھی وہ اپنے دیرینہ خیالات کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی یا علمی ہر ایک چھوڑ رہا تھا۔ مذہب میں یہ تبدیلی ہوئی کہ رومن کیتھولک کی جگہ پروٹسٹنٹ نے لی سائنس اور ریاضیات میں نئے نئے قوانین اور نظریوں کا اضافہ ہوا چنانچہ زمین کی حرکت اور قانون کشش اجسام عالم وجود میں آئے علم فلسفہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس نے بھی ایک پلٹا کھایا اور ہمارا نامور ہیرو برکلے بھی اسٹیج عالم پر نمودار ہوا جو حقیقت میں اس دور کے مفکرین کے لئے مایۂ ناز ہے۔ ذیل میں ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس نامور فلسفی کی زندگی کے خاص خاص واقعات و تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

برکلے، ۱۲ مارچ ۱۶۸۵ء میں پایہ تخت ڈبلن سے پچھتر (۷۵) میل کے فاصلہ پر مشہور تھامس ٹاؤن Thomastown. کے پاس ڈائی سرٹ کیاسل Dysert castle نامی ایک چھوٹی سی آبادی میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام ولیم برکلے تھا۔ خاندان (برکلے) معزز و باوقعت تھا اس کی نشو و نما انگلستان میں ہوئی تھی۔ مگر ولیم برکلے عسرت کی وجہ سے انگلستان چھوڑنے پر مجبور ہوا اور آئرلینڈ کی سکونت اختیار کی اور یہیں پر جارج برکلے پیدا ہوا۔ اسی مناسبت سے بعض مؤرخین اس کو آئرش فلسفی کہتے ہیں۔ مگر یہ غلطی ہے کیونکہ خود برکلے خود اپنے آپ کو انگلش مین کہتا ہے

افسوس اس امر کا ہے کہ اس مشہور فلسفی کی ابتدائی پندرہ سالہ زندگی بالکل پردہ خفا میں ہے مگر ۱۶۹۶ء میں یہ کلکنی کے مدرسے میں سکنڈ کلاس میں شریک نظر آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے وہ ذہین و فہیم تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جو خصوصیت اس میں نمایاں تھی وہ یہ کہ اس میں بچپن ہی سے فکر و سوچ کا مادہ تھا چنانچہ وہ خود لکھتا ہے کہ "میں چھوٹی سی عمر سے بے اعتمادی اور شکی واقع ہوا تھا" پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۷۰۰ء میں ٹری نٹی کالج ڈبلن Trinity college. میں آکر میٹرکولیشن پاس کر کے ذاتی محنت و ذکاوت کی بنا پر وظیفہ حاصل کیا اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یعنی ۱۷۰۴ء میں بی اے اور ۱۷۰۷ء میں ایم۔ اے کی ڈگری لے کر کالج کا فیلو ہو گیا۔ اس زمانہ میں اس کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا احساس اور جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس کو ایک حد تک جنون کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی احساس کا اثر تھا کہ وہ ایک پھانسی کے منظر کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ ایک دوست کے ذریعہ اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈلوا کر پھانسی کے مزے یا احساس کو دیکھنا چاہا۔۔ اگر جلدی نہیں کی جاتی تو اس زبردست فلسفی کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو جاتا مگر قدرت کو

منظر نہ تھا کہ اس کے ذریعہ اہم کام انجام پائیں - اس لئے بچ گیا - وہ صرف ان ہی تجربات میں مشغول نہیں تھا بلکہ وہ ایک گہرے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کی زندگی میں مستغرق تھا - وہ ہر قسم کے علوم سے خواہ وہ سائنس سے متعلق ہوں یا ریاضی سے یا ہیئت سے یا فلسفہ سے کماحقہ واقفیت رکھتا تھا

ابھی وہ اپنی زندگی کے بائیس سال بھی ختم کرنے نہ پایا تھا کہ ۱۷۰۷ء میں اس نے ریاضیات پر دو چھوٹے رسالے لکھے اور ۱۷۰۹ء میں ایک معرکۃ آلارا کتاب "جدید نظریہ رویت" New Theory of Vision کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کی - اس میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ آنکھ سے بجز رنگ و روشنی کے کسی اور چیز کا احساس نہیں ہوتا ہے اعتدا د فاصلہ وغیرہ کو محسوسیت بصر میں داخل کرنا سخت غلطی ہے یہ کتاب اس کی آئندہ مہتم الشان زندگی کا پیش خیمہ تھی کیونکہ یہ بہت مقبول ہوئی اور جلد ہی دوسرے اڈیشن کے چھاپنے کی ضرورت لاحق ہوئی - اب نوجوان فلسفی کا حوصلہ بلند ہو گیا - اس کے مشاہدات اور تجربات کے لئے وسیع کائنات اپنے دامن میں بے شمار نادرات لئے ہوئے تھی - فلسفہ کے شوق نے ہمارے اس نوجوان فلسفی کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک باقاعدہ جماعت یا کمیٹی کی بنیاد ڈالے جس میں مختلف عنوانات پر روز بحثیں ہوں اس کا پتہ ہم کو اس کی کتاب Common Place Book سے ملتا ہے جدید نظریہ رویت کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۷۱۰ء میں "مبادی علم انسانی" Principles of Human Knowledge کے نام سے ایک بہترین کتاب شائع پائی یہ برکلے کا مایۂ ناز اور زبردست کارنامہ ہے اور اسی بنا پر وہ جدید فلسفہ کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے اس میں اس نے مادہ کی حقیقت کو جو ہزاروں سال سے اہمیت رکھتی چلی آ رہی تھی بے حقیقت کر دیا - اس میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ انسان کے "ذہن و روح" سے باہر ایک ذرہ کا بھی وجود نہیں ہے اور تمام اشیا خواہ وہ ہمارے نزدیک ہوں یا دور ان کی حقیقت ان ذہنی احساسات کے علاوہ اور کچھ نہیں جن کو غلط فہمی سے موجودات خارجی کا مثنی کہا جاتا ہے - چنانچہ برکلے کے خیال کے مطابق انسان جو کچھ جانتا ہے اس کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ :-

(۱) وہ احساسات جن کا علم آلات حس کے ذریعہ ہوتا ہے

(۲) جذبات، غم و غصہ، خوشی و رنج، ارادہ وغیرہ

(۳) حافظہ، تخیل کی مدد سے اس کا اعادہ

ان میں سے آخری دو کا تعلق ذہن سے ہے اور مختلف احساسات مثلاً رنگ، مزہ وغیرہ کے مجموعہ کا کوئی ایک نام ہوگا - مثلاً آم جام شربت وغیرہ اور عوام نے اسی کو ایک خارجی شئے خیال کر کے اس کو مادہ کا نام دے رکھا ہے - لیکن برکلے اس خیال کا سخت مخالف تھا - وہ مثال کے طور پر کہتا ہے کہ جب ہمارے پیر میں کانٹا چبھتا ہے تو ہم اپنے اندر ایک

اثر محسوس کرتے ہیں جس کی تعبیر لفظ درد سے کیجاتی ہے مگر کیا اس درد کا کوئی نمونہ یا اثر کانٹے میں موجود ہے۔ مطلق نہیں پھر اسی طرح جب ہم کسی پتھر کو چھوتے ہیں تو اس وقت بھی ہم اپنے اندر ایک خاص قسم کا احساس پاتے ہیں جس کو لفظ سختی سے نامزد کرتے ہیں۔ جس طرح درد کانٹے میں نہ تھا۔ اسی طرح سختی پتھر میں نہ تھی بلکہ یہ ہمارے ایک احساس کا نتیجہ ہے گویا کوئی چیز ہمارے وجود سے باہر نہ تھی بلکہ جو کچھ تھا وہ ہمارا احساس تھا" تصورات حسی کا پیدا کرنا جاننا انسانی طاقت سے بالاتر ہے۔ چنانچہ کوئی شخص گھر سے باہر نکلتے ہی یہ نہیں کر سکتا کہ فلاں شخص یا چیز پہلے اس کو نظر آئے اور فلاں بعد۔ یہ اس کے بس سے باہر ہے اس لئے اس کو ایک ایسی ذی ارادہ اور قادر ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے جو تمام خیالات کو انسانی ذہن میں پیدا کرتی ہے۔ اسی کو برکلے روح یا خدا کہتا ہے۔ چنانچہ کلیسے مادہ کے وجود کا انکار آخر ان الفاظ میں کرتا ہے" آخر کار ہم اس خوفناک حقیقت کو جس کا نام مادہ رکھا گیا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ ہماری شعوری کیفیات کی ایک انجانی اور مجہول علت کا نام ہے"۔ برکلے کے فلسفہ کے تین عناصر ترکیبی ہیں (۱) خدا (۲) ذہن انسانی (۳) تصورات حسی" مبادی علم انسانی کی اشاعت گویا مادیت پر ایک زبردست حملہ تھا چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ یہ نہ صرف عوام کا بلکہ علما کا بھی نشانہ ملامت بنے بغیر نہ رہ سکا اور انہوں نے اس کا پڑھنا تک بھی گوارا نہ کیا۔ صرف لندن کے بعض علما نے اس کی کسی قسم کی مخالفت نہیں کی اور اس کا مطالعہ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ کیا۔

بالعموم یہ خیال لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہے کہ فلسفہ مذہب اور اصول مذہب کا سخت ترین دشمن ہے اگر ایسے لوگ تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کریں تو انہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ مذہب اور فلسفہ ہمیشہ دوش بدوش رہے۔ چنانچہ برکلے کہتا ہے کہ اگر فکری رفعت اور مسرت کا مبدا ار حکمت و فلسفہ ہے تو اخلاقی اور اجتماعی سعادت کا سرچشمہ مذہب اور تمدن ہے" اور بیکن کہتا ہے کہ "فلسفہ کا قلیل اور سطحی علم الحاد کی طرف مائل کرتا ہے۔ لیکن اس کا گہرا علم مذہب سے بالکل قریب کر دیتا ہے" چنانچہ برکلے کبھی حکیمانہ افکار میں مستغرق ہے تو کبھی وہ انجیل مقدس کے درس میں بہت ہی منہمک نظر آتا ہے۔ یہ اس کا مذہبی شغف کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ کالج کا ؟ (ایک مذہبی عہدہ) مقرر ہوتا ہے اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ ڈین کے جلیل عہدہ پر فائز ہوتا ہے۔ برکلے یورپ کی علمی زبانوں سے خاص واقفیت رکھتا تھا چنانچہ ۱۷۱۲ء میں یونانی زبان کا جونیر لکچرار مقرر ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یونانی زبان میں کافی مہارت رکھتا تھا اور لاطینی زبان کا تو وہ خاصہ عالم تھا۔ اسی زمانہ میں اس نے تھوڑے عرصے کے لئے لندن کا سفر اختیار کیا اور ۱۷۱۳ء میں سوفٹ نے اس کو دربار میں پیش کیا۔ اسی قیام لندن کے زمانہ میں اس نے مکالمات ([illegible]) شائع کی۔ یہ جدید نظریہ کی تائید میں ہے اور ادبی چاشنی بھی لئے ہوئے ہے۔

۱۷۱۵ء میں برکلے کو ایک ناگوار واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ یہ کہ اس کے بعض وعظوں سے جن کی بنیاد انجیل مقدس پر تھی عوام میں یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ وہ "شاہ پسند ہے" جس کی وجہ سے آئین پسند جماعت کے ہاتھوں اس کو تھوڑا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ ۱۷۱۳ء تا ۱۷۲۰ء کا بیشتر حصہ اس نے یورپ کے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ لندن کے قیام کے زمانہ میں اپنے عصر کے مشاہیر مثلاً جناتھن سوفٹ Swift، پوپ Pope، ایڈیسن، بشپ آربری، اسٹیل (Steele) سے ملاقات کی ایڈیسن کے کہنے پر سموئل کلارک سے ایک مباحثہ کی صحبت بھی قرار پائی اس زمانہ میں لندن (بلکہ تمام یورپ) میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی تھی جن کے نزدیک خدا، رسول، سزا و جزا، حشر و نشر، جنت و دوزخ وغیرہ وہمی ڈھکوسلے تھے یہ جماعت **آزاد خیال** کہلاتی تھی برکلے سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس قسم کے الحاد کو پھیلتا ہوا دیکھے۔ اس لئے اس نے قلم اٹھایا اور سر رچرڈ اسٹیل کے روزنامہ "گارجین" میں اس کے خلاف مضامین کا سلسلہ لکھنا شروع کر دیا۔ اسی قسم کی کتاب یعنی الحاد کے خلاف اس نے جزیرہ رہوڈ RHODE میں الی سفرن Alciphron لکھی جس کا ذکر آئندہ کیا جائیگا۔

نومبر ۱۷۱۳ء میں برکلے لارڈ پیٹر بارو Peter Borough کے ساتھ چپلین Chaplain اور سکرٹری کی حیثیت سے سسلی کو گیا۔ راستے میں پیرس، کوہ آلپس اور شہر ٹیورن وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا لیکن ۱۷۱۴ء میں ملکہ این کے انتقال کے بعد جارج تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے تمام مخالفین کو خدمات سے علیحدہ کر دیا۔ اس لپیٹ میں لارڈ پیٹر بارو بھی آ گیا اس کے ساتھ برکلے کو بھی لندن واپس آنا پڑا مگر اس طرح اس کی سیر و سیاحت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ایک سے زیادہ مرتبہ اسے ایسے موقعے ملے جس کی وجہ سے اُسنے یورپ کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں کی سیاحت نہایت اطمینان سے کی۔ اس کی سیر و سیاحت ایسی نہیں ہوتی تھی جیسا کہ آجکل بالعموم لوگ کرتے ہیں بلکہ وہ ہر مقام کا جغرافی محل وقوع، پیداوار، آب و ہوا، لوگوں کی تہذیب و معاشرت وغیرہ کو نہایت گہری نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سفر اٹلی کے دوران میں ایک عجیب و غریب واقعہ کا اظہار کرتا ہے وہ یہ کہ وہاں مشہور تھا کہ وہاں ایک بہت بڑی مکڑی ہوتی ہے جس کے کاٹنے سے آدمی مر جاتا ہے۔ اس کا علاج گانا ہے۔ جس کے سننے سے آدمی گھنٹوں ناچنے لگتا ہے۔ اس واقعے کے تجسس میں اس نے بہت کچھ دریافت کیا اور کئی ایک ناچ بھی دیکھے۔ اس سفر کے دوران میں اس کو ویٹی کن کے کتب خانہ کو دیکھنے کا موقع ملا اور اپنی یادداشت میں اس کے متعلق بہت کچھ واقعات چھوڑے ہیں جو ایک طالب علم کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ انہی دنوں میں یونیورسٹی سے اس کو اعزاز دیا گیا کہ وہ اپنے کالج کا سینیر فیلو مقرر ہوا۔ ۱۷۲۰ء کے آخر میں انگلستان مالی مشکلات میں بہت مبتلا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے ذمہ قرضہ کی اتنی کثیر رقم تھی جس کا سالانہ سود

۳۰ لاکھ پونڈ ہوتا تھا۔ اس قرضے کے بارے سے سبکدوش ہونے کی مختلف کوششیں کی گئیں منجملہ اور کوششوں کے ایک کوشش یہ بھی تھی کہ کمپنی کو جزائر جنوبی میں کمپنی کو اجازت دی گئی تھی اس کے معاوضے میں کمپنی والوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ سالانہ (۸) لاکھ سے زیادہ رقم حکومت کو دیتے رہیں گے اس کمپنی کے ڈائرکٹروں نے بہت بڑی رقم جمع کرکے اپنی عیاشیوں اور اور لغویات میں صرف کردیا۔ جس کی وجہ سے بہت سے شرکا تباہ و برباد ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یورپ اور انگلستان میں عیاشی اور بدکاری کا بازار گرم تھا۔ برکلے ان لغویات کو دیکھ کر بے چین ہوگیا اور ایک سالہ Essay towards Preventing the ruin OF GREAT BRITAIN ”برطانیہ عظمیٰ کو تباہی سے بچانے کی راہ“ کے نام سے گمنام شائع کردیا اس میں برطانیہ کی تباہی کے اسباب، لوگوں کی عیاشی، بدکاری، کاہلی و فضول خرچی وغیرہ کو قرار دیا ہے اور محنت جفاکشی راست گوئی اور سچے معاملے کی ہدایت کی تھی اور مثال کے طور پر دوسری اقوام کو پیش کیا تھا جنہوں نے اپنے درست معاملے اور محنت سے ترقی کی تھی اس سے برکلے کی عملی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

۱۷۲۱ء میں ڈبلن یونیورسٹی اس کو مختلف بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرتی رہی اور اس کو ڈاکٹری کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ برکلے کے اخلاق بہت وسیع تھے ہر شخص اس کے اخلاق شرافت اور کیریکٹر پر گرویدہ تھا چنانچہ اس کی تائید ایک واقعہ سے ہوتی ہے وہ یہ کہ مس الستھر جو ایک دولت مند تاجر کی واحد لڑکی تھی مرتے وقت وصیت کی کہ اس کی جائداد کا نصف حصہ برکلے کو دیا جائے اور لکھا ہے کہ برکلے اس سے صرف ایک مرتبہ ملا تھا اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ڈین کے عہدہ پر جو بشپ سے صرف ایک درجہ کم ہوتا ہے فائز کیا گیا۔ اب اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا تھا کہ امریکہ کے باشندوں میں مسیحیت پھیلانے کے لئے برموڈاس Bermudas میں ایک کالج کھولنا چاہیے اس کے اس خیال کی ہر طرف سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ آؤ بھگت کی گئی اور چندے بھی وصول ہوئے بڑی تگ و دو کے بعد گورنمنٹ نے بھی ۲۰ ہزار پونڈ مدد دینے کا وعدہ کیا (لیکن افسوس کہ یہ وعدہ کبھی بھی ایفا کا جامہ پہن نہ سکا اور اس وعدہ خلافی کا برکلے کے دل و دماغ پر سخت صدمہ پہنچا) برکلے اس کالج کا پہلا پریسیڈنٹ مقرر ہوا۔

۱۷۲۸ء میں اس کی زندگی میں ایک نیا اضافہ یا تبدیلی واقع ہوئی یعنی اس نے Judge Forester کی شریف لڑکی سے شادی کرکے جزیرہ رہوڈ Rhode کی سکونت اختیار کی اس جزیرہ کے تمام لوگ اس کو بہت عزیز رکھتے تھے اور یہاں کی خاموش فضا میں ۱۷۳۲ء میں مکالمات السوفران The minute Philosopher or Alciphron جس اس نے لکھا یہ برکلے کی ضخیم ترین تصنیف ہے اس میں برکلے نے مکالمہ کے طور پر ان آزاد خیالوں کی جو اس زمانہ میں زوروں پر تھے خوب خبر لی اور اس میں کل سات مکالمات ہیں۔ مگر مل کے خیال میں یہ کسی وقعت کی مستحق نہیں ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ یہ زیادہ

معمولی اور پیش پا افتادہ باتوں پر مبنی ہے اور اس کی حقیقت جدید نظریہ رویت اور مبادی علم انسانی سے پست ہے اس میں اس نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے افعال و کردار کا اس کے خیالات و عقائد پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس پر پہلے پہلے بہت اعتراضات کئے گئے لیکن برکلے نے نہایت سکون کے ساتھ ہر ایک اعتراض کو سنا اور ایک کا بھی جواب دینا مناسب نہیں جانا۔ اب برکلے نے دنیا کی مکاریوں اور عیارانہ چالوں سے تنگ آکر عزلت کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ قدرت نے بہت جلد اس کی آرزو کو پورا کر دیا کہ وہ ۱۷۳۴ء میں کلائن کی خاموش اور پرسکون آبادی کا بشپ مقرر کیا گیا اس سے یہ اندازہ نہ لگایا جائے کہ اس کی عملی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہوگا بلکہ اس نے قوم اور ملک کی مختلف طریقوں پر خواہ مذہبی ہو یا اقتصادی یا معاشرتی خدمت کی چنانچہ اس کی انتھک کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ ڈبلن کی فسق و فجور کی باضابطہ جماعت منتشر ہو گئی ڈبلن ہی اس کی صحت روبہ انحطاط ہوئی چنانچہ وہ اپنے سابق دوست ٹام پرائر Tom Prior کو لکھتا ہے کہ گو اس کی صحت مطالعہ وغیرہ کی مانع ہے لیکن اس کا دماغ اور قوت فہم برسر کار ہے چنانچہ وہ پہلے کی طرح دماغ پر دباؤ ڈال کر سوچ بچار کر سکتا ہے اور ان کا ابتدائی حصہ وہ ریاضیات سے متعلق غور و فکر میں گزارتا ہے اور اس کا نتیجہ ہم بشکل کتاب Analyst دیکھتے ہیں اس میں اعلیٰ ریاضیات پر سخت حملہ کیا گیا تھا کہ وہ انسان کو دہریت کے طرف لے جاتی ہے۔

ہندوستان کے موجودہ نازک زمانہ کو دیکھتے ہوئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس عظیم المرتبت فلسفی کے اقوال اور عملی زندگی کا تھوڑا سا خاکہ پیش کروں جو اس نے انگلستان کی تباہی اور مشکلات کے زمانہ میں اختیار کی تھی تاکہ ہمارے ہندوستان کے لیڈر اور خصوصاً مسلمان قائد اس سے سبق حاصل کریں کہ سچے محب وطن و قوم کیسے ہوتے ہیں برکلے کہتا ہے کہ :۔

(۱) جو لوگ اجنبی ممالک کا سامان اپنی آمد و آسائش کے لئے استعمال کرتے ہیں کیا وہ اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کا شمار اجانب میں کیا جائے

(۲) کیا وہ شخص جس کی عیش پرستی بیرونی مصنوعات کو ہضم کر جاتی ہے اور جس کی جفاکشی تبادلہ کے لئے کوئی دیسی صنعت مہیا نہیں کرتی ملک و قوم کے لئے ایک عذاب نہیں ہے!

(۳) کیا ہم اس فیشن پرستی کی بدولت تباہ نہیں ہو رہے ہیں؟ کیا مفلس قوم کے لئے دولت مند قوم کی نقالی مجہول نہیں ہے

(۴) کیا ہمارے لئے اب تک وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے تمام افکار کو ملکی ترقی کی سعی میں منہمک کر دیں۔

(۵) وطن پرست وہ ہے جو اپنے مفاد کو ملک اور قوم کے مفاد میں دیکھتا ہو۔ اور خود کو کل کا جزو سمجھتا ہو اور خود پرست وہ ہے جو اپنے جذبات کا غلام ہوتا ہے اور اپنے کو کل سمجھتا ہے

برکلے ملک و قوم کا سچا پرستار تھا ملکی صنعت کو فروغ دینے کے لیے آئرلینڈ کا دیسی کپڑا جو بدترین ہوتا تھا استعمال کرتا تھا غریبوں کی ہمت بڑھانے اور ان کو کام سے لگانے کی خاطر باوجود ایک زبردست حکیم ہونے کے سن کی کاشت اور سود کا کارخانہ کھول رکھا تھا اور خود عملی طور پر اس میں حصہ لیتا تھا ہمیشہ اپنے گھر میں جلسے کرتا تھا جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کسی طرح قوم کے دل میں درد پیدا کیا جائے باوجود ان تمام مصروفیتوں کے اس نے اپنا قدیم علمی شغلہ نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ۱۷۴۴ء میں سرس (Siris) شائع ہوئی اس میں (Tarwater) کے فوائد پر جو مرض چیچک میں ہوتے ہیں بحث کی تھی یہ برکلے کے وسیع معلومات کا مجموعہ ہے یہ بہت مقبول ہوئی اور یورپ کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اب اس کے دل میں دولت اور ترقی کی کچھ پروا بھی نہیں تھی جیسا کہ اس نے اپنے دوست ٹام کو ۱۷۴۶ء میں ایک خط میں لکھا ہے کہ "مزید دولت و ثروت کی فراوانی مجھے کلائن سے دور نہیں لی جا سکتی" افسوس کہ برکلے کی آخری زندگی ہر قسم کی تکلیف و مصائب سے پر رہی چنانچہ اس کی ضعیفی میں اس کا بڑا اور ہونہار فرزند ولیم ۱۷۵۱ء کو ۱۶ سال کی عمر میں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا۔ یہ صدمہ بوڑھے باپ کے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھا اس کا پتہ اس کی ذیل کی عبارت سے چلتا ہے کہ "عجب میں نے سیاست کی الجھنوں دعوتوں کی خوشیوں اور دنیاوی آرام سے دست کش ہو کر ایک گوشہ عزلت میں اپنی زندگی کے دن آرام سے گذارنے کا تہیہ کر لیا تھا" "یہ میری آنکھوں کا سرور جو میری خوشی اور آرام سب کچھ تھا جس کو میں نے پڑھا کر خدا کو خوش کیا تھا۔ اب خدا نے اپنے رحم کی ایک یہ شان دکھلائی کہ اس کو مجھ سے چھین لیا" ابھی اس ناگوار واقعات کی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہی تھی کہ اس کے قدیم اور سچے دوست ٹام پرائر نے بھی اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ ان دونوں واقعات کا اس کے دل و دماغ پر سخت صدمہ پہنچا۔ اس نے اپنی خدمت اسقف سے مستعفی ہونا چاہا۔ مگر اس کے پچھلے نمایاں کارناموں کو دیکھتے ہوئے اس کو خدمت پر بحال رکھ کر تمام ذمہ داریوں سے مستثنیٰ کیا گیا۔ مگر یہ بھی کلائن سے اکتا گیا تھا اس خط سے پتہ چلتا ہے جو اس نے کلائن چھوڑنے کے چار ماہ قبل ڈین گرویس Dean Gervous کے نام لکھا ہے اس کے چند جملے درج کئے جاتے ہیں "میری قسمت میں دنیا کی چالوں سے دوچار ہونا ہی لکھا تھا اور اب میرا مستقبل تنگ و تاریک ہے بڑے لوگوں اور بڑے کاموں میں حصہ لینے سے میں ہمیشہ پرہیز کرتا رہا ...... زندگی کی آخری شام میں نے تنہائی اور دنیاوی معاملات سے علیحدہ رہ کر گزارنی چاہی تھی ...... پہلے مجھے دولت مندوں اور اعلیٰ دماغ لوگوں سے دنیاوی لطف آتا تھا لیکن وہ اب میرے لئے ایک خواب ہے" اب اجل کا پیغام اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ ۱۴ جنوری ۱۷۵۳ء کو آکسفورڈ میں جہاں کہ وہ اپنے لخت جگر جارج کی تعلیمی دیکھ بھال کے لئے گیا ہوا تھا۔ اپنے داعی اجل کو لبیک کہا برکلے کے متعلق اس کا ہم عصر مایۂ ناز شاعر پوپ کہتا ہے کہ "دنیا میں کوئی نیکی یا خوبی ایسی نہ تھی جو برکلے میں نہ ہو"

حسیات

از

نبی الحسن صاحب شمیم بی اے

جلوہ یار نظر آتا ہے روپوشی میں — اب مجھے ہوش بھی آتا ہے تو بیہوشی میں

آتا ہے مجھ کو مرکزِ توحید کا خیال — منہ سے نکل نہ جائے کہ بندا نہیں ہوں میں

ہر دم یہی دعا ہے کہ بتیابیاں رہیں — یہ حال ہو گیا ہے کہ اپنا نہیں ہوں میں

میرے ہی دم سے ہے یہ مرے دل کی بیکلی — اپنے مرض کا آپ مداوا نہیں ہوں میں

دو عالم کا اک آئینہ چاہتا ہوں — تمہیں اک نظر دیکھنا چاہتا ہوں

آنکھوں کا نور ان کی تجلی کا نور ہے — ان کو جو دیکھتا ہوں تو ان کی نظر سے میں

حقیقت کھلی اپنی ناکامیوں سے — مرے سامنے آئینہ آگیا

تصور میں کرتا ہوں میں بند آنکھیں — مجھے آپ کو دیکھنا آگیا

ہماری طرزِ شکایت کسی کو کیا معلوم — تمہارا رنگِ طبیعت کسی کو کیا معلوم

ہر ایک خون کے قطرہ میں ہے تری تصویر — یہ انتہائے محبت کسی کو کیا معلوم

ہمارے اشکِ ندامت پروئے جائیں گے — بنے گا دامنِ رحمت کسی کو کیا معلوم

خدا کی یاد میں ہر وقت محو رہتا ہے — دلِ شمیم کی حالت کسی کو کیا معلوم

از

عبدالقادر سروری

"شاعری انسان کی اس فطری خواہش کا نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو وہ دیکھے یا سنے، ان کو اپنے طور پر پیش کرے یا جو خیالات اور جذبات اس کے دل میں موجزن ہوں، ان کو ظاہر کرے۔"

دیکھی یا سنی ہوئی باتوں کو پیش کرنے یا اپنے قلبی جذبات اور خیالات کو قلمبند کرنے کے اعتبار سے شاعری کی دو بڑی قسمیں ہو جاتی ہیں پہلی قسم کی شاعری خارجی شاعری کہلاتی ہے اور دوسری قسم کو داخلی کہتے ہیں۔

ایک قسم شعر کی وہ ہے جس میں شاعر اپنے موضوعات اور الہامات کی تلاش، خود اپنی ذات یعنی اپنے تجربات، خیالات اور جذبات کے اندر کرتا ہے۔ ایسی شاعری شخصی، ذاتی یا داخلی شاعری ہے کیونکہ اس میں شعری تحریکات شاعر کو اپنے ہی اندر سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم شاعری کی وہ ہے جس میں شاعر اپنی ذات سے ہٹ کر، اپنے اطراف کی وسیع کائنات پر نظر ڈالتا ہے اور اپنے کلام میں اپنے ذاتی احساسات اور جذبات کو بہت کم داخل کرتا ہے یہ غیر شخصی یا خارجی شاعری ہے۔ میر تقی میر کی غزل کی شاعری داخلی شاعری ہے اور ان کی مثنویاں خارجی شاعری کے ذیل میں آتی ہیں۔ غزل کی تمام شاعری عموماً داخلی شاعری ہوتی ہے اور یہ اپنی خصوصیات میں انگریزی کی "لی رک" شاعری سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ ہمارے پاس داخلی شاعری کا میدان اسی پر محدود نہیں ہے۔ رباعی بھی داخلی شاعری کے لئے مخصوص ہے اس کے علاوہ ہماری زبان کی تمام مذہبی قومی اور عاشقانہ شاعری داخلی شاعری ہی کے ذیل میں آجاتی ہے۔

داخلی شاعری کے چند ضروری عناصر یہ ہیں۔ شریف جذبات اور صداقت شعاری کے علاوہ حسن اور صفائی بیان کا اس میں پایا جانا ضروری ہے تناسب اور اختصار بھی اس میں زور پیدا کر دیتا ہے۔ داخلی شاعری میں عظمت اور ابدیت انہیں شاعروں کے حصے میں آئی ہے جو اپنے ذاتی محسوسات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہر پڑھنے والا ان کو اپنے جذبات سمجھنے لگتا ہے۔

داخلی شاعری اکثر غیر شعوری طور پر فلسفیانہ اور متصوفانہ شاعری بن جاتی ہے، سعدی، حافظ، عمر خیام، مولانائے روم

اور غالب کی شاعری اس کا اچھا نمونہ ہے مرثیہ بھی داخلی شاعری ہی کی ایک اہم صنف ہے۔ اگر وہ سادہ اور مختصر ہو جیسے غالب کا مرثیہ عارف اور حالی کا مرثیہ غالب۔ فارسی میں مرثیہ ہمیشہ داخلی رہا لیکن اردو میں یونانی مرثیہ کی طرح بہت سے خارجی مضامین بھی اس میں شامل کئے گئے ہیں۔ یونانی مرثیوں میں ہمارے موجودہ مرثیوں کی طرح مضامین کا بڑا تنوع ہوتا تھا جنگ وجدل کے واقعات، معاشرتی حالات اور بین یعنی مُردوں کے لئے آہ و زاری یہ سب قدیم یونانی مرثیہ کی خصوصیات ہیں جو اردو مرثیہ میں بھی موجود ہیں۔

خارجی شاعری کا اصل اصول جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے، شاعر کے ذاتی جذبات، خیالات اور محسوسات سے اس کا براہ راست تعلق نہ رکھنا ہے اس میں شاعر اپنے بطون اور جذبات سے قطع نظر کر کے بیرونی دنیا پر قلم اٹھاتا ہے داخلی شاعری میں تو مضامین کے لئے اپنے دل کے گوشے ٹٹولتا ہے، مگر خارجی شاعری کے لئے اس کو مواد بیرونی دنیا سے جمع کرنا پڑتا ہے گو اس کے بیانات میں اس کی ذات کی جھلک بھی موجود ہو سکتی ہے۔ قدیم زمانے کے گیت رزمیہ نظمیں، قصے، خصوصاً مہاتی قصے سب خارجی شاعری کے عنوان میں داخل ہیں۔ مغربی ادبیات میں ڈراماکی شاعری بھی خارجی شاعری کی ایک صنف ہے جو سب سے زیادہ اہم تصوّر کی جاتی ہے۔ اردو میں ڈراماکی صنف معین نہیں ہے۔ ڈراما کے مماثل اگر کوئی چیز ہے تو وہ میرانیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں کے کچھ پارے ہو سکتے ہیں۔ مرثیوں کے بعض حصّے بے حد موثر اور ڈراماکی ہیں۔ ان میں کردار بھی ہیں اور خود شاعر بھی ایک شخص قصہ کی حیثیت رکھتا ہے، ڈرامہ کا بڑا اہم جزو یعنے مکالمات بھی مرثیوں میں موجود ہیں۔

لیکن یہ تقسیم اس قدر وسیع ہے کہ اس کو حقیقت میں شعر کی تقسیم نہیں کہہ سکتے۔ اس سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ کسی خاص نظم کی نوعیت کیا ہے۔ اس میں خارجی کائنات پر بحث کی گئی ہے۔ یا وہ صرف شاعر کے بطون اور جذبات کا نقش ہے۔ اسی لئے ایک زیادہ محدود اور عملی تقسیم کی ضرورت ہمارے لئے ابھی باقی رہتی ہے۔

شعر کے مضمون یا موضوع کے اعتبار سے ذیل کی قسمیں ہمارے مطالعہ کے لئے زیادہ سود مند ثابت ہوں گی۔

(۱) رزمیہ شاعری (۲) بیانیہ شاعری (۳) ڈراماکی شاعری (۴) اخلاقی شاعری (۵) ہجو اور مزاحیہ شاعری (۶) مدحیہ شاعری (۷) مرثیہ (۸) موسیقیانہ شاعری (۹) شبانی یا دیسی شاعری۔

رزمیہ شاعری

شعری پیداواریں، رزمیہ شاعری سب سے بلند رتبہ رکھتی ہے۔ موضوع کی رفعت اسلوب کی سنجیدگی، بلاغت، رعب اور شکوہ کے اعتبار سے نقاد ہمیشہ اس سے مرعوب رہے ہیں۔ ارسطو نے اس کے مخصوص اوصاف جو دو ہزار سال قبل اپنی کتاب بوطیقا" میں بیان کئے تھے ان میں کچ

بھی سرمو فرق نہیں آیا۔ رزمیہ شاعری کے موضوع مہتم بالشان واقعات اور افعال ہوتے ہیں۔ ان میں ایک حد تک الجھاو کا ہونا ضروری ہے۔ اشخاص نظم ہمیشہ سربرآوردہ ہستیاں ہونی چاہئیں۔ اس کا نصب العین اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے۔ اسلوب اور طرز ادا نہایت سنجیدہ اور بلیغ ہو۔ نظم کے بنیادی محرکہ کا ارتقا مکالمات اور بیانات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ واقعات کی رفتار نہایت تیز اور چست ہوتی ہے۔

ان امور کو ملحوظ رکھ کر اگر اردو شاعری پر نظر ڈالیں تو حقیقی رزمیہ نظموں کی کمی ہم کو شدت کے ساتھ محسوس ہوگی۔ رزمیہ نظمیں ہمیشہ جنگ و جدل کے ماحول اور راہ ہوتی ہوں قوموں کے ادب میں پرورش پاتی ہیں یہ ماحول اردو شاعری کو نصیب نہ ہوسکا اس لئے طبعزاد رزمئیے اردو شاعری میں بہت کم پیدا ہوسکے ہیں۔ ... قدیم رزمیوں کے اتباع میں جو نظمیں لکھی گئی ہیں۔ وہ مشکل سے ہماری ادبیات العالیہ کا جزو بن سکتی ہیں۔

قدیم اردو میں بعض خالص رزمیہ نظمیں ملتی ہیں۔ جیسے سیوک اور غلام علی ... کی جنگ نامے خصوصاً رستمی کا "خاور نامہ" بہت ہی قابل قدر ہے۔

لیکن ان میں بھی بیشتر فارسی کے ترجمے ہیں۔ میر اور سودا کے زمانے سے پہلے اور بعد بھی خالص رزمئیے نہیں لکھے گئے۔ سودا کی شاعری کا رنگ زیادہ تر خارجی ہے۔ اور ان کا اسلوب پرشکوہ ہونے میں مشہور ہے۔ لیکن انہوں نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی صرف دو قصیدے ایسے ملتے ہیں جن میں جنگ کے کچھ حال بیان کئے ہیں یہ بہت ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ ان میں سودا نے اپنی عادت کے موافق واقعات سے زیادہ تخیل کی بلند پروازیوں سے کام لیا ہے۔

اردو شاعری میں انقلاب شروع ہونے سے کچھ عرصے پہلے سے رامائن، مہابھارت اور شاہنامہ کے ترجمے اردو میں کئے جانے شروع ہوئے تھے۔ انیس اور دبیر کے پاس جنگ و جدل کے بہت ہی نفیس مرقعے ملتے ہیں اس لئے ان کا شمار رزمیہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ لیکن انیس و دبیر کا مطمح نظر کبھی رزمیہ نہیں رہا۔ یہ چیز ان کی تجویز کی ایک ضمنی شاخ ہے تاہم ان شعرا کے اکثر مرثیوں کا بڑا حصہ جنگ و جدل کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرثیہ نگاروں کا مقصد حضرت امام حسینؓ اور آپ کے رفقا کے صرف انہیں واقعات کو بیان کرنا تھا جو آپ کے مکے سے نکل کر کربلا جانے اور شہادت پانے تک پیش آئے۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات میں سب سے زیادہ اہم یزید کی فوجوں کے ساتھ آپ کا مقابلہ ہے یہی مرثیوں کا منتہا بھی ہے۔ اس لئے فطرتاً مرثیوں کا اکثر حصہ رزمیہ ہو جاتا ہے اس کے علاوہ انیس اور دبیر نے بعض وقت اس تمام معاملے کے مختلف پہلوؤں پر بھی الگ الگ مرثئے لکھے ہیں انھیں میں ایسے مرثئے بھی ہیں جو صرف جنگ کے حالات پر مشتمل ہیں ... مرثیہ نگار شعرا کی صنعت گری نے ان مرثیوں کو اعلیٰ پایہ پر رزمیہ بھی بنا دیا ہے۔

موجودہ دور میں مہابھارت، رامائن اور شاہنامہ کے ترجموں کے علاوہ ملک کی قدیم تاریخی جنگوں پر بھی بعض نظمیں لکھی گئی ہیں۔ جیسے "پدمنی کا جوہر" (برق اچنوڑ) کی گذشتہ عظمت (سرور) وغیرہ

ابھی ابھی "شاہنامہ اسلام" کے نام سے ایک نظم حفیظ نے لکھی ہے۔ اس کا پہلا حصہ داستانی اور تاریخی ہے۔ اس لئے سوائے نام کی مشابہت کے اس میں اور فردوسی کے "شاہنامہ" میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ دوسرا حصہ تیار ہو رہا ہے اس میں رزمیوں کی بہت بڑی گنجائش ہے۔

بیانیہ شاعری شعر کی یہ قسم دوسری تمام قسموں سے زیادہ غیر معین ہے۔ اس میں افعال اور اعمال انسانی میں سے کوئی ایک فعل پیش کیا جاتا ہے اس لئے بعض وقت یہ رزمیہ شاعری سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تفصیلی (ڈسکرپٹیو) منظومات کی طرح جزئی حالات کی تفصیل بھی شامل ہو سکتی ہے اور مکالمے بھی داخل کئے جا سکتے ہیں رزمیہ نما بیانیہ شاعری میں اور رزمیہ میں فرق یہ ہے کہ بیانیہ شاعری میں فعل یا عمل کا متم بالشان ہونا ضروری نہیں ہے۔ بیانیہ نظمیں بہت زیادہ چست نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ان میں جزئیات کا ایک دوسرے سے گہرا اور علت و معلول کا علاقہ رکھنا لازمی نہیں ہے۔ طرز ادا میں رزمیہ کی اعلیٰ سنجیدگی ان میں مفقود ہوتی ہے اور واقعات نگاری زیادہ۔

اس نوع کی شاعری میں عموماً قصے، داستانیں اور تاریخی واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

اردو میں بیانیہ شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ قصے، داستانیں اور قدیم تاریخی واقعات نظم میں، اوائل ہی سے لکھے جانے لگے تھے قدیم اردو میں بہت سی مثنویاں ایسی ملتی ہیں جن کا پایہ بہت بلند ہے ان میں ادبی لسانی اور حسن کارانہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جدید شاعری سے پہلے کے دور کی اردو شاعری بھی، اس طرح کی نظموں سے مالا مال ہے میر حسن کا لازوال کارنامہ "سحر البیان" اسی زمانے کی پیداوار ہے۔ اس دور میں نہ صرف طبعزاد نظمیں لکھی گئیں۔ بلکہ قدیم فارسی نظموں کے ترجمے بھی کئے گئے چنانچہ نظامی کی "یوسف زلیخا" اور "لیلیٰ مجنوں" اور چندر بدن و مہیار "گل صنوبر" "مذہب عشق" وغیرہ اسی طرح کی نظمیں ہیں۔

جدید شاعری میں بیانیہ نظموں کا معیار اور زیادہ بلند ہو گیا ہے قصے اور تاریخی واقعات قدیم ہوں کہ طبعزاد، زیادہ حسن کارانہ اسالیب میں پیش کئے جا رہے ہیں خاص طور پر قابل ذکر، شوق کی نظمیں، طباطبائی، اور محسن کاکوروی، کیفی حیدرآبادی عزیز لکھنوی کے قصیدے اور سرور وغیرہ کی نظمیں ہیں۔

ڈرامائی شاعری ڈرامائی نظمیں، ایسی نظمیں ہیں، جو موسیقی کے ساتھ یا بغیر موسیقی کے پڑھ کر سنانے یا اسٹیج پر افعال

اور عمل کے ذریعہ پیش کرنے کی غرض سے لکھی جاتی ہیں مغربی زبانوں اور سنسکرت میں اس نوع کی نظمیں بہت لکھی گئی ہیں۔ لیکن اردو میں ایسی نظمیں ابتدا ہی سے مفقود ہیں۔ انگریزی ناٹک کی دلچسپیوں کے اولین اثرات نے نواب واجد علی شاہ اختر کے عہد میں امانت لکھنوی کو "اندرسبھا" کا ناٹک لکھنے پر مستعد کیا۔ امانت خود بلند پایہ شاعر نہ تھے اس لئے ان کا ناٹک وقتی دلچسپی سے زیادہ اہمیت کا مالک نہ بن سکا ان کے اتباع میں بعض اور اندرسبھائیں بھی لکھی گئیں۔ کلکتہ والی کی اندرسبھا اور مداری لال کی اندرسبھا بہت مشہور ہے لیکن یہ امانت کی "اندرسبھا" کے درجہ کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔

ڈرامائی شاعری کا اطلاق اردو میں منظوم، قصوں کے بعض حصوں سے قطع نظر عام نظموں کے چند خاص خاص اور راست گفتگو کی طرز میں لکھے ہوئے پاروں پر ہوسکتا ہے۔ شرر۔ رسوا اور کیفی حیدرآبادی نے اس طرز کی نظمیں اردو میں رائج کرنے کی خاص طور سے کوشش کی تھی لیکن عام رجحان ابھی تک اس طرف نہیں ہوا۔ رسوا نے اردو کی تمام مروجہ بحروں میں "لیلی مجنوں" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا۔ جو صرف اپنی جدت کی وجہ سے قابل ذکر ہے اس میں شعریت بہت کم ہے۔

یونانیوں نے ڈرامائی شاعری کی بھی دو ذیلی تقسیمیں کی تھیں۔ حزنیہ اور طربیہ۔ حزنیہ میں ایسے افعال پیش کئے جاتے ہیں جو اہم اور سنجیدہ ہوں، اور اپنی حد تک مکمل طربیہ ڈرامے وہ ہیں جن میں مضحکہ خیز افعال بتلائے جائیں۔ یہ دیکھنے والوں کو ہنساتے اور خوش کرتے ہیں۔ حزنیہ کا مقصد معمولی افعال انسانی میں پوشیدہ لازوال عظمت دکھانا ہوتا ہے اور طربیہ میں مضحک افعال کی تذلیل مدنظر ہوتی ہے۔

اخلاقی شاعری

شعر کی یہ وہ قسم ہے جس میں شاعر کا مطمح نظر، دنیا کو کسی اخلاقی سبق کا سکھانا، کسی مذہبی عقیدے کا سلجھانا یا کسی فلسفیانہ خیال کی توضیح کرنا ہو اس کے لئے بعض وقت فلسفیانہ شاعری کا عنوان بھی دیا جاتا ہے۔ مذہبی اور متصوفانہ شاعری اس کی شقیں ہیں۔ اخلاقی شاعری میں شاعر گویا معلم کی خدمت انجام دیتا ہے۔

اخلاقی شاعری کا ذخیرہ ہر زبان میں محدود رہا ہے۔۔ وسیع معنوں میں، فنون لطیفہ کی طرح شعر کا بنیادی مگر غیر شعوری مقصد اخلاق انسانی کی تہذیب ہونی چاہیئے تاہم یہ مرحلہ ایسا نازک ہے کہ بڑا صناع ہی اس میں کامیاب اتر سکتا ہے۔ فارسی میں اخلاقی شاعری کو دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ فروغ نصیب ہوا۔ سعدی شیرازی کی خالص اخلاقی شاعری اس نوع کا قابل رشک کارنامہ ہے فارسی کے اتباع نے اردو میں بھی بہت سے اخلاقی شاعر پیدا کئے۔ لیکن میر درد کے سوا کسی کو اختصاصی درجہ نصیب نہ ہوسکا لیکن میر درد کی پوری شاعری اعلی تصوف کے نکات سے بھری ہوئی ہے۔ انقلاب سے پہلے کے دور میں صرف مرزا غالب کی شاعری میں رسمی تصوف کے ساتھ ساتھ

اکثر جگہ ذاتی محسوسات کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ اور بقول حالیؔ غالبؔ کی شاعری کا یہ مخصوص اور لازوال پہلو ہے۔ موجودہ شاعروں میں حسرتؔ۔ جوشؔ۔ فانیؔ وغیرہ کا رنگ بھی متصوفانہ ہے۔

اردو شاعری پر نہ صرف اسلامی تصوف کا رنگ چڑھا، بلکہ ہندو ویدانت کے فلسفہ سے بھی یہ ایک حد تک متاثر ہوئی۔ اکثر ہندو شعرا جیسے مہرؔ، شیداؔ۔ شیو برت لال وغیرہ کی نظمیں اس کی شاہد ہیں

ہجو اور مزاحیہ شاعری

اخلاقی شاعری میں، شاعر معلم کا کام کرتا ہے تو ہجویہ شاعری میں اس کا منصب محتسب اور نقاد کا ہوتا ہے۔ شعر کی ان دونوں قسموں میں وہ تعلق ہے جو کسی مملکت کے محکمہ عدالت اور محکمہ تعلیمات میں ہوتا ہے۔ اخلاقی شاعری کا مقصد اخلاق انسانی کی تہذیب فراست اور دانائی کی تلقین اور نیکی کی طرف راہنمائی ہے۔ اور ہجویہ شاعری کا مطمح نظر برائیوں کا قلع قمع اور جہالت کو بے نقاب کرنا ہے ہجو نگاری گویا مہذب سوسائٹی کا ایک لازمی جزبن گئی ہے کیونکہ بہت سے جرم ایسے ہیں جو قانون کی حد سے باہر ہیں۔ ہجو کی پہنچ ان مجرموں تک بھی ہے جو قانون اور عدالت کے شکنجے سے صاف بچ جاتے ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخلاقی شاعری کے ذریعہ یہ کام یوں انجام دیا جائے لیکن ہجو نگاروں کے نظریہ کی رو سے دنیا میں ایک طبقہ ہر وقت ایسا بھی موجود رہتا ہے جس کا قانون کچھ بگاڑ نہیں سکتا اور اخلاقی تلقینات کچھ بنا نہیں سکتی اخلاقی تلقینات کے اثر کے لئے یہ گروہ مردہ ہوتا ہے اس لئے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ایسے خطا کاروں پر دنیا کو ہنسایا جائے اور ان کے کردار کا تجزیہ کرکے ان کے پوشیدہ عیوب کا خاکہ اڑایا جائے خاکہ اڑانے سے شاعر کا مقصد خاطی کی حس کو متاثر کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کو شرمندہ کرنا ہوتا ہے

ہجوی شاعری کی تین اہم ذیلی قسمیں ہیں۔ اخلاقی[۱]۔ شخصی[۲] اور سیاسی[۳]۔ اخلاقی ہجو کا مطمح نظر معاصرین کی اخلاقی کوتاہیوں کا مضحکہ اڑانا ہوتا ہے۔ میرؔ اور سوداؔ کی چند ہجویں اس نوع کی ہیں۔ عام ہجوؤں کے برخلاف ان کا پایہ بہت بلند ہے میرؔ کا مسدس "شہر آشوب" اور "جھوٹ" اور سوداؔ کے قصیدے "شہر آشوب" اور "تضحیک روزگار" وغیرہ عمومیت اور ادبیت سے پر ہیں اکبرؔ کی شاعری کا اصلی مقصد بھی یہی ہے۔

شخصی ہجو نگاری کسی فرد کے خلاف ہوتی ہے۔ ایسی ہجو ذرا پست رتبہ سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ ہجو نگار اس پیرایہ میں عام طور سے اپنے ذاتی بغض اور عناد نکالنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں شخصی ہجو نگاری اردو شاعری میں بہت مقبول تھیں۔ خصوصاً میرؔ کے عصر میں سوداؔ اسی طرح ہجو کے استاد تھے۔ قدیم اساتذہ سخن میں عموماً ایسی ہی باہمی ہجویں مقبول تھیں۔ موجودہ زمانے میں بھی جہاں کسی سیاسی لیڈر کی ہجو کی جاتی ہے، یہی قدیم رنگ آجاتا ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم اور خواجہ حسن نظامی کے مقابلوں، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کے سیاسی خیالات کے خلاف نظموں سے اس کا پتہ

چل سکے گا

سیاسی ہجو، ملک کے کسی خاص سیاسی طبقے کے خیالات کا مضحکہ اڑاتی ہے اکبر الہ آبادی کی شاعری کئی ملیح سیاسی ہجوؤں پرشتمل ہے۔

ہجونگاری میں، شاعر کی کامیابی کی ضامن زیادہ تر اس کی ذہانت اور ظرافت ہوتی ہے۔ اس خصوص میں اکبر الہ آبادی کی شاعری کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ ظرافت کے بغیر ہجو، فحش اور دشنام کے درجے پر اتر آتی ہے۔ یا پھر ذاتی عناد نکالنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اردو ہجو کا بڑا ذخیرہ انہیں آخری دو خرابیوں کی وجہ سے آج گمنام ہے

مدحیہ شاعری

جس طرح گزری ہوئی ہستیوں کے کارنامے کو یاد کرکے مرثیئے لکھے جاتے ہیں اسی طرح زندہ مشاہیر اور باعظمت اشخاص کی تعریف میں قصیدے لکھے جاتے ہیں "ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی واقعہ کو سن کر بے اختیار ہمارے دل میں مدح و ستائش یا نفریں یا ملامت کا جوش اٹھتا ہے"[1] اسی جوش کے اظہار کے موقعوں پر مدحیہ شاعری پیدا ہوتی ہے

مدحیہ شاعری اردو میں بڑی اہمیت رکھتی ہے قدیم اردو میں مدحیہ شاعری کے لئے ایک خاص شکل ہی باتباع فارسی معین کرلی گئی تھی۔ یہ قصیدہ ہے اسی پر اب تک عموماً عملدرآمد ہو رہا ہے عربی میں "قصیدہ" ہر ذی وقعت شخص کی مدح میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن فارسی میں قصیدے صرف سلاطین اور امرا کی مدح کے لئے مخصوص ہوگئے اسی کی تقلید اردو میں کی گئی۔ رفتہ رفتہ امرا کی تعریف میں قصیدے لکھنا ایک رسم بن گئی۔ چنانچہ قصیدے میں ممدوح کے متعلق جو باتیں بیان کی جاتیں ان کا تعلق بسا اوقات ممدوح سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

قدیم اردو قصیدہ نگاروں میں احمد، نصرتی و ولی وغیرہ کے قصیدے خاص طور پر قابل قدر ہیں یہ قصیدے شمالی ہند کے قصیدہ نگاروں سے اس خصوص میں ممتاز ہیں کہ وہ سادہ اور کسی قدر اصلیت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثر شاعر کے سچے جذبات کا مرقع ہیں۔

سودا موجودہ اردو قصیدے کے استاد ہیں۔ قصیدے کی زبان کو بنانے اور بلند کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے ان کے قصیدے بہت پرشکوہ ہوتے ہیں گو اصلیت پر ان قصیدوں کی بنیاد کم رکھی گئی ہے۔ سودا کے بعد کے قصیدہ نگاروں میں انشا کے قصیدے اور متاخرین شعرا میں استاد شیخ ابراہیم ذوق کے قصیدے خاص وقعت رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں مدحیہ شاعری اور قصیدے کا پایہ بلند کرنے کی غرض سے حالی نے قصیدے کے رسمی اصولوں کو توڑ

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری حالی انوار احمدی پریس الہ آباد صہ ۱۶۰

اور خود ہی بہت سے ایسے قصیدے لکھے جو اصلیت پر مبنی ہیں اور سادھی سیدھی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ حالی کے بعد قصیدے کی صنف پھر تنزل پذیر ہونے کو تھی کہ محسن کاکوروی مخصوصاً طباطبائی نے اس کو سنبھالا۔ طباطبائی کی شاعری میں قصیدوں کو خاص رتبہ حاصل ہے ان کے ہاتھ میں قصیدے نے قدیم فارسی کا زور اور شان اور حالی کی اصلیت دونوں باتیں پیدا کر لیں۔

مرثیہ مرثئے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے لکھے جا سکتے ہیں مرثئے میں مرنے والے کے صرف اوصاف کردار اور افعال کے بیان پر اکتفا کیا جا سکتا ہے یا ان سے متاثر ہو کر شاعر خود اپنے رنج اور غم کے جذبات ظاہر کر سکتا ہے اردو کے بلند پایہ مرثئے مخلوط نوعیت کے ہیں۔

اردو مرثیہ نگاری اسی قدر بلند پایہ ہے جس قدر یونانی مرثیہ نگاری تھی۔ موضوعات کی گوناگونی کے لحاظ سے بھی اردو مرثیہ کو یونانی مرثیہ سے ایک خاص تعلق ہے یونانی مرثیوں کی طرح اردو میں بھی ہر چیز کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے۔ بین یعنی مردے پر نوحہ کرنا بھی یونانی مرثیہ کا خاص وصف تھا مگر ایک چیز جو اردو مرثیوں میں وجہ امتیاز ہے وہ موضوع کی بلند پائگی ہے۔ یہ چیز یونانیوں کے دسترس سے باہر تھی۔

قدیم مرثیوں کے موضوع حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور اس سے متعلق واقعات تک محدود تھے حالی کی اصلاح شاعری کی مساعی نے اس میں بھی وسعت پیدا کی حالی کی کوشش یہ تھی کہ مرثیوں کے موضوع کربلا ہی کے واقعات پر منحصر ہو کر نہ رہ جائیں اس میں انہیں ڈر تھا کہ دوسری اصناف کی طرح مرثیہ بھی انیس اور دبیر کے بعد کورانہ تقلید کی وجہ سے اردو شاعری کی ایک از کار رفتہ صنف بن جائیگا۔ کیونکہ انیس اور دبیر کے بعد اس پایہ کے مرثیوں کا سرانجام پانا مشکل نظر آتا تھا خود حالی نے مرزا غالب اور حکیم محمد محمود خاں کی وفات پر دو مرثئے لکھے دونوں صداقت جذبات سادگی اسلوب اور اثر کے لحاظ سے حالی کا بڑا شعری کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔

مغربی طرز کے مرثئے سے اردو کو روشناس کرانے سہرا نظم طباطبائی کے سر ہے، جنہوں نے انگریزی کے مشہور شاعر طامس گرے کی معرکۃ الآرا نظم ایلجی کا اردو میں گورِ غریباں کے نام سے ترجمہ کیا ہے یہ ترجمہ بالکل لفظی نہیں۔ لیکن اصل کی تمام خوبیوں کا حامل ہے اردو میں یہ نظم بلند پایہ تسلیم کی گئی ہے۔

موسیقیانہ شاعری شاعری کی اس نوع کو انگریزی میں "لی رک" شاعری کے نام سے موسوم کرتے ہیں یہ وہ نظمیں ہیں جو عموماً موسیقی کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں حسن و عشق کے داخلی جذبات اور قلبی واردات کا بیان ہوتا ہے۔

"لی رک" شاعری "، زیادہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ پرجوش جذبات اس کے ماخذ میں اسی لیے یہ فطرت انسانی کے جذباتی پہلو سے زیادہ واسطہ رکھتی ہے استدلال اور تفکر کو متاثر کرنا اس طرح کی شاعری کا کام نہیں ہے اس اعتبار سے غالب کی شاعری، باوجود غزل کی شاعری ہونے کے بہت کم موسیقیانہ ہے ہم اس کو حکمیہ شاعری کے ضمن میں جگہ دیں گے

اردو غزل ابتدا میں انھیں اصول کے تابع رہی ہے۔ اولین شعرا کی غزل ان کے داخلی جذبات اور قلبی واردات کا آئینہ ہوتی تھی۔ بعد کو اس اصول میں بڑی تبدیلی ہوگئی۔ چنانچہ متوسطین و متاخرین کے ہاتھ میں غزل ایک کھلونا سی بن گئی تھی۔ لیکن موسیقی کے ساتھ پیش کرنے کے لئے ہمیشہ غزل ہی کام دیتی رہی چنانچہ میر، سودا۔ درد، مصحفی، آتش، نسیم، داغ ذوق، ظفر، غالب، جلیل اور اقبال کی غزلیں اب بھی محفلوں میں گائی جاتی ہیں

اس کی طرح کی نظموں کا وصف یہ ہوتا ہے کہ ان میں زبان، بحر، قافیہ غرض نظم کی پوری زمین موضوع اور جذبہ کے مناسب استعمال کی جاتی ہے لے اور توازن، خیال اور زبان دونوں میں اس کا بنیادی عنصر ہیں، لیکن پہلے دور کے بعد سے غزل گو شعرا نے اس کا لحاظ اٹھا دیا تھا۔ ادبی اصلاح کی تحریکات نے غزل میں بہت کچھ تبدیلی کر دی ہے۔ اب بھی غزل ایسی ہی مقبول ہے، جیسی پہلے تھی۔ لیکن اب اس میں شخصی اور ذاتی جذبات کو نمایاں جگہ مل رہی ہے چنانچہ فانی لکھنوی، حسرت موہانی ریاض خیر آبادی، جوش ملیح آبادی، بیخود دہلوی، جگر بریلوی، عزیز اور صفی لکھنوی اور صفی حیدرآبادی، جدید غزل کے بڑے اساتذہ ہیں ان کے کلام میں قدیم بندشوں کے باوجود ذاتی جذبات بڑی حد تک موجود ہیں تاہم غزل مکمل لی رک شاعری ابھی نہیں بن سکی کیونکہ موضوع اور جذبے کی مناسب بحروں کا استعمال، اور نزاکت اور زور، ابھی تک اس میں پورا نمایاں نہیں ہوا اس خصوص میں جوش، عظمت اللہ خاں اور حفیظ کی غزل خیال اور موضوع کے مناسب موسیقیت کی وجہ سے قابل مطالعہ ہے آخری دو شعرا نے قدیم بحروں کی قیود سے اپنے آپ کو بڑی حد تک آزاد کر لیا ہے۔ لیکن عام طور سے جیسا کہ ڈاکٹر موہن سنگھ کا خیال ہے، حیات کے جزئیات، جن سے قلوب اور ادب بھڑک اٹھتے ہیں غزل میں اب تک مفقود ہیں اس میں نہ تو نصب العینیت ہے اور نہ حقیقی قنوطیت پیش پا افتادہ چیزوں میں حسن اور حیرت کا احساس غزل سے کوسوں دور ہے[1]

دیہی شاعری

حقیقت میں شاعری کی یہ قسم خاص طور سے انگریزی کے ساتھ مخصوص ہے جو یونانی پاسٹورل شاعری، انگریزی میں ایک جداگانہ نوعیت رکھتی ہے لیکن ہمارے پاس اور بہت سے عنوانات کی طرح، شعر کا ارتقا اس عنوان کے تحت بھی نہیں ہوا۔ تاہم جو خصوصیات پاسٹورل شاعری کی تسلیم کی جاتی ہیں

[1] ماڈرن اردو پوئٹری مقالہ صفحہ

ان کی کچھ جھلک بعض جدید اردو شاعروں کے کلام میں نظر آجاتی ہے۔ شعر کی یہ قسم بہت ہی لطیف اور خصوصاً مہذب دنیا کے لئے بڑی دلچسپ ہوتی ہے اس لئے اردو میں اس کی ترقی کی گنجائش باقی ہے۔

دیہی یا چوپانی شاعری وہ ہے جس میں شاعر مہذب اور شائستہ معاشرہ کو چھوڑ کر اپنا مواد جنگل اور دیہات کی زندگی اور اس کے متعلقات مثلاً چوپانی وغیرہ جیسے واقعات میں تلاش کرتا ہے۔

انیس اور دبیر کے مرثیوں میں نظیر کی شاعری میں، میر حسن کی مثنوی میں ہم کو کچھ پارے ایسے ملتے ہیں جو جنگل اور دیہات کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ لیکن اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر شاید ہی کوئی نظم لکھی گئی ہو۔ جدید شاعری میں اسمعیل میرٹھی کی بعض نظموں اس عنوان کے تحت آسکتی ہیں۔ مثلاً خدا کی قدرت "ہماری گائے" "چھوٹے تارے" "ہوا چلی" "صبح کی آمد" وغیرہ جگر بسوانی کی نظم "کسان کی لڑکی" ماہ عظیم آبادی کی نظم "کوہ" وغیرہ میں بھی اسی طرز زندگی کے بعض لافانی دلچسپی رکھنے والے پہلو بیان ہوئے ہیں۔

دنیائے افسانہ

اردو رسائل و اخبارات میں روز بروز افسانہ نگاری کا رواج بڑھتا جارہا ہے اور سچ پوچھئے تو اکثر اردو افسانے ایسے ہوتے ہیں جو صحیح طور پر افسانہ نگاری کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اس کا سبب یہ ہے کہ اب تک اردو میں ادب لطیف سے متعلق کوئی اصول قلمبند نہیں ہوئے۔ مولوی عبدالقادر سروری۔ ایم اے ایل ایل بی کا اردو دنیا پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کرکے دنیائے اردو ادب کو رہین منت کیا ہے اس کتاب میں افسانہ و ناول نگاری کی تاریخ اور اس کے اصول و مبادیات پر بحث کی گئی ہے افسانہ نگاری کے اصولوں کی روشنی میں اردو افسانوں اور ناولوں کو بھی جانچا ہے اخیر میں مصنف نے اردو افسانہ نگاری کے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے۔ اردو افسانہ نگاروں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ ضخامت (۲۰۰) صفحے پاکٹ اڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت (۱۲؍)

جدید مطبوعات

سفرنامہ

پردیس کی باتیں ممالک اسلامیہ اور یورپ کا سفرنامہ، مرزا حسین احمد بیگ صاحب نے مرتب کیا ہے مرتب نے حیدرآباد سے چلنے کے بعد سے ممالک اسلامیہ اور یورپ میں قیام کے دوران میں جو قابل ذکر چیزیں دیکھیں انہیں کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے قیمت مجلد (عہ)

مذہب

کتاب العقائد سید ممتاز علی دیوبندی نے قرآن مجید سے شواہد اور مواد فراہم کر کے موجودہ مسائل حیات کے کئی عنوانات کے تحت ان کی تفسیر کی ہے۔ کتاب چار جلدوں میں دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شائع شائع ہوئی ہے۔ قیمت سولہ روپیہ چودہ آنے

ادب

فتح انطاکیہ خلافت راشدہ کے عہد کا ناول ہے جس کے مصنف منشی محمد صادق حسین صاحب صادق صدیقی سردھنوی ہیں۔ دو حصوں میں شائع ہوا ہے اور تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے قیمت (للعہ) چھ آنے۔

سوانح عمری

نورالدین جہانگیر تزک جہانگیری سے شہنشاہ جہانگیر کے حالات اخذ کر کے محمد معشوق حسین خاں بی اے (نواب معشوق یار جنگ بہادر) نے شائع کئے ہیں کتاب ۴۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے قیمت عہ ر

تنقیدیں

کارزار | زیرادارت ابوالحفیظ جالندھری مقام اشاعت ماڈل ٹاؤن لاہور یہ ہفتہ وار اخبار حفیظ جالندھری کی ادارت میں ماڈل ٹاؤن لاہور سے شائع ہو رہا ہے حفیظ جالندھری صحافت میں نووارد نہیں ہیں اس سے پہلے "مخزن" کی نشاتِ ثانی میں آپ نے ادارت کی خدمت جس خوش اسلوبی سے انجام دی ہے۔ اس سے آپ کی شہرت قائم ہو چکی ہے۔ رسالے کے بند ہو جانے کے بعد آپ نے اس اخبار کو جاری کیا ہے۔

اخبار کے صرف چند نمبر ہمارے سامنے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار کا نصب العین اہل ملک کو موجودہ کش مکش حیات سے تیار کرنا ہے حفیظ صاحب اقبال کی شاعری اور سیاسی پیغام سے بے حد متاثر ہیں وہی روح حیات اس اخبار میں بھی دوڑتی نظر آتی ہے۔ ہماری معاشرت ادبیات، سیاست کے بہت سے مسائل ہیں جن کا ہمکو محاسبہ کرنے کی سخت ضرورت ہے یہی کام کارزار انجام دینا چاہتا ہے اس عبوری دور میں ہمارے نصب العین کو بنانے کیلئے ایک ایسے اخبار کی ضرورت تھی اس لحاظ سے "کارزار" کی اشاعت بروقت معلوم ہوتی ہے ہر اشاعت میں ہماری معاشرت اور ادبیات کے قابل توجہ پہلوؤں پر تنقید ہوتی ہے توقع ہے کہ اخبار کے ان تنقیدوں سے ہم کو معتد بہ فائدہ پہنچے گا۔

صاعقہ | مدیر جناب امین۔ دارالادب لکھنؤ قیمت (عما) سالانہ۔ یہ کراؤن سائز کا مختصر رسالہ ہے جو جناب امین کی ادارت میں چند مہینوں سے شائع ہوا ہے لکھنؤ میں دارالادب کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی ہے۔ اس کا یہ آرگن ہے اس کے مضامین زیادہ بلند پایہ اور علمی نہیں ہیں بعض وقت شخصی و ذاتی مباحث بھی شائع ہو جاتے ہیں لیکن عام مضامین دلچسپ ضرور ہوتے ہیں ادب لطیف کی صورت میں بھی رسالہ ہر وقت کچھ نہ کچھ شائع کرتا رہتا ہے۔ دلچسپ ادب کے متلاشیوں کے لئے "صاعقہ" کا مطالعہ وقت گزاری کا بہترین ضامن ہے۔ اس کا سالانہ چندہ اس قدر قلیل ہے کہ ہر شخص اس کو آسانی سے خرید سکتا ہے۔

کتب موصولہ | اساسِ عربی از پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن ام اے الہ آباد یونیورسٹی۔ مرات احمدی شائع کردہ گائیکواڑ لائبریری بڑودہ۔
کلامِ جوہر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ ہمزاد۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ گناہ کی دیوار۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ وغیرہ

مطبوعات دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

علمی و ادبی کتابیں

۱ - اردو شہ پارے حصہ اول از ڈاکٹر سید محی الدین قادری ایم اے پی ایچ ڈی - تاریخ اردوئے قدیم اور ابتدائے اردو سے لے کر ولی اورنگ آبادی تک نظم و نثر کا بہترین انتخاب مع نو تصاویر شعرائے قدیم ضخامت (۴۰۰) صفحے قیمت مجلد (۱۲ ؎)

۲ - روح تنقید - از ڈاکٹر صاحب موصوف اردو میں فن تنقید کی پہلی کتاب ہے قیمت (۱۲ ؎)

۳ - تنقیدی مقالات - از ڈاکٹر صاحب موصوف روح تنقید کا دوسرا حصہ پیش کردہ تنقیدی اصولوں کی روشنی میں چیدہ شعرا کے کلام پر تنقید و تبصرہ ضخامت ۵۰۰ صفحے مجلد (۴ ؎)

۴ - اردو کے اسالیب بیان - از ڈاکٹر موصوف ابتدائے اردو نثر سے لے کر موجودہ زمانے کے نثر نگاروں کے انداز تحریر و بیان کی ارتقائی تاریخ ضخامت (۳۰۴) صفحے مجلد (عہ)

۵ - محمود غزنوی کی بزم ادب - از ڈاکٹر موصوف غزنوی دور کی علمی و ادبی کارناموں کا مرقع ضخامت (۱۲۰) صفحے قیمت ۱۲ ؎

۶ - ارباب نثر اردو - از سید محمد ایم اے اردو نثر نویسی کی تاریخ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفین اردو کا تذکرہ ضخامت (۲۲۰) صفحے مجلد قیمت (عا)

۷ - دکن میں اردو - از نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل جنوب ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اور آصفجاہی دور کے شعرا کا تذکرہ اور دکن کے علمی تصانیف رسائل اخبارات کے مفصل حالات ضخامت (۳۸۰) صفحے قیمت (عا)

۸ - آثار الکرام - از حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس، ایران وسط اور جنوبی ہند کے اسلامی سلاطین کے علمی ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت (۱۴۴) صفحے قیمت ۱۲ ؎

۹ - گلشن گفتار - مرتبہ سید محمد ایم اے - اردو شعرا کا پہلا تذکرہ مع جامع مقدمہ ۱۱۶۵ھ سے پہلے کے دکن اور ہندوستان کے شاعروں کے حالات نوشتہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی ضخامت (۸۵) صفحے قیمت ۱۲ ؎

۱۰ - مقدمات عبد الحق حصہ اول - مرتبہ مرزا محمد بیگ متعلم مولوی عبد الحق معتمد انجمن ترقی اردو پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کے علمی ادبی اردو مقدموں اور دیباچوں کا مکمل مجموعہ جو مختلف موضوع کی گراں مایہ کتابوں میں شائع ہوئے تھے ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت (ے) (حصہ دوم زیر طبع)

ہندوستان کا سب سے شاندار حسین دلچسپ اور ارزان باتصویر ماہوار اردو رسالہ
لاہور
ادبی دنیا
آنریبل شیخ عبدالقادر کی زیر نگرانی، اور علامہ تاجور کی ایڈیٹری میں تین سال سے جاری ہے
اس کے پڑھنے والے ہندوستان مصر، افریقہ، یورپ اور امریکہ وغیرہ میں کم و بیش بات لاکھ ہیں (۲) اس کے مضمون نگاروں میں ہائی کورٹس کے جج، حکومت کے وزیر، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر کونسلوں کے قابل ممبر اور ملک کے تمام مشہور اہل قلم ہیں۔
آئندہ ماہ جنوری میں ادبی دنیا کا بے مثل بے نظیر خاص نمبر
نوروز نمبر
کے نام سے شائع ہونیوالا ہے سال بھر کے خریدار کو نوروز نمبر مفت
نوروز نمبر کی تین خصوصیات
اردو زبان کی تین سو سال کی تاریخ ادبی دنیا کے نوروز نمبر کا جواب نہیں پیش کر سکتی ہندوستان کی کسی زبان کے کسی ایک پرچے میں کبھی ملک کے ایسے بلند رتبہ اور اتنے اہل علم و اہل قلم کے مضامین نوروز نمبر کے سوا نہیں شائع ہوئے ہونگے۔ (۲) نوروز نمبر میں ملک کے مشہور جادو نگار شاعروں کی روح کو تڑپا دینے والی ۵۰ نظمیں اور دنیا کے مشہور افسانہ نگاروں کے دل ہلا دینے والے ۲۰ افسانے اور گرانمایہ اہل قلم کے چالیس علمی ادبی تاریخی بلند مضامین درج ہیں (۳) نہایت حسین نہایت شاندار اور دلکش آرٹ کی نادر بڑی بڑی جہازی سہ رنگی و یک رنگی ۳۰ تصاویر تاریخی عمارات اور مشہور اہل قلم کی پچاس تصویریں کل ۸۰ تصاویر
ادبی دنیا کے خریداروں سے انتہائی رعایت
ادبی دنیا کے سالانہ خریداروں کو سالانامہ نوروز نمبر صرف محصولڈاک و رجسٹری کیلئے چھ آنے کے ٹکٹ بھیجنے پر مفت بھیجا جائیگا۔ نوراً جبر خریداران میں نام لکھوا لیجئے کیونکہ نوروز نمبر پر اہل ملک کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔
ادبی دنیا کے سال بھر کے خریدار کو
(۱) دلکش آرٹ کی اقدرتی نظاروں کی، تاریخی عمارات کی مشاہیر عالم کی ڈیڑھ سو قابل دید تصویریں ملینگی، (۲) مشہور جادو نگار شعراء کی ۱۲ بہترین نظمیں ہندوستانی اور یورپ کے مشہور افسانہ نگاروں کے اسی سبق آموز افسانے اور ملک کے قابل ترین اہل قلم کے ہر قسم علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی اعلیٰ مضامین ملینگے۔ اور یہ مجموعہ کتابی سائز کے چار ہزار صفحوں کے برابر ہوگا۔
نوروز نمبر کے ہر پرچے پر ڈھائی روپے لاگت آتی ہے مگر اہل ذوق تک پہنچانے کی غرض سے اس کی قیمت دو روپے مع محصولڈاک رجسٹری چھ آنے لیکن جو صاحب دو روپے کا منی آرڈر بھیج دینگے ان سے محصول ڈاک نہیں لیا جائیگا۔
المشتہر جنرل منیجر رسالہ ادبی دنیا لاہور

مجلہ مکتبہ
گلِ صد رنگ
یعنی
اَدبی، علمی، تاریخی، تعلیمی، صنعتی اور حفظانِ صحت کے متعلق بہترین مضامین کا بہترین مجموعہ
حیرت انگیز فسانے دلچسپ ڈرامے۔ پاکیزہ نظمیں
نظم و نثر کے ۱۶۳ نادر مضامین، قدیم و موجودہ انشاپردازوں کے ایک سو نایاب فوٹو متعدد سہ رنگی تصاویر۔ مشاہیر ادبِ اُردو کے ہاتھ کی تحریروں کے قیمتی عکس اس مجموعہ کی زینت ہیں
(ملک کے قریباً ڈیڑھ سو فاضلوں اور ادیبوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا ہے)
سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت قریباً ۵۰۷ صفحات۔ لکھائی چھپائی بہترین۔ متعدد صفحات رنگین
ہمارا پُرزور دعویٰ ہے کہ
اس سے زیادہ شاندار اور ضخیم مجموعہ مضامین اب تک اُردو زبان میں شائع نہیں ہوا
اس کی تیاری میں آٹھ ہزار روپیہ نقد خرچ کیا گیا ہے۔
اگر آپ نے
ادبِ اُردو کی اس انسائیکلوپیڈیا کو فوراً نہ منگوایا تو یقیناً آپ پچھتائینگے
کسی وجہ سے بھی ناپسند ہو تو بلا تامل واپس فرمادیں۔
قیمت باوجود اتنی بڑی ضخامت اور اس قدر فوٹوؤں کے صرف دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ/ ۲) مجلد ۱۲/ ۳ روپیہ
ملنے کا پتہ
ماسٹر جگت سنگھ پروپرائیٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور رام گلی نمبر ۵۵۰

ڈھائی سو روپیہ کے پانچ انعام

مجلہ مکتبہ کے قلمی معاونین کو
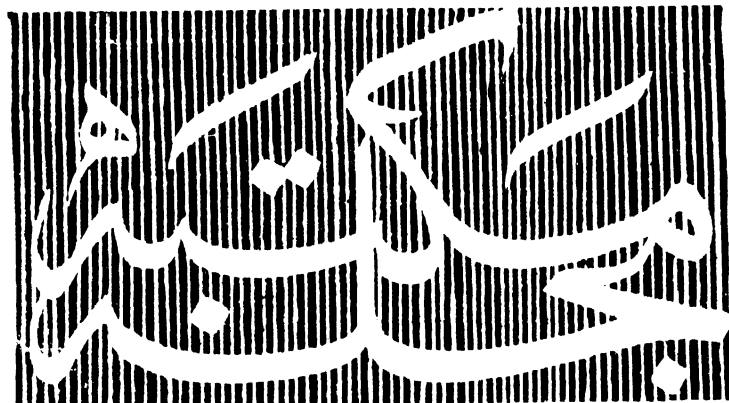
سال بھر کے بہترین مضامین کیلئے حسب تفصیل ذیل عطا کیے جائینگے۔

عطیہ	
پہلا انعام ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ ۵۰؀	مختصر ڈرامہ ایک ایکٹ کا ہو اور ہندوستان کی معاشرت کے مطابق ہو
دوسرا " مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی پروفیسر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ ۵۰؀	تاریخی مقالہ ریاست حیدرآباد اور خاص کر گولکنڈہ کی سلطنت کے متعلق ہو
تیسرا " مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ام اے پروفیسر کلام کلیہ جامعہ عثمانیہ ۵۰؀	تنقیدی مضمون اردو کے کسی مصنف یا شاعر پر تحقیقی اور انوکھے رنگ میں
چوتھا " مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نائب مددگار دیوانی ریاست حیدرآباد ۵۰؀	تحقیقی مضمون تاریخ اسلام سے متعلق
پانچواں پیش کش مدیر مکتبہ ...... ۵۰؀	مختصر افسانہ حیدرآباد کی زندگی کے کسی پہلو پر

نوٹ:۔ (۱) تاریخی اور تنقیدی مضامین نہایت تحقیقی ہوں اور ڈرامے اور افسانے بالکل اچھوتے (۲) کوئی مضمون رسالہ کے تیس صفحوں سے زیادہ طویل نہ ہو (۳) جو مضامین انعام کے اہل قرار دیے جائیں گے ان کا اعلان ماہ آبان (ستمبر) میں ہوگا (۴) انعاموں کی تقسیم ماہ آذر (اکتوبر) میں عمل آئیگی (۵) مضامین کی مجلس مبصرین ومعلیوں کے علاوہ فی الحال حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہوگی۔

(۱) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ام اے پی ایچ ڈی پروفیسر فلسفہ (۲) ڈاکٹر میر سیادت علی خاں ام اے ال ال بی ڈی فل بی سی ال پروفیسر قانون (۳) مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ام اے بی ایس سی آنرز (مانچسٹر) پروفیسر کلیہ انجینیرنگ جامعہ عثمانیہ

کی

خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپیہ کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے ان کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کی مطبوعات مکتبہ یا پینتیس ۳۵ روپے کی درسی اور دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کریں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے "مجلہ مکتبہ" بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائیگا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے ان کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیج دیں رسالہ ان کے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اسی طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

رجسٹرڈ نشان انگلشیہ
(.......)

۴۸۶

رجسٹرڈ آصفیہ
(۶۵)

دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ انجمن امداد باہمی
حیدرآباد دکن
کا

ماہوار علمی و ادبی مجلّہ
مکتبہ

مدیر: عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

جلد (۸) | بابت ماہ اردی بہشت ۱۳۴۱ ف مطابق بابت ماہ مارچ ۱۹۳۲ء | شمارہ (۶)

شذرات

سیاسی دنیا میں موسیو بریاں کا انتقال ایک ایسا نقصانِ عظیم ہے، جس کی تلافی بہت مشکل ہے۔ تاریخِ عالم میں شاید ہی کوئی شخصیت ایسی ہوگی، جس کی حیات اس قدر پراز واقعات ہو۔ موسیو بریاں مقبولیت اور ان کی عظمت کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہو سکیگا کہ وہ پچیس دفعہ وزیر رہے اور گیارہ مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہوے۔ یورپ کی سیاست پر ان کی نظر جس قدر وسیع تھی، اس کی مثال معاصرین میں نظر نہیں آتی۔ موسیو بریاں یورپ کی مختلف سلطنتوں کو متحد کرکے وفاقی یورپ بنانا چاہتے تھے۔ موجودہ موقع پر یہ خواہش ایک سیاسی خواب معلوم ہوتا ہے، لیکن آثار اور قرائن ایسے ہیں کہ شاید آئندہ اس خواب کی تعبیر ممکن ہو جائے۔ کہ یہ چیز موسیو بریاں کی سیاسی پیش بینی کی ہمیشہ یادگار رہے گی۔

برطانوی شہنشاہیت کے مختلف اجزا کی بیداری، موجودہ سیاسی دنیا کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہندوستان دو سال سے اس کش مکش میں مبتلا ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی یقینی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا اس کے لئے شاید ابھی کچھ انتظار کی ضرورت ہے۔ گذشتہ گول میز کانفرنس کی کارروائیوں سے اب تک مسلمانوں کو اتفاق تھا۔ لیکن ذیلی کمیٹیوں کی جو کارروائیاں منظرِ عام پر آ رہی ہیں، ان سے مسلمانوں میں بدظنی سی پھیل گئی ہے۔ اور وہ احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں اتحاد اور تنظیم مفقود ہے۔ انہوں نے اپنا سیاسی نصب العین بھی ابھی تک معین نہیں کیا۔ کل ہند مسلم کانفرنس کا پچھلا اجلاس جو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں بمقام لاہور منعقد ہوا تھا۔ اس میں کوئی سنجیدہ کارروائی طے پانے کی بجائے جو شور و ہنگامہ ہوا، عبرت آموز ہے۔

ہندوستان کی بے چینی ہی ابھی دور نہیں ہو سکی تھی کہ برطانوی شہنشاہیت کے ایک دوسرے جز آئرستان سے بھی آزادی کی قدیم صدا زور و شور سے بلند ہونے لگی۔ آئرستانی آزاد مملکت کے صدر ڈی ویلرا انگلستان سے اپنے رہے سہے تعلقات توڑنے کے درپے ہو گئے ہیں چنانچہ وہ اور اُن کے ساتھیوں نے حلف اطاعت کو برخاست

کرنے اور رسالیانے کی ادائی کو مسدود کرنے کی کوشش شروع کردی ہے۔ انہوں نے اس کا باضابطہ اعلان بھی کردیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت انگلستان کے پاس اس کا کیا جواب ہے انگلستان کا جواب ایک نئی اور عظیم الشان سیاسی کش مکش کی بنا بنا دکھائی دیتا ہے بہت ممکن ہے کہ آئرستان کی فضا خانہ جنگی سے پھر ایک بار مکدر نظر آئے۔

جرمنی کے صدر جمہوریہ فان ہنڈن برگ کی میعاد خدمت اب ختم ہونے کو ہے آئندہ انتخاب کے لئے کئی فریق پیش پیش ہیں سب سے زیادہ سرگرمی کا اظہار ہٹلر کے نازی فریق سے ہو رہا ہے۔ یہ فریق اشتراکی ہے اور کوشاں ہے کہ شاہ پرست فریق کو شکست دے کر، جرمنی کی آئندہ حکومت کا اشتراکی بنا دے فان ہنڈن برگ کی پیرانہ سالی میں یہ جوانا ہمتی قابل وقعت ہے کہ وہ اپنے فریق کی ترغیب پر پھر امیدوار بن کر کھڑے ہوئے ہیں بہت ممکن ہے کہ ان کا دیرینہ تجربہ اور ان کی بے مثل خدمات، ان کے انتخاب میں بنیاد کا کام دے۔

ہندوستانی اکاڈمی (یو۔پی) کی سالانہ کانفرنس اس دفعہ مارچ کے پہلے ہفتے میں بمقام الہ آباد منعقد ہوئی کارروائیوں کا پیش نامہ بہت دلچسپ تھا۔ صوبجات متحدہ اور اطراف ہند کے اکثر ہندی اور اردو ادیب، انشاپرداز اور شاعر شریک ہوئے۔ سر عبدالقادر شعبہ اردو کی صدارت کے لئے پنجاب سے تشریف لائے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر اردو نے نمائندگی کی۔

پہلے اجلاس میں جسٹس سر شاہ محمد سلیمان نے استقبالیہ خطبہ پڑھا اور سر عبدالقادر کا خطبہ صدارت بھی پڑھا گیا۔ اسی رات اردو مشاعرہ ہوا جس میں لکھنؤ اور دوسرے مقامات کے مشاہیر شعرا نے کلام سنایا۔ صفی، ناطق ظریف، آسی، مائل وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دوسرے روز کے اجلاس میں جامعہ ملیہ دہلی کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور قاضی خورشید حسین پرنسپل مدرسہ فوقانیہ الہ آباد نے اپنے پرچے پڑھے۔ رات میں شعبہ ہندی کا مشاعرہ تھا، جس میں اکثر ہندو شعرا نے نظمیں پڑھیں۔ ان شعرا کی زبان برج بھاشا کی طرف بہت مائل تھی۔

آخری دن اکیڈمی کی کونسل کا اجلاس ہوا۔ بہت سی تجویزوں پر بحث ہوئی ان میں قابل ذکر تجویز یہ تھی کہ آئندہ سے کانفرنس کے اجلاس صوبجات متحدہ کے مختلف شہروں میں منعقد ہوا کریں آئندہ کانفرنس کا اجلاس غالباً اعظم گڑھ میں منعقد ہوگا۔

موجودہ زمانے میں اردو زبان اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایسے مجمعے بہت ضروری اور اہم ہیں۔ اس کی ضرورت اس لئے بھی زیادہ محسوس ہو رہی ہے کہ ہندی کے طرفدار حضرات آجکل اپنی زبان کی اشاعت کے لئے ہر طرح کی سعی میں مصروف ہیں۔ اور ڈر ہے کہ بہت زیادہ بے لگام نہ ہو جائیں۔

اس دفعہ کے رسالے میں میر حسن صاحب کے مطالعہ ورڈسورتھ کا ایک اور پہلو شائع ہو رہا ہے اس میں ورڈسورتھ کے بعض پاروں کے ترجمہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔

اسد اللہ بیگ صاحب حیدر بڑی نفیس نظمیں لکھتے ہیں۔ موصوف کی مثنوی "داغ گلزار" جو اس اشاعت میں نکل رہی ہے، اپنے قدیم طرز کی وجہ سے بہت دلچسپ معلوم ہو رہی ہے۔

ابو المکارم فیض محمد صاحب صدیقی نے بڑی محنت سے یورپ کے ماہران تعلیم ان کی حیات اور ان کے اصول تعلیم پر سواد فراہم کیا ہے اس دفعہ کے مضمون میں روسو کے مشہور ہیرو ''میں ڈ'' کے خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے کہ ارباب تعلیم خاص کر اس سے مستفید ہونگے۔

ایم اسلم صاحب کا افسانہ ہندوستانی زندگی کے ایک دلکشا پہلو یعنی گاؤں کی زندگی کے مناظر پر مشتمل ہے۔ پلاٹ، کردار اور مناظر تینوں اعتبار سے اس افسانہ کی خوبی ناقابل بیان ہے۔

"ساحلی میدان کے باشندے" احمد الدین صاحب کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا نتیجہ ہے تاریخ اور معاشیات سے موصوف کو بے حد دلچسپی ہے علمی معاشیات پر انہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب ترتیب دی ہے۔ یہ مضمون اس کا ایک حصہ ہے۔

جی، ام، خاں صاحب نے اس دفعہ رسالے کے لئے ایک نفیس چینی افسانے کا ترجمہ "مکتبہ" کے لئے کیا ہے۔ چینی حیات اور ان کے طرز خیال سے ہم لوگ بہت کم واقف ہیں اس لئے یہ افسانہ بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا۔

جناب ذکریا صاحب مائل نے گویا فلم کے متعلق ایک اہم تنقید اس دفعہ کے رسالے کے لئے لکھی مائل صاحب کے خیالات خاص طور پر غور و فکر کے محتاج ہیں۔

یورپ کے بعض محققین حیات کے خیالات کا ترجمہ جناب حشمت اللہ صاحب نے کیا ہے۔ موصوف نے حیات کے بہترین حصے کی جستجو، مستند ادیبوں اور فلسفیوں کے کلام سے کی ہے، ترجمے کے ذریعہ یہ تمام خیالات بہ دقت واحد اردو میں منتقل ہو رہے ہیں۔

ورڈسورتھ کی عشقیہ نظمیں

از جناب میر حسن صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

انگلستان کے مایہ ناز فطرت نگار ورڈسورتھ نے جس کا کلام رطب ویابس کا ایک انبار ضخیم ہے عشقیہ نظمیں بہت ہی کم لکھیں چنانچہ اس بارے میں انیسویں صدی کے مشہور نقاد آبرے دی ویر کے استمزاج پر اس نے یہ جواب دیا "اگر میری طبیعت کا رجحان عشق و عاشقی کی طرف ہوتا، تو یقیناً میں اس قسم کے مضامین کو نہایت جوش و سرگرمی کے ساتھ نظم کرتا۔ لیکن میری طبیعت کو اس قسم کی شاعری سے بہت کم لگاؤ ہے۔

تاہم ورڈسورتھ "لوسی پوئمس (LUCY POEMS) کے عنوان سے چند نظمیں لکھیں جن میں عشق و محبت کے مختلف جذبوں اور کیفیتوں کو نہایت ہی موثر میٹر اور لطیف انداز میں نظم کیا گیا ہے جس ادا، پرواز تخیل، موسیقی، روانی اور انتخاب الفاظ کے لحاظ سے ان نظموں کا درجہ اور بھی بلند ہوجاتا ہے۔ اور خود ورڈسورتھ کی کسی دوسری نظم میں محاسن شعری کی اس قدر گوناگونی نہیں پائی جاتی۔

ورڈسورتھ نے ان نظموں کی تصنیف کے اسباب کو پردہ اخفا میں رکھا اور آج تک صرف اس قدر معلوم ہوسکا کہ وہ جرمنی میں لکھی گئیں کیا اس نے اپنے راز محبت کو سربستہ ہی رکھنا مناسب خیال کیا؟ یا یہ کہ لوسی محض ایک فرضی نام تھا؟ اور ورڈسورتھ نے اس شعر کے مطابق عمل کیا ؎

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں		گفتہ آید در حدیث دیگراں

ان سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ لیکن ان نظموں کے مخصوص سوز و گداز اور اثر پذیری پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بے خودی بے سبب نہیں تھی اور کوئی واقعہ ایسا ضرور تھا جس کی پردہ داری اس کو منظور تھی لیکن باوجود اخفائے راز کی کوشش کے ورڈسورتھ اپنے جذبات اور واردات قلب کو نظم کا جامہ پہنائے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ ذیل میں ایک نظم کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس میں اس نے اپنے محبوب کی موت کو نہایت دردانگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

(لوسی گرے)

(۱) میں نے کئی دفعہ لوسی گرے کا ذکر سنا۔

اور جب اس جنگل میں میرا گذر ہوا —— تو علی الصباح دیکھنے کا اتفاق ہوا ——
اس خلوت گزیں دوشیزہ کو ——

(۲) کوئی اس کا دوست یا ہمدم نہیں تھا —— وہ ایک وسیع جنگل میں رہتی تھی ——
حسین ترین لڑکی، جس کی بھی پرورش ہوئی —— کسی شخص کے گھر میں ——

(۳) تم اب بھی دیکھ سکتے ہو، ہرن کو چوکڑی بھرتے ہوئے —— اور خرگوش کو سبزہ زار میں ——
لیکن لوسی گرے کا حسین چہرہ —— اب ہرگز نظر نہ آئیگا ——

(۴) آج کی رات طوفانی ہوگی —— تمہیں شہر جانا پڑے گا ——
اور ہاں - ایک قندیل بھی لیتی جانا۔ رہبری کرنے کے لئے —— اپنی ماں کی، برف میں سے ——

(۵) یہ کام - میں بسر وچشم کرنے کے لئے تیار ہوں —— ابھی دن نہیں ڈھلا
گرجا کی گھڑی نے دو بجائے ہیں —— اور سامنے چاند بھی نظر آرہا ہے ——

(۶) یہ سن کر اس کے باپ نے درانتی اٹھالی —— اور گھاس کاٹنے میں مشغول ہوگیا ——
اس نے اپنا کام شروع کیا اور لوسی نے لے لیا —— چراغ اپنے ہاتھ میں ——

(۷) کہسار کا ہرن بھی اس قدر ہشاش نظر نہیں آتا —— شوخ خرامی کی وجہ سے
اُس کے قدم نرم برف کو منتشر کر رہے تھے —— جو دھویں کی طرح اڑ رہا تھا ——

(۸) طوفان اپنے وقت سے پہلے آگیا —— وہ ادھر سے اُدھر دوڑتی پھری ——
اور بہت ساری پہاڑیوں کو عبور کیا —— لیکن شہر تک نہ پہونچ سکی

(۹) غریب الدین تمام رات —— ادھر ادھر چیختے چلاتے رہے ——
لیکن نہ تو کوئی جواب ملتا تھا، اور نہ کوئی ایسی چیز دکھائی دیتی تھی —— جس سے ان کی رہبری ہو سکے۔

(۱۰) علی الصباح وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوگئے —— جہاں سے دور دور تک نظر جاتی تھی ——
وہاں سے انہوں نے ایک لکڑی کے پل کو دیکھا —— اپنے گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ——

(۱۱) انہوں نے رونا شروع کیا - اور گھر واپس ہوتے ہوئے چلانے لگے —— اب ہم جنت میں ملیں گے ——
- اُس وقت اس کی ماں کی نظر پڑی —— لوسی کے قدموں کے نشانوں پر ——

(۱۲) وہ ایک کھلے میدان میں سے گزرے —— ان نشانوں کا سلسلہ اسی طرح جاری تھا

وہ برابر اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ـــــ اور اس پل تک پہونچے ـــــ

(۱۳) اس برف پوش خطہ پر سے وہ برابر ساتھ چلتے رہے ـــــ ان قدموں کے نشانوں کے ـــــ
اس میدان کے وسطی حصہ تک ـــــ اور وہاں وہ سلسلہ ختم ہو گیا ـــــ

(۱۴) ـــ تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ اب تک ـــــ وہ بقید حیات ہے ـــــ
اور یہ کہ تم حسین لوسی گرے کو دیکھ سکتے ہو ـــــ اس سنسان جنگل میں ـــــ

(۱۵) ہموار اور غیر ہموار مقامات میں وہ گشت لگاتی رہتی ہے ـــــ اور کبھی پیچھے پھر کر نہیں دیکھتی
اور ایک خلوت گزیں گیت گاتی ہے ـــــ جس کی صدا فضا میں گونجتی رہتی ہے ـــــ

ایک اور نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو جس میں اسی قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں ـ

(۱) مجھ پر عشق کے عجیب عجیب غلبے ہوئے ـــــ اور میں ان کے اظہار کی جرارت کروں گا ـــــ
لیکن صرف اہل دل کے کان میں ـــــ کہ ایک مرتبہ مجھ پر کیا گزری ـــــ

(۲) جب وہ، جس سے مجھ کو عشق تھا نظر آ رہی تھی روز افزوں ـــــ حسین، ماہ جون کے گلاب کی طرح
میں نے اس کے آستان کا رخ کیا ـــــ سر شام جب کہ آسمان پر چاند چمک رہا تھا ـــــ

(۳) میں چاندنی کے نظارے میں محو تھا ـــــ سبزہ زار میں سے گذرتے وقت ـــــ
تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا میرا گھوڑا قریب پہنچا ـــــ ان پگ ڈنڈیوں کے جو مجھے بہت ہی عزیز تھے

(۴) پھر ہم ایک باغ کے قریب پہنچے ـــــ اور جوں جوں ہم پہاڑی پر چڑھتے جاتے ـــــ
غروب ہوتا ہوا چاند ـــــ لوسی کے گھر سے قریب ہوتا جاتا ـــــ

(۵) میں ایک پر کیف بے خودی میں محو ہو گیا ـــــ جو فطرت کا لطیف ترین عطیہ ہے ـــــ
اور اس تمام عرصے میں میں دیکھتا رہا ـــــ غروب ہوتے ہوئے چاند کی طرف ـــــ

(۶) میرا گھوڑا برابر چلتا رہا ـــــ اور کہیں نہ رکا ـــــ
جب کہ اس گھر کے اس جانب ـــــ چاند یکایک غائب ہو گیا ـــــ

(۷) کس قدر بے سروپا خیالات آنے لگتے ہیں ـــــ ایک عاشق کے دل میں ـــــ
"او خدا رحم کر" میں نے اپنے دل میں کہا ـــــ "اگر لوسی کی موت واقع ہو جائے"

داغ گلزار

از

جناب مرزا اسد اللہ بیگ صاحب حیدر

(مثنوی)

نہ کبھی کوئی سیرِ باغ کرے　　لطفِ نظارہ پر نہ ہائے مرے
نخلِ الفت کبھی ہرا نہ ہوا　　باوفا کوئی دل رُبا نہ ہوا
جی میں آئی کہ سیرِ باغ کریں　　خالی از فکر یہ دماغ کریں
موند کر آنکھیں لے گئی تقدیر　　دلِ ناظر تھا اور نگاہ کا تیر
کیا خبر تھی تباہ ہم ہونگے　　جان پر اپنی یوں ستم ہونگے
جمگھٹا سیر کو حسینوں کا　　آج بالاتفاق نکلا تھا
کم سنیں سب کی سب ستم ایجاد　　شوخ چالاک دلربا جلاد
قد وہ بوٹا سا چھوٹے سن انکے　　کھیلنے کودنے کے دن انکے
پہنے نازک کلائیوں میں کڑے　　اور گلوں میں جڑاؤ طوق پڑے
کوئی ہنستی تھی کوئی گاتی تھی　　اور کوئی تالیاں بجاتی تھی
گورے گورے وہ انکے مکھڑے تھے　　کہ مہ چاردہ کے ٹکڑے تھے
کس قیامت کا ان پہ جوبن تھا　　کہ فدا ان گلوں پہ گلشن تھا
ہو کے بے اختیار بادِ صبا　　بوسے لیتی تھی ان پہ ہو کے فدا
نخلِ گلشن ہوا میں جھومتے تھے　　اور زمین نیاز چومتے تھے
گلِ نرگس بچھے نہ تھے اس جا　　چشمِ عشاق کا بچھونا تھا
بیچ میں نازنین ماہ لقا　　جیسے ہو گرد ماہ کے ہالہ

کمسنی اس کی اور وہ بھولا پن　　اک غضب تھا ہزار تھے جوبن
تھا قیامت نکھار جوبن کا　　اٹھتی کونپل ابھار جوبن کا
کندنی رنگ اس سمن بر کا　　اور وہ قد نسیم تن کا بوٹا سا
زلف دام بلا سے دوش بدوش　　کہ کرے صید مرغ ہوش کے ہوش
سرخ اس کے وہ پھول سے رخسار　　نیلے ہوں گر ہوا لگے اک بار
دہن تنگ اس کا غنچہ نما　　بلکہ معدوم صورتِ عنقا
وہ نزاکت بھرے لب شیریں　　قند و گل کو بھی نسبت ان سے نہیں
ناک میں اک بلاق نازک سا　　جس کا آویزہ لعل کا ترشا
اس کے کانوں میں تھے وہ دُرِ عدن　　جن سے شرمندہ ہو سہیل یمن
سر کی جنبش سے جب وہ ہل جاتے　　خاک میں سب کے دل تھے مل جاتے
ہائے کس قہر کا وہ پیارا سن　　اف رے وہ حسن کی اُمنگ کے دن
ستھرا ستھرا وہ چاند سا چہرہ　　جس کو حوریں بنائیں آئینہ
چھوٹے چھوٹے غضب جڑاؤ کڑے　　گوری گوری کلائیوں میں پڑے
نور کی وہ کلائیاں اس کی　　وہ زمرد کی چوڑیاں اس کی
تھی سراپا غرض وہ نور خدا　　دن امیدوں کے سن مرادوں کا
جب اٹھاتی تھی اک قدم وہ قمر　　تو لچکتی تھی لاکھ بار کمر
دھوپ سینہ میں پڑ گئی جو ذرا　　عکس چہرہ پہ موتیوں کا پڑا
کیا بیاں ہو بہار اُس دم کی　　رخِ تاباں پہ تھی ضیا اُس کی

کوئی دم یہ بہار رہ نہ سکی　　یعنی دل سے بھی آنکھ کہہ نہ سکی
ہاتھ ڈالے کمر میں غیر گئے　　دیکھنے ہم بھی اچھی سیر گئے
ہو گیا لطف درہم و برہم　　پھر وہی دل وہی فراق کا غم
کاٹنے دوڑتا ہے باغ مجھے　　بوئے گل کا عین داغ مجھے

اب یہ حالت ہے ہجر جاناں میں کبھی گھر میں کبھی بیاباں میں
وسوسے دل میں اور دماغ میں فکر نقشہ آنکھوں میں لب پہ اُس کا ذکر

نجاتِ ابدی

از

جناب جی۔ یم۔ خانصاحب

اگرچہ رات میں ماتان کو کوئی ڈھائی تین بجے سونے کا موقع ملا تھا۔ لیکن تقریباً چھ بجے جٹ سے اس کی نیند ہوشیار ہوگئی اس کو پھر سونے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے کہ ساڑھے چھ بجے مانڈلے والی گاڑی آنے والی تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اسٹیشن پر ایک مجمع کثیر جمع ہوجاتا تھا اس صورت میں ماتان کو ضروری انتظامات میں بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا اگر وہ اسٹیشن دیر سے پہنچتی۔

اس وقت ماتان ایک ادھیڑ عورت تھی وہ ایک ہوٹل کی مالک تھی جو اسٹیشن والی شاہراہ پر واقع تھا۔ اس ہوٹل سے اس کو خاص آمدنی تھی اور اس نے بہت کافی رقم پس انداز بھی کر رکھی تھی۔ گو یہ سب کچھ تھا لیکن اس کے ہوٹل کی حیثیت ایک بھٹیار خانے سے زیادہ نہیں تھی برآمدے میں دو تخت دھرے تھے۔ جن پر میلے کچیلے اور پھٹے پرانے بستر پڑے ہوئے تھے صرف اسی پر منحصر نہیں بلکہ اندرونی کمروں میں بھی کوئی اچھا انتظام نہیں تھا بازو والے کمرہ میں ایک بنچ پر دو تین صندوق ایک پر ایک جمے ہوئے دو ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور ادنیٰ قسم کی ایک چھوٹی سی میز بھی رکھی ہوئی تھی۔ لکڑی کی دیوار کے ذریعہ اس کمرے کے دو حصے کردیئے گئے تھے اس حصہ میں تو کچھ بھی نہیں تھا سوائے چند چٹائیوں کے جو لپیٹی ہوی ایک کونے میں کھڑی تھیں یہ حصہ صرف عارضی مسافروں کے لئے مخصوص تھا کہ اگر وہ چاہیں تو یہاں قیام کریں قسمت کا مارا اگر کوئی مسافر اس کمرہ میں رہتا بھی تو وہ رات کو برآمدے کے حصہ میں آکر سوتا اس لئے کہ اول تو کمرہ بالکل تنگ و تاریک اور مچھر گھرا ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کمرہ کی گندگی سے بیچارے مسافر کا دماغ معطل ہوجاتا تھا۔ عوام تو کیا اگر کوئی برمی بھی ہوتا تو اس کمرہ کی عفونت اور بدبو کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ پھر یہ شما کا شمار ہی کیا اس لئے غریب مسافر کبھی برآمدے کے حصہ میں اور بعض اوقات سڑک کے بازو والے حصہ پر بھی چٹائی بچھا کر سوجاتے تھے عام طور پر دس بجے کے بعد آمد و رفت بند ہوجاتی تھی اس لحاظ سے ان لوگوں کی میٹھی نیند میں کسی قسم کا خلل بھی واقع نہیں ہوتا تھا۔

اس مقام کے اطراف چاروں طرف کئی دوکانیں اور ہوٹل بھی تھے اس سے قریب ایک چینی ہوٹل تھا جس کے سائن بورڈ پر ایک ڈبل روٹی اور دیگر چینی اشیاء کی شکلیں اتری ہوئی تھیں نیز عجیب وغریب چینی طرز تحریر بھی منقوش تھی مگر کچھ انگریزی الفاظ بھی دکھائی دیتے تھے انگریزی الفاظ کے دکھائی دینے کی وجہ یہ تھی کہ اس ہوٹل میں علاوہ چینیوں اور برمیوں کے انگریز دوسرے یورپین اور ہندوستانی بھی آتے تھے۔ لہٰذا ضرورت کے مدنظر انگریزی تحریر بھی لکھ دی گئی تھی ہوٹل نہایت صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا ان میں کئی بارہ چینی لڑکے اس کی صفائی کرتے تھے اور بڑی محنت وجانفشانی سے کوڑہ کرکٹ کا ذرہ ذرہ تک چنتے تھے جب لوگ کھانے پینے کے لئے آتے تو یہ لڑکے بڑی تیزی اور مستعدی سے ان کی خدمت انجام دیتے اور جب میدان خالی پاتے تو ہوٹل کے کمپونڈ یا سڑک پر کھیل کود میں لگ جاتے تھے۔

اور ماتان کے ہوٹل کے اس جانب ایک موٹر کا کارخانہ تھا جس کے مالک دو مسلمان تھے۔ یہ دونوں حصہ دار اس قدر ہم شکل وہم شبیہ واقع ہوئے تھے کہ اکثر لوگوں کو ان کے حقیقی بھائی ہونے کا دھوکا ہوتا تھا۔ دونوں کے دونوں بڑے وجیہ اور طاقتور نوجوان تھے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ تمام دن دو کرسیوں پر بیٹھے رہیں اور اگر کوئی گاہک وہ بھی جو سوٹ میں آئے اس سے بات چیت کرلی ورنہ خیریت۔ یہ دونوں شخص ہمیشہ غمگین اور دل شکستہ نظر آتے تھے اس کارخانہ میں بارہ آدمی کام کرتے تھے کام کی کثرت کے باعث ان بیچاروں کو کبھی دم مارنے کی تک فرصت نہیں ملتی تھی ان میں سے اکثر مسلمان اور کچھ برمی تھے اس کارخانہ نے کافی شہرت حاصل کرلی تھی خراب سے خراب گاڑی بھی بعد درستی اس کارخانہ سے نئی بن کر نکلتی تھی اس لئے اس کارخانہ میں ہر ایک قسم کی موٹر موجود رہتی تھی۔

دکانات اور ہوٹل کے علاوہ اس حصہ میں سینما اور ناٹک گھر بھی موجود تھے تین بجے سے براس بینڈ بھی بجنا شروع ہوجاتا تھا اور شام ہوتے ہی سڑک اور دکانات کی برقی روشنی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کردیتی تھی۔

ایسے بارونق مقام پر غریب ماتان کے ہوٹل کا کیا شمار ہوسکتا تھا اس ہوٹل میں نہ برقی روشنی ہی تھی اور نہ انتظام ہی اچھا تھا۔ نہ ہوا کرے ماتان کو اس سردردی کی کیا ضرورت تھی امیر نہ آئیں غریب ہی سہی۔ اس کی آمدنی بڑے ہوٹل والوں سے بھی زیادہ تھی پھر اس کو نفاست زیبائش اور آرائش کا کیوں خیال ہونے چلا تھا ماہوار ۵۰ روپیہ کرایہ مکان ادا کردیتی تھی اور مکان دار بھی اس لحاظ سے خاموش تھا کہ یہ قدیم کرایہ دار تھی اگرچہ اس نے دوسرے ملگیات اور مکانات کے کرایہ بڑھادئے لیکن ماتان کے کرایہ میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ ماتان کے ہوٹل میں کوئی ملازم بھی نہیں تھا صرف چھ پائی کا مٹی کا تیل دو روز تک جلاتی تھی ایک پالس ماپوی نامی ایک بوڑھیا رہتی تھی جو ہوٹل وغیرہ بچھا کرتی تھی بارہ بجے تک پھل بیچنے سے فارغ ہوکر وہ ہوٹل واپس آجاتی اور اس کے بعد ماتان کے کاروبار میں

ہاتھ بٹاتی تھی اس لئے ماآن اس بوڑھیا کو مفت کھانا دیتی تھی اور پھول وغیرہ بیچ کر بوڑھیا پیسے جمع کر لیتی تھی عوام اچھی طرح سے واقف تھے کہ ان دونوں عورتوں کے پاس بہت کچھ روپیہ جمع ہے۔

ماآن کی صحیح عمر بتانا مشکل تھا اس لئے کہ بارہ سال پیشتر جب وہ ہوٹل کھولی تھی اس وقت جو حالت تھی اب بھی اس کی کاٹھی ویسی ہی تھی لیکن عوام کے اندازے سے اس کی عمر تقریباً ۴۵ سال کی تھی بایوی کے مقابلہ میں یہ عورت بہت زیادہ موٹی اور کالی بھی تھی اپنی جوانمردی اور استقلال کی کے لئے وہ پورے رنگوں میں مشہور تھی نہ تو کوئی شخص اس کو ایک پائی کا بھی دھوکا دے سکتا تھا اور نہ خود وہ اس قسم کی واقع ہوئی تھی اس لئے کبھی اس کے گاہک ٹوٹنے نہیں پائے اور اس کا کاروبار برابر چلتا رہا۔

حسب معمول آج سویرے بھی علی الصباح اٹھی اور بایوی کو جگایا پھر معہ بستر کے اپنے کمرے میں داخل ہو کر ہاتھ منہ دھو دھلا باہر آئی اور بایوی سے کہا کیوں اب تک کیا کر رہی ہو" بایوی نے جواب دیا" آج میں باہر نہیں جاؤں گی میری نیند پوری نہ ہو سکی اس لئے کہ کچھ طبیعت خراب ہے" یہ سن کر ماآن نے کہا" او ہو کیا خوب! اگر سو نہ سکیں تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ دن تمام خراب کیا جائے یہی سستی کا باعث ہے کہ تم روپیہ پیسہ جمع نہیں کر سکتیں"

بایوی نے پنکھا اٹھا کر جھلتے ہوئے کہا" پیسہ جمع کرنے سے فائدہ؟ کیا میرے کوئی اولاد ہے جو اس سے مستفید ہو گی یہ جو کچھ بھی جمع جتھا ہے موت مٹی کے لئے کافی ہے تم حریص بن کر کوڑی کوڑی جو جوڑ رہی ہو یہ تو بتاؤ کہ تمہارے بعد اس کا وارث کون بنے گا جوانی ہی میں تمہارے شوہر کا انتقال ہو گیا پھر تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں"

ماآن نے جوش میں آکر کہا" بھاڑ میں جائے ایسی شادی! جو دولت میں نے خون کا پسینہ کر کے جمع کی ہے کوئی دولت کا مرید مجھ سے شادی کر کے مرے بعد اس کا مالک بن بیٹھے گا اور جوے و شراب کی نذر کر دے گا"

ریلوے اسٹیشن ہوٹل سے قریب تھا۔ اسی دوران میں ایک گاڑی کے آنے کی آواز سنائی دی تو ماآن بات ادھوری چھوڑ کر دوڑی ہوئی باورچی خانہ میں چلی گئی اس لئے کہ گاڑی سے اترتے ہی مسافر چائے پانی پینے کے لئے اس ہوٹل میں آتے تھے۔ ماآن کے جانے کے بعد بایوی اپنا بستر لپیٹ کر اندر گئی اور مکان کی صفائی میں مصروف ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں مسافروں کی آمد سے سڑک پر خوب چہل پہل شروع ہو گئی ماآن کے ہوٹل پر تقریباً تیس آدمی آئے ان میں بوڑھے بچے سب ہی شامل تھے یہ لوگ مواضعات سے شہر کو مختلف اغراض کے تحت آئے تھے لڑکے وغیرہ دیہاتی زندگی سے تنگ آکر مہینہ دو مہینہ میں اسی طرح بطور تفریح شہر کا چکر لگاتے تھے اس کے علاوہ اپریل کے مہینہ میں شہر میں ایک بڑا میلہ بھی ہونے والا تھا اسی لئے اس دفعہ لوگ جوق جوق چلے آ رہے تھے۔

ماآن نے اس غیر معمولی مجمع کو دیکھ کر بایوی سے کہا" یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج تم نے باہر جانے کا ارادہ

فسخ کر دیا ورنہ کیسے ممکن تھا کہ میں اکیلی اتنے مہمانوں کا انتظام کرتی یہ تہوار کا زمانہ ہے چند روز تک روزانہ مسافروں کی یہی حالت رہے گی"۔ اس کے بعد اس نے ایک ڈول پانی چولھے پر رکھ دیا تاکہ تھکے ماندے مسافروں کے لئے جلد از جلد چار کا انتظام ہو جائے پھر وہ باہر آکر تمام مسافروں کو بغور دیکھنے لگی جن میں اکثر پرانے گاہک تھے اور بعض بعض چھوٹی سی بھی تھیں ان نوواردوں میں ایک شخص پر اس کی نظر انتخاب پڑی یہ شخص انگریزی وضع کا لباس پہنے ہوئے تھا اور سر کے بال بھی انگریزوں ہی کے بالوں کی طرح کٹے ہوئے تھے ان گنواروں کے غول بیابانی میں یہ شخص اجنبی اور رئیس مہذب معلوم ہوتا تھا۔

ماتان سب لوگوں سے بات چیت کر کے اندر چلی گئی اور راپوی سے کہدیا کہ سب کے لئے چار کا انتظام کر دیا جائے چونکہ خود خریدی سامان کے لئے مارکٹ جارہی تھی یہ کہہ کر وہ ٹوکری وغیرہ سنبھالے ہوئے باہر آئی اور مہمانوں سے منہ ہاتھ دھو لینے کے لئے کہا پھر ایک اشارہ سے گاڑی بان کو بلایا اور سوار ہو کر بازار کی طرف روانہ ہو گئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ ترکاری اور کچھ مچھلی وغیرہ لئے ہوئے گھر واپس آئی۔ اس وقت تک مسافر چار خوری سے فارغ ہو چکے تھے اکثر اپنے کاروبار پر باہر چلے گئے تھے اور باقی لوگ چٹائی بچھا کر برآمدے والے حصہ میں بیٹھے ہوئے تھے ماتان نے دیکھا کہ وہ اجنبی آدمی غائب ہے پھر کچھ سوچ کر اس نے گاڑی بان کو کرایہ دیا اور سامان لے کر باورچی خانہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد جب سب لوگ مل کر کھانے کے لئے بیٹھے تو ماتان نے دیکھا کہ اس وقت بھی وہ اجنبی غائب ہے۔ اس کو فکر پیدا ہوا اور اس نے اپنے ایک قدیم گاہک سے دریافت کیا "تمہارے ساتھ کا وہ نکیلا جوان کہاں ہے۔ وہ جو بڑا صاحب بنا ہوا تھا"

"ہماری بلا جانے" اس شخص نے جواب دیا کس کو معلوم کہ وہ کس مقصد سے آیا ہے اور کیا کام کرتا ہے سوائے اس کے کہ مانڈلے میں اس کے باپ کی ایک دکان ہے اور یہ اسی طرح فضول خرچی اور آوارہ گردی کرتا ہے"

مہمانوں کے کھاپی کر جانے کے بعد یہ دونوں عورتیں کھانے کے لئے بیٹھیں اور راپوی نے کہا "کیا میں اس نوجوان کا کھانا اٹھا کر رکھ سکتی ہوں۔ اس لئے کہ وہ بیچارہ اب تک نہیں لوٹا" اگرچہ ان معاملات میں ماتان بہت ہی سخت گیر واقع ہوئی تھی اس کا یہ کہنا تھا کہ جس شخص کو کھانا ہو وقت کی پابندی کرے اور جو شخص ذرا بھی دیر سے آتا اس کو کھانے سے محروم کر دیتی تھی لیکن اس نوجوان سے نہ معلوم اسے کس لئے محبت ہو گئی تھی کہ رحم آ گیا حالانکہ رنگون میں اس نے سینکڑوں حسین اور اس سے کہیں خوبصورت نوجوان دیکھے تھے۔ اس نے ماپوی کو جواب دیا "اچھی بات ہے رکھ دو۔ یہ اس کا پہلا موقع ہے اگر ہم پہلی ہی دفعہ سختی سے کام لیں تو کوئی دوبارہ پھٹکے گا بھی نہیں" ماپوی

نے اس شخص کا کھانا علیحدہ رکھ دیا اور یہ دونوں کھانے سے فارغ ہوگئے اس کے بعد بابوی برآمدے میں ایک چٹائی بچھا کر اپنی نیند پوری کرنے کے لئے لیٹ رہی اور اس کے بازو ماتان برمی چرٹ کے کش لگاتے ہوئے سڑک کی سیر میں منہمک ہوگئی۔ اسی دوران میں اس کو ایک دو مرتبہ اجنبی کا خیال پیدا ہوا اور پھر جب اس کا تصور بندھ گیا تو اس طرح خیالات پیدا ہونے لگے کہ اس نے صبح میں ایک پیالی چاء پی تھی وہ بھوکا ہوگا نہ معلوم بازار سے کچھ خرید کر کھایا بھی ہے یا نہیں وہ کھائے یا نہ کھائے ماتان کو تو پورے پیسے ادا کرنے ہوں گے پھر وہ خواہ مخواہ کا اسراف کیوں کرتا ہے۔ ماتان ہر شخص کو اپنے جیسا پس انداز دیکھنا چاہتی تھی اتنے میں وہ شخص تھکا تھکایا واپس آیا۔ ماتان نے فوراً منہ سے لایا چرٹ نکال کر پوچھا "صبح سے کہاں چکر لگا رہے تھے تمہارا کھانا تو ٹھنڈا پالا ہوگیا ہوگا"

"مجھ کو کئی کاموں پر جانا تھا اور بہت سے قصبات پھرنا تھا۔ اس لئے دیر ہوگئی" اس شخص نے کہا۔

ماتان نے کہا "تم کس معاملے لے لئے یہاں آئے ہو یہ تو میرا پہلا موقعہ ہے جو میں تم کو اس شہر میں دیکھ رہی ہوں"

"ارے معاملہ وغیرہ کیا۔ کچھ بھی نہیں" اس شخص نے کہا "یہاں میرا ایک قدیم دوست رہتا ہے اس سے ملنے کے لئے آیا ہوں"

"تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں رہتے ہو"

"مجھ کو مونگ لات کہتے ہیں اور میرا وطن ناڈلے ہے"

"اچھا آؤ اب ناشتہ تو کرلو بہت دیر ہوگئی"

"کیا آپ کی ہوٹل میں نل ہے۔ میں نہانا چاہتا ہوں"

گو ہوٹل میں نل تو تھا لیکن شاید و باید ہی کوئی مسافر نہانے کی خواہش ظاہر کرتا تھا اس لئے ماتان نے تاڑ لیا کہ یہ شخص ان گنواروں سے بالکل علیحدہ قسم کا آدمی ہے۔ اس نے حمام کی طرف اشارہ کرکے کہا "جاؤ وہاں نل موجود ہے۔"

غسل سے فارغ ہوکر اس نے ناشتہ کیا اور برآمدے میں ماتان کے قریب آکو بیٹھ گیا۔ اور بابوی جو اب تک خراٹے لے رہی تھی اس کی طرف اشارہ کرکے دریافت کیا "کیا یہ آپ کی بہن ہیں" "نہیں" ماتان نے جواب دیا۔ "کمک میں نے اپنی سہولت کے لئے انہیں رکھا ہے میرے کوئی رشتہ دار وغیرہ نہیں"

مونگ لات نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ہاں کسی کا نہیں رہنا ہی اچھا ہے"

یہ سن کر ماتان نے دل ہی دل میں خیال کیا کہ کسی بازاری عورت نے ضرور اس شخص پر جادو کیا ہے اور

یہ اس کا دیوانہ بن گیا ہے۔ غالباً اسی کی تلاش میں یہ سرگرداں پھر رہا ہے۔ اب ماآن کو اس کی کھوج پیدا ہوئی۔ اور تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے دریافت کیا "کیوں آپ کے خیال میں کسی رشتہ دار وغیرہ کا نہیں رہنا ہی کیوں مناسب ہے ؟ مصیبت میں تمہارا دکھ درمان کون کریگا۔ دیکھو جب تک میں تندرست ہوں میں ہاتھ پیر بھی ہلا سکتی ہوں اور کما تی بھی ہوں مگر جب فرش ہو جاؤں گی تو پھر حلق میں پانی کا ایک قطرہ بھی ڈالنے والا کوئی نہ ہو گا" ہونگ لات نے اس سلسلہ گفتگو کو کاٹ کر ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں اس لئے کہ ایک اجنبی عورت سے اپنے حالات بیان کرنا اس کو گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے بات کاٹ کر دریافت کیا "کیا یہ سامنے سینما ہے کیا اس سینما میں برمی فلم بھی دکھائے جاتے ہیں کیا تم بھی سینما دیکھنے جاتی ہو؟"

ماآن نے ایک حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا "ایسے لغویات کے لئے مجھے فرصت نہیں یہ تو نوجوانوں کا اکھاڑہ ہے۔ شام کو تم خود دیکھ لو گے کہ یہاں کتنے جوان جوان لڑکے اور لڑکیاں جمع ہوتی ہیں"

"ہاں میرا بھی کچھ ارادہ ہے کیا یہاں فی کس ایک روپیہ ٹکٹ ہے؟"

ماآن نے روکھے پن سے جواب دیا "اس سے کم اور زیادہ بھی ہوتا ہے"

کھیل کا وقت قریب تھا اور اتنے میں سینما کا بینڈ بجنا شروع ہوا۔ ہونگ لات نے بینڈ کی آواز سن کر اپنے جوتے کی ڈوریاں باندھنا شروع کیں۔ یہ دیکھ کر ماآن کہنے لگی "آہا! واقعی آپ تفریح کرنے کے لئے آئے ہیں نہ کہ کسی کام سے۔ اب میں سمجھ گئی بس"

ہونگ لات نے جواب دیا "کام تو ضرور ہے۔ اپنے والد کی دکان کے لئے کچھ سامان خریدنا ہے کل دیکھا جائیگا۔ آج تو طبیعت بہت پست ہے اس لئے کچھ نہ کچھ دل بہلائی کا سامان ہونا چاہئیے" ماآن نے دریافت کیا "کیا آپ کل تک میرے ہوٹل میں ٹھیرینگے؟"

نوجوان نے ڈوریاں باندھ کر کہا "ہاں ہاں! آپ ہی کے پاس نہیں تو اور کہاں رہوں گا ایک مرتبہ جہاں ٹھہر گئے ٹھہر گئے اور جب تک یہاں رہوں گا آپ ہی کی ہوٹل میں قیام رہے گا" اس شخص کے جانے کے بعد ماآن نے باورچی کو جگا کر کہا "تم تو ریل کے انجن کی طرح بھبکارے مارتی پڑی ہو۔ اٹھو جاؤ اور آگ سلگا کر چار کا پانی گرم کرو ابھی کوئی دم میں مہمان آتے ہی ہوں گے۔ چار کے لئے تڑپ جائیں گے۔ پھر دونوں عورتیں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

باورچی خانہ میں شدت سے گرمی ہو رہی تھی۔ اس لئے ماآن تھوڑی دیر کے لئے برآمدے میں آکر ٹہلنے لگی

ٹہلتے ٹہلتے یکایک اس کی نظر مونگ لات پر پڑی جو ایک نوجوان لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ ماتان تاڑ گئی کہ ہو نہ ہو یہی لڑکی ہوگی جس کی تلاش میں مونگ لات صبح سے شام تک مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس لڑکی کو ماتان پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ لیکن یہ خیال نہ رہا کہ کس مقام پر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ چونکہ ماتان چولھے پر چاول چھوڑ آئی تھی اس لئے پھر وہ باورچیخانہ میں چلی گئی۔

رات کو مقررہ وقت پر سب مسافر لوٹے اور کھانے کے بعد دن تمام کے تھکے ماندے غریب جلد ہی سو گئے لیکن مونگ لات چرٹ کے کش کھینچتا ہوا ایک چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت تک وہ دونوں عورتیں بھی کھانے سے فارغ ہو گئیں تھیں گرمیوں کا زمانہ تھا۔ اس لئے بند کمروں میں سونا ناممکن تھا تمام مسافر صحن اور سڑک کے بازو والے حصے پر سو رہے تھے برآمدہ خالی پڑا تھا دونوں عورتیں دو تختوں پر اپنا اپنا بستر جما چکیں بابوی نیند کی بہت پکی تھی۔ وہ بھی حسب عادت بستر پر لیٹتے ہی سو گئی ماتان اس اجنبی لڑکے کے حالات دریافت کرنے کے لئے بہت بے چین تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ سلسلہ گفتگو کس طرح سے شروع کیا جائے وہ ابھی اسی فکر و سوچ میں تھی کہ خود مونگ لات نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "یہاں سے کیمن ڈین کتنی دور ہے"؟

"تھوڑے سے فاصلہ پر ہے لیکن چلتے جانا دشوار ہی ہے آپ موٹر کے ذریعہ جا سکتے ہیں،" "کیا موٹر وقت سے چھوٹتی ہیں یا دن تمام چلتی رہتی ہیں"؟

"صبح سے شام تک۔ آپ جس وقت بھی جائیں"۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔ آج سینما میں اتفاقاً اس دوست سے ملاقات ہو گئی۔ میں جن کی تلاش میں تھا اب ماتان کو خیال آیا کہ اس نے اس لڑکی کو کیمن ڈین ہی میں دیکھا تھا یہ لڑکی کے والدین وغیرہ مر چکے تھے مگر اس کی ایک سوتیلی ماں تھی جس کے ساتھ یہ رہتی ہے۔ ان کے مکان کے بازو ہی ماتان کے ایک چچا زاد بھائی کا مکان ہے جب ماتان اپنے بھائی سے ملنے گئی تھی اس وقت اس لڑکی کو دیکھا تھا اب وقت زیادہ گذر چکا تھا اس لئے دونوں سو رہے۔

دوسرے روز علی الصباح سوائے مونگ لات کے سب مسافر چلا گئے چار پہنیے کے بعد مونگ لات شہر میں ٹہلنے کے لئے چلا گیا بابوی اپنے پھول کے بیوپار کے لئے روانہ ہو گئی۔ ماتان اکیلی کچھ فکر و تردد میں بیٹھی رہی اس کے ہوٹل کے بازو ایک غریب شخص کا مکان تھا اس کی ایک نوجوان عورت اور بچے بھی تھے۔ بیچاری صبح سے شام تک محنت کرتی بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے پورے کاروبار انجام دیتی تھی۔ ماتان کو اس کے حال

پر ہمیشہ رحم آتا تھا۔ لیکن آج حسد کی آگ بھڑک اٹھی کہ وہ شوہر اور اولاد والی ہے اور میں کیوں تنہا زندگی بسر کر رہی ہوں انہی خیالات میں دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ سونگ لات واپس آ کر کھانا کھانے کے بعد پھر باہر چلا گیا۔ اور ماتان رشک و حسد کی آگ سے چہرہ کو غصیلا بنائے بیٹھی تھی اتنے میں ماپوی داخل ہوئی اور یہ حال دیکھ کر دریافت کیا "کیا کسی سے لڑائی مول لی تھیں جو اس قدر برہم نظر آ رہی ہو"

"نہیں ہیں کیوں کسی سے لڑنے چلی تھی" ماتان نے جواب دیا۔

اس کے بعد دونوں مل کر کھانے سے فارغ ہوئے۔ ماپوی سو گئی اور ماتان کمرہ میں چلا گئی۔ اس کمرہ میں دو تین مقفل صندوق ایک عرصے سے اسی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ آج ماتان نے ان صندوقوں کو کھول کر دیکھا تو ہر ایک چیز جس حالت میں جمائی گئی تھی اسی طرح رکھی ہوئی تھی۔ ایک صندوق میں قیمتی ریشمی کپڑے دوسرے میں گہنا اور جواہرات اور تیسرا صندوق سنگھار دان کا تھا سب چیزیں جی بھر کر دیکھنے کے بعد ماتان نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا "افسوس کہ میرے کوئی اولاد بھی نہیں جو اس کی مالک بنتی اور اب میرا وہ زمانہ نہیں کہ یہ چیزیں استعمال کروں اگر پہنوں تو لوگ میری ہنسی اڑائیں گے"

بادل ناخواستہ پھر صندوق کو قفل لگا دیا اور باہر آ کر انہیں خیالات میں غرق ہو گئی۔

شام کو جب ماتان بازار جانے لگی تو ماپوی نے کہا "ترکاری وغیرہ کافی مقدار میں موجود ہے۔ پھر کیوں بازار جا رہی ہو"

"آج طبیعت گوشت کھانا چاہ رہی ہے میں آج گوشت کھاؤں گی" ماتان نے جواب دیا۔

"اس کی واپسی کے بعد گوشت وغیرہ کھانا ورنہ وہ بھی ہمارا حصہ دار بن جائے گا"۔

"پروا نہیں پہلے تو وہ کھاتا ہی کتنا ہے اگر کھائے تو کوئی مضائقہ نہیں"

یہ سخاوت اور دریا دلی کے الفاظ سن کر ماپوی کو سخت حیرت ہوئی۔ کہ ایسی کنجوس عورت جو پیٹ کو برابر کھانا تک نہیں کھاتی تھی۔ آج اس کے خیالات میں ایسا غیر معمولی تغیر ہو گیا۔

شام میں سونگ لات واپس آ گیا اور چار پینے کے بعد برآمدے میں تفریح کرتا ہوا ٹہلتا رہا۔ رات کو کھانے کے وقت ماتان نے آ کر بلایا تو اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے بستر پر لیٹ گیا ماتان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ سب پکا پکایا دونوں عورتوں نے مل کر ختم کر ڈالا۔

صبح میں ماتان نے ماپوی سے کہا "رات کو گوشت زیادہ مقدار میں کھانے کی وجہ سے آج میری طبیعت

خراب ہے تم پھول وغیرہ بیچنے مت جاؤ۔ میں آج کوئی کام بھی انجام نہیں دے سکتی یہ سن کر ماپوی تاڑ گئی کہ یا تو ماتان اس شخص کی دلدادہ ہو گئی ہے یا واقعی کسی عورت نے اس پر جادو چلایا ہے۔ اس نوجوان کے آنے کے بعد سے ماتان کے عادات و اطوار میں ایک غیر معمولی تغیر واقع ہو گیا تھا۔ ہمسایہ تک اس بات سے واقف ہو چکے تھے لیکن اس کی بدمزاجی سے ڈر کر کسی کو بھی سوال کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

آج علی الصباح وہ نوجوان بغیر جائے پئے باہر چلا گیا۔ یہ امر ماتان کو نہایت ہی شاق گزرا وہ کبھی تو اپنی جوانی کو یاد کرتی اور کبھی اس ادھیڑ پن کا خیال کرتی اور کہتی کہ وہ مجھ سے کیوں محبت کرنے چلا آخر میں ایک ادھیڑ عورت ٹھہری اور وہ حسین جمیل نوجوان لڑکی ہے۔ موتگ لات کا عشق اس لڑکی سے بجا ہے مگر خواہ مخواہ اس نے مجھ کو کیوں پھندے میں پھنسا دیا ہے اسی ادھیڑ پن میں رات ہو گئی اور موتگ لات بھی واپس آ گیا موتگ لات کے آتے ہی ماتان نے اس سے تیز لہجہ میں کہا "یہ کیا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ بستر سے اٹھتے ہی چلا جانا اور روزانہ آدھی رات کو واپس ہونا۔ تمہارے کھانے وغیرہ کی کون نگرانی کرنے والا ہے رہنا منظور ہے تو وقت کی پابندی کیجئے" موتگ لات کو تعجب ہوا کہ ایسی ملنسار عورت اور آج اس سخت کلامی سے پیش آ رہی ہے خیر اس نے بھی اسی طرح پر جواب دیا "نگرانی کی کوئی ضرورت نہیں میرا کھانا کسی کونے میں رکھ دیا کرو۔ میں ایک جگہ بیٹھنے کے لئے تو نہیں آیا ہوں۔ دوست احباب سے ملنے ملانے جاتا ہوں۔ تمہیں اس سے کیا غرض" ماتان نے کہا "ہاں ہاں تمہارے سب دوست و احباب کو میں خوب پہچانتی ہوں۔ اس روز سینما کے سامنے اچھی طرح سے دیکھ لیا۔ اسی کی تلاش تھی نا؟"

"کیا تم اس سے واقف ہو"۔ موتگ لات نے بڑے استعجاب کے ساتھ دریافت کیا۔

ماتان نے بے پروائی سے جواب دیا "میں اس کے خانگی حالات سے تو کچھ واقف نہیں ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ لڑکی میرے چچازاد بھائی کے مکان کے بازو ہی رہتی ہے"

موتگ لات اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اتنے میں ماپوی آ گئی۔ اور دونوں پر خاموشی چھا گئی۔

دوسرے دن بھی موتگ لات اسی طرح علی الصبح اٹھ کر چلا گیا اور رات میں جب واپس آیا تو بہت سی چیزیں خرید لایا تھا ماتان نے دریافت کیا کہ یہ سب ساز و سامان کس کے لئے ہے اس پر موتگ لات نے کہا کہ یہ چیزیں اس کے والد کی فرمائشات ہیں اور وہ کل سویرے کی گاڑی سے جانے والا ہے۔ بس یہ سننا تھا کہ ماتان کے دل پر تیر سی لگی اور وہ پریشانی سے سوچنے لگی کہ "ہائے اب اس کی صورت میرے لئے

لئے عنقا ہو جائیگی"۔

دوسرے روز سویرے مونگ لات سامان وغیرہ باندھ رہا تھا کہ ماان نے آکر کہا۔ "کیا آج واقعی جا رہے ہو"

"ہاں بس اسی گاڑی سے"

"تو کیا ماشن نے شادی کرنے سے انکار کر دیا"

"آثار تو کچھ ایسے ہی نظر آتے ہیں"

"لڑکی نوجوان اور حسین بھی ہے۔ اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتی"

"یہ میری بدنصیبی کا نتیجہ ہے میں تو اس کا دیوانہ ہو گیا ہوں اور وہ پرواہی نہیں کرتی"

یہ جملہ سن کر ماان کو ایک گونہ تسلی ہوئی۔ کہ ممکن ہے اپنی مقصد برآری ہو جائے جانے سے پیشتر مونگ لات نے مطالبات ادا کرنا چاہے لیکن ماان نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا کہ اس نے قسم کھائی ہے کہ ہر مہینہ وہ ایک مسافر کو بلا کسی معاوضہ کے رکھے گی۔ لہذا وہ پیسہ وغیرہ لینا نہیں چاہتی اور یہ آخر میں کہا "اگر آپ دوبارہ رنگون تشریف لائیں تو اسی غریب خانہ پر ٹھہریے"

مونگ لات نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور ضرور بضرور کہتے ہوئے رکشا میں سوار ہو گیا۔ گاڑی کے نظروں سے غائب ہوتے تک ماان حسرت بھری نگاہوں سے تکتی رہی اور جب گاڑی اوجھل ہو گئی تو دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ مونگ لات کے جانے کے بعد ماان ہمیشہ پریشان پریشان رہتی اس کو کسی کام میں بھی لطف نہیں آتا تھا کھانے سے نفرت ہو گئی تھی اور دن بدن اس کی حالت ردّی ہونے لگی وہ باربار اپنی حسرت بھری نگاہیں چاروں طرف دوڑاتی مگر افسوس سوائے یاس و نا امیدی کے کیا دھرا تھا تاہم اس کو امید کی ایک دھندلی جھلک نظر آتی تھی کہ کبھی نہ کبھی ایک بار تو وہ ضرور آئیگا گو میری خاطر نہ سہی عاشق ہی کے خاطر سہی"

کچھ عرصے بعد ماان بن سنور کر اپنے بھائی کے گھر گئی۔ اس کو اس قدر باسلیقہ پا کر اہل خاندان نے مضحکہ اڑانا شروع کیا۔ کوئی کہتا کیوں دلہن دلہامیاں کو کہاں چھوڑ آئیں۔ اور کوئی کہتا کیوں بہن شادی علیحدہ علیحدہ ہی کر لی اور کوئی کہتا رہا!!! لباس کیا پھب رہا ہے کہ بارہ سال کی بچی معلوم ہو رہی ہو۔ ماان نے کسی کے کہنے کی کوئی پرواہ نہیں کی اور ان کی باتوں کو کاٹ کر دریافت کیا کہ بازو کے مکان والے کہاں ہیں

توکسی نے جواب دیا کہ ان کی لڑکی اشین کی شادی ہونے والی ہے اس لئے وہ لوگ شادی کے لئے گئے ہوئے ہیں یہ سن کر ناتان دل ہی دل میں خوش ہوگئی اور رات دن اس لڑکی کی شادی کی دعائیں مانگنے لگی کہ اگر مونگ لات کے آنے سے پیشتر ہی شادی ہو جائے تو مناسب ہے ناتان کی اس بے چینی کو دیکھ کر بایوی نے سمجھا کہ اس پر یقینی کسی کے جادو کا اثر ہوا ہے یا یہ کہ وہ مونگ لات پر عاشق ہو گئی ہے چنانچہ اس نے نونجی نامی مشہور ساحرہ کو کچھ دے دلا کر ردعمل پر راضی کیا مگر خاک بھی اثر نہ ہوا۔

ناتان روزانہ مانڈلے سے آنے والی گاڑی کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتی تھی۔ چند روز کے بعد کچھ مسافروں کی ایک جماعت اس کے ہوٹل پر پہنچی۔ بایوی کو ان مسافرین کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ ان کے کاروبار میں مصروف ہو جانے سے ناتان کو اگلے جھگڑوں سے تو فرصت مل جائے گی مگر بے چاری کی تمام امیدوں پر پانی پھیر گیا اور وہ اس طرح سے کہ جب مسافرین اپنا اپنا سامان اتارنے لگے تو ناتان نے آگے بڑھ کر کہا "برائے مہربانی آپ لوگ مونگ شت کے ہوٹل تشریف لے جائیں۔ میں نے اپنا پیشہ ترک کر دیا ہے" ناتان کی اس حرکت کو دیکھ کر بایوی کو جو غصہ آیا تو چیخ اٹھی۔ "ارے غضب! یہ کیا بڑا جن تیرے سر سوار ہو گیا ہے۔ کیا تو واقعی پاگل ہو گئی ہے۔ کیا تو ابھی اپنے کو شادی کے قابل سمجھتی ہے۔ جب وہ نوجوان تیری ان حرکات کو سنے گا تو ایک پاگل سے بڑھ کر نہیں سمجھے گا۔

بوڑھیا کی باتیں ناتان کے دل پر اثر کر گئیں مگر غریب کیا کر سکتی تھی حضرت عشق کے ہاتھوں پہلے ہی بک گئی تھی خاموشی سے وہ اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ محلہ کے بچے بوڑھے سب کے سب ناتان سے بات کرتے ڈرتے تھے اور اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ اس کے نظر آتے ہی ہر شخص انگشت نمائی کرتا تھا۔ بچے اس کو دیکھ کر تالیاں بجاتے اس کا خاکہ اڑاتے اور ہجویہ اشعار پڑھتے تھے۔ وہ دیوانی نہیں تھی۔ پاگل نہیں تھی اس کے ہوش و حواس بجا تھے وہ اپنی ذلت اور رسوائی کو بھی محسوس کرتی تھی۔ مگر پھر بھی عشق کی آگ سے مجبور تھی وہ مندر جاتی اور مہاتما بدھ کے قدموں پر سر ٹیک کر زار و نزار روتی اور دعائیں مانگتی کہ کسی طرح سے اس کو نجات مل جائے تاکہ وہ پھر سے بالکل آزادانہ اپنی پہلی زندگی بسر کر سکے۔

اسی طرح کئی روز گذر گئے ایک روز وہ انہی خیالات میں غرق بیٹھی ہوئی تھی کہ باہر سے کسی نے دریافت کیا "کیا ناتان گھر پر نہیں ہے" یہ آواز مونگ لات کی تھی آواز کے سنتے ہی ... ناتان ... فوراً باہر نکل آئی

اندر کیا دیکھتی ہے کہ واقعی مونگ لات کھڑا ہوا ہے۔ مونگ لات نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا" میں نے سنا ہے کہ آپ نے اپنا پیشہ ترک کردیا کیا یہ صحیح ہے؟" "بالکل غلط تم سے کس نے کہا ہاں صرف چند روز سے مسافرین کو نہیں ٹھہرا رہی ہوں اس لئے کہ میرا مزاج درست نہیں تھا لائیے آپ اپنا سامان اندر لائیے"

مونگ لات مع سامان کے ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ ماتان چائے تیار کرنے کے لئے دوڑتی ہوئی چلی گئی اور ادھر ماہوی مغضوب الغضب ہوکر اپنے پھولوں کا ٹوکرا اٹھا بغیر مونگ لات سے بات چیت کئے اس کے سامنے ہی سے ہوکر گذر گئی۔ چائے پلا کر ماتان بازار کو جا بہت سی چیزیں خرید لائی اور خوشی خوشی مونگ لات سے دریافت کیا "کیا اس دفعہ بھی آپ انسانیت سے کام نہیں لیں گے کیا اب کی بار بھی وہی پہلے کی طرح دن تمام غائب رہا کریں گے کیا کھانا بھی وقت پر نہیں کھائیں گے"

مونگ لات نے کہا میں ابھی اس کا کوئی تصفیہ نہیں کرسکتا۔ کل آپ کو جواب دیدوں گا"

"آخر آج جواب دینے میں کوئی امر مانع ہے"

مونگ لات نے کہا" میں نے سنا ہے کہ ماشن کسی اور شخص سے شادی کرنے پر راضی ہوگئی ہے اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو دنیا سے ہمارا جھگڑا ہی پاک ہوجائیگا"

یہ سن کر ماتان بے حد رنجیدہ خاطر ہوئی اور وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی کچھ دیر بعد واپس آکر دیکھتی ہے کہ مونگ لات غائب ہے فوراً ایک موٹر کرایہ سے لے کر کمین ڈین پہنچی جس وقت ماتان پہنچی ہے۔ ماشن سینے پرونے میں مصروف تھی ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر اس نے دریافت کیا" کیا آپ میری ماں سے ملنے کے لئے آئی ہیں؟ ماتان نے جواب دیا "میں تم سے یہ دریافت کرنے آئی ہوں کہ تم نے مونگ لات سے شادی کرنے سے کس لئے انکار کیا ہے کیا تم مونگ لات پر ایک معمولی آدمی کو ترجیح دینا گوارا کرتی ہو"؟

ماشن نے کہا" معمولی کیسے" اور پھر اپنے بازو کے سونے کے کڑے بتاتے ہوئے کہا" دیکھو میں تو ایک مالدار شخص سے شادی کرنے والی ہوں مونگ لات نے تو اب تک مجھ کو کچھ بھی نہیں دیا"

ماتان نے کہا" کیا تم سونے کی خاطر اس شخص سے شادی کررہی ہو"

"ہاں! اور کیا" ماشن نے کہا۔

"اچھا تم اسی وقت میرے ساتھ چلو میں تم کو اس سے کہیں زیادہ زیور دیتی ہوں"

ماتان اس لڑکی کو اپنے گھر لے آئی اور اپنا پورا زر زیور اس کے حوالہ کردیا اور اس سے مطالبہ

کی قسم لی کہ وہ سوائے مونگ لات کے کسی اور سے شادی نہ کرے مع سامان کے لڑکی کو اس کے گھر روانہ کر دیا۔ اور خود برآمدے میں چین آرام سے خوشی خوشی بیٹھی ہوئی تھی کہ بابوی پہنچی اس کے آتے ہی ماتان نے بڑی خوشی سے کہا بہن میں نے اپنا پورا جمع جتھا اس لڑکی کے حوالے کرکے اس کو مونگ لات سے شادی کرنے پر راضی کر لیا ہے " یہ سنتے ہی بابوی نے بڑبڑانا شروع کر دی اور دولت کے ہاتھ سے کھو دینے پر بہت کچھ ماتان کو برا بھلا کہا لیکن ماتان نے سمجھایا کہ وہ سب دولت فضول تھی۔ آخر اس کا وارث ہی کون تھا۔ اس نے ایک بہت نیک اور بڑا کام کیا ہے مونگ لات کی جان بچائی ہے۔ بالآخر بابوی سے کہا کہ اب وہ پیگو زیارت کے لئے چلا جائے گی۔ اگر مونگ لات آئے تو یہ خوش خبری اس کو سنا دینا یہ کہہ کر دوپہر کی گاڑی سے وہ پیگو روانہ ہوگئی۔ کوئی چار بجے کے وقت مونگ لات واپس آیا۔ بابوی نے پورا قصہ اس سے بیان کیا کہ دنیوی آلام و مصائب سے بچنے کی خاطر وہ پیگو چلی گئی ہے۔ اور اپنی عمر کے باقی دن بالکل آرام اور آزادی کے ساتھ وہیں گذار دیگی۔

اس کے بعد مونگ لات بابوی کو ساتھ لے کر ماشن کے گھر پہنچا۔ اس کی خوب آؤ بھگت کی گئی دونوں کی شادی ہوگئی۔ اس وقت مونگ لات کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ ماتان کو کسی طرح سے نہیں بھول سکا تھا۔ چند روز بعد دلہا دلہن اور بابوی مل کر ماتان سے ملنے کے لئے پیگو روانہ ہوگئے۔ مگر افسوس ان کے پہنچنے سے قبل ہی ماتان اس جہان فانی کو خدا حافظ کہہ چکی تھی۔

(ماخوذ)

قاموس الاغلاط

غزل

از

جناب ڈاکٹر میر طاہر علی خاں صاحب مسلم

مری صبح حیات غم کی یارب شام ہوجائے — تجھے بھی انقلاب او گردش ایام ہوجائے

نہ خون بیگنہ پر ڈھانک دامن مارنے والے — کہیں ایسا نہ ہو یہ راز طشت از بام ہوجائے

جوانی جانیوالی ہے زمانہ مٹنے والا ہے — تغافل کیا میرے ساقی صلائے عام ہوجائے

نہ دیکھ آئینہ ظالم تو حسیں ہے عشق فتنہ ہے — کہیں مجھ سا نہ تو بھی عاشق ناکام ہوجائے

سزاوار عقوبت ہوں کہ تجھ پر جان دی میں نے — میں خوش ہوں گر مرا آغاز ہی انجام ہوجائے

غنیمت ہے بہت اے مسلم اپنی کس مپرسی بھی — ہے قابل رشک کے وہ شخص جو گمنام ہوجائے

بیس ڈو

روسو کا جوشیلا پیرو

(۱۷۲۳ - ۱۷۹۰ء)

از

جناب ابو المکارم فیض محمد صاحب صدیقی

روسو کے بلند پایہ تعلیمی، سیاسی اور سماجی خیالات جو فطری تحریک کی صورت میں ظاہر ہوئے - ان کا عوام پر اثر ہونا قطعی اور لازمی تھا لیکن سب سے پہلے جس شخص کو روسو کے خیالات اور اصول نے اپنا گرویدہ بنا لیا - وہ ہمبرگ کے ایک ٹوپیاں بنانے والے کا لڑکا بیس ڈو تھا - یہ اگرچہ من چلا اور ہوشیار تھا - لیکن ساتھ ہی آوارہ منش دہریہ لاپروا اور موقع شناس آدمی نہ تھا باپ نے ہزار کوشش کی کہ یہ اس کا پیشہ اختیار کرے مگر اس نے ایک نہ مانی اور ایک شخص کے پاس ملازم ہو گیا جس نے بیس ڈو کی قابلیت سے متاثر ہو کر اس کے باپ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ہونہار بیٹے کو تعلیم دلوائے - تھوڑی بہت تیاری کے بعد بیس ڈو دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لائزک روانہ کیا گیا - لیکن یہاں بہت جلد اس کے ملحدانہ خیالات ظاہر ہو گئے اور اُسے وہاں سے واپس ہونا پڑا -

۱۷۴۹ء میں ہولشائن کے ایک امیر ہر قان کوئیلن کے بچوں کا اتالیق مقرر ہوا یہاں اسے موقع ملا کہ اپنی تدریس کے مشہور طریقوں کو ترقی دے، اس کا طریقہ تعلیم عملی تھا اور مواد تعلیم کھیل کود اور دلچسپی سے متعلق چار سال کے اندر اندر اس کے سرپرست نے ڈنمارک میں رٹر اکیڈمی آف سورکی پروفیسری دلوائی لیکن ۱۷۶۱ء میں اس کے دہریانہ خیالات پھر سے جھلکنے لگے - لیکن حکومت نے اس کے حال پر اتنی نوازش کی کہ کوئی نقصان ہو پہنچانے کے بجائے اس کا تبادلہ الٹونا کے جمنازیم میں کر دیا یہاں رہ کر اس نے جرمنی کی فضا میں اپنے ملحدانہ اور مختلف النوع خیالات سے ایک ہلچل مچا دی -

بیس ڈو کے تعلیمی اصلاحات اور تصانیف اس اثنا میں بیس ڈو پر روسو کی مشہور عالم کتاب ایمل کا اثر پڑا

یہ کتاب ایک بڑی حد تک ہیرڈ کے طریقہ تفکر و تدریس اور اس کے تعلیمی اصطلاحات سے متعلق خیالات کے موافق تھی
اس لئے اس کو بہت آئی اور اس نے اس کے اثر کو بہت جلد قبول کیا۔ اس زمانے کے مدارس خراب طرز تعلیم
سے اس قدر زہر آلود ہو چکے تھے کہ ان کی اصلاح کے لئے فطری تحریک جیسے تریاق کی ضرورت تھی مدرسہ کے
کمروں میں مردنی چھائی رہتی تھی، کام دلچسپی سے نہ ہوتا تھا۔ جسمانی تعلیم سرے سے مفقود تھی، ضبط مدرسہ نہایت سخت
تھا بچوں کے ساتھ بڑوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا، طریقہ تعلیم اور لباس کا بھی بالکل یہی حال تھا لڑکوں کے لئے اپنے
بال سنوارنا، زریں لبادہ پہننا شوخ پاجامہ زیب تن کرنا اور تلوار لٹکانا ضروری تھا اس حالت میں اگر کوئی لڑکا
اپنے باپ کے بازو کھڑا ہوتا تو آپ سوائے قد و جسامت کے اور کچھ ایسا زیادہ فرق محسوس نہ کرتے لڑکیاں بھی
بالکل اسی طرح کا لباس پہنتی تھیں جس طرح جوان یا شادی شدہ عورتیں پہنا کرتی ہیں، تعلیم میں بھی علی ہذا اسی قسم کا تصنع
تھا السنۂ قدیم نصاب کا جزاعظم تھیں اور طریقہ تعلیم بھی بالکل گراں کا تھا۔

بیس ڈو کا حساس اور اصلاحی خیالات رکھنے والا دماغ اس گری ہوئی حالت کو کیسے گوارا کرتا اس نے
تعلیمی اصلاحات کا بیڑہ اٹھایا اور بہت سی تجاویز عوام کے سامنے پیش کیں۔ اس کی تعلیمی ترقی سے متعلق تجاویز نے
ایسی ہی شہرت حاصل کی جیسے کہ اس کی مذہبی تصانیف نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔ بیس ڈو
کے اچھے خیالات کو دیکھ کر ۱۷۶۷ء عیسوی میں برنشارف وزیر تعلیم نے اس کو اجازت دی کہ وہ اپنا سارا وقت
تعلیمی اصلاحات میں صرف کرے۔ اس کے دوسرے ہی سال بیس ڈو نے اپنے کارنامہ کے Address
on schools and studies and their influence on public happiness
ذریعہ شہزادوں، حکومت، اور دیگر مقتدر شخصیتوں کو متوجہ کیا کہ وہ ابتدائی تعلیم کے متعلق جن کا خاکہ وہ پیش کر چکا
تھا اس کی مدد کریں اس کی مادر وطن کے شہنشاہ اور یورپ کے دیگر حکمرانوں نے اس سلسلہ میں بڑی
دلچسپی کا اظہار کیا اور برنشارف، ہرش، لاویٹر، گوئٹے اور کانٹ جیسی ممتاز ہستیوں نے بھی دلچسپی لی
اور بہت تھوڑے عرصے میں دس ہزار ڈالر جمع ہو گئے چھ سال بعد بیس ڈو نے اپنی کتاب Element
Methoden کو ختم کیا اور اساتذہ اور والدین کے لئے بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام Element-
buch تھا اول الذکر کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے اس میں ایک سو تصاویر ہیں جن کو(ع) نے اس کتاب کی تصنیف

---

a Methodical instruction, both in Natural and ------

میں، روسو اور کمی نس کے اصولوں سے کماحقہ استفادہ کیا ہے۔ اس کو اٹھارویں صدی کی Orbis pictus[1]
کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں اشیا اور الفاظ کا مکالمہ اور تصویروں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے سب سے پہلے اس میں
قدرتی مظاہر اور قوتوں کا ذکر ہے۔ یہ روسو کی فطری تحریک کا اثر ہے۔ پھر اس کے بعد اخلاق، نفس، سماجی، فنون لطیف
تجارت کے کاروبار کا حال درج ہے Methodenbuch. اگرچہ یہ روسو کی تقلید میں نہیں لکھی گئی تاہم
بچوں کی فطری طبیعت کے متعلق روسو ہی کے خیالات سے مدد لی گئی ہے بعد میں بیس ڈو نے سالزمان اور دیگر شرکا
کی مدد سے بچوں کے کردار، دلچسپی اور ضروریات کے مدنظر بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا۔ ان
تصانیف میں Robinson der jangree. جو Swiss Family Robinson.
کے لئے تجویز ہی ثابت ہوئی۔ بہت عمدہ تصنیف ہے یہ کتاب غالباً اس لئے لکھی گئی ہے کہ روسو اپنی فطری تعلیم میں
Robinson crusee. کی سفارش کرتا ہے اس کتاب کو کیمپے نے ١٧٧٩ء میں شائع کیا۔

فلانتھروپنم کا انصاب اور طریقہ تعلیم

١٧٧٤ء میں بیرشن نے شہزادہ لیوپولڈ فریڈرک فرانز سے سفارش کی کہ وہ بیس ڈو کو ڈیسو پر ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی اجازت دے
تاکہ وہ اپنے تعلیمی خیالات کو عملی جامہ پہنا سکے لیوپولڈ نے نہ صرف اس کو منظور ہی کیا بلکہ بیس ڈو کے نام گیارہ سو تھا
(سواجی ایک سو پینسٹھ پونڈ) ماہانہ کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا تین سال بعد سکانات اور زمینات سے بھی اس کی مدد کی
پہلے پہل بیس ڈو کے تین مددگار تھے لیکن بعد کو تعداد خاصی بڑھ گئی۔ اور شرکا کار میں لائپزاک کے مشہور معلم
وولک پو۔ ٹشام کے پادری۔ کیمپے ارفرٹ کے پروفیسر سالزمان اور متین شاعر جیسی قابل قدر ہستیوں کا اضافہ
ہو گیا ابتدا میں مدرسہ میں تعداد طلبا بہت قلیل تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور تعداد پچاس تک
پہونچ گئی طلبا مختلف ممالک کے تھے جس کی وجہ یہ مدرسہ یورپ بھر میں مشہور ہو گیا۔ اس ادارے کے قیام کے کوئی ڈیڑھ
سال بعد بیس ڈو نے اکثر ممالک کے لوگوں کو اپنے مدرسہ کے معائنہ کی غرض سے بلایا تاکہ اس بات کا فیصلہ کرے
کہ اس کو جاری رکھا جائے یا نہیں، معائنہ کی رپورٹوں میں، جبرگ کے پروفیسر شوبل اور خود بیس ڈو کی رپورٹیں
بہت سی وقیع ہیں۔ ان سے ہم کو اس ادارے کے متعلق کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

---

[1] سترہویں صدی کے مشہور ماہر تعلیم کمی نس کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کتاب میں تصویروں سے مدد لی گئی ہے اور یہ پہلی کتاب ہے جس میں یہ طریقہ تعلیم اختیار کیا گیا ہمارے یہاں کے قاعدے اب تک اسی اصول پر لکھے جاتے ہیں۔

[2] Philanthropinum.

اس ادارے کا مقصد اعلیٰ یہ تھا کہ ہر کام فطرت کے مطابق ہو۔ بچوں کی فطری جبلتوں اور دلچسپیوں کی رہبری کی جاتی تھی نہ کہ ان کو کچلا جاتا تھا۔ ان کی تربیت بچوں کی حیثیت سے ہوتی تھی نہ کہ بالغ کے نقطۂ نگاہ سے طریقہ تدریس میں مدارج ذہنیت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ہر کی زندگی اور طریقہ تعلیم میں یگانگت و مطابقت پیدا کی گئی تھی۔ رسمی تصنع، تکلف اور غلامانہ پابندیوں کو اڑا دیا گیا تھا۔ بچوں کے کپڑے سیدھے سادے ہوتے تھے۔ ان میں تصنع نمائش اور تکلف نام کو نہ تھا۔

اگرچہ عام تعلیم کا خیال تسلیم کر لیا گیا تھا اور غریب و امیر دونوں کو تعلیم دی جاتی تھی، لیکن اس میں بھی ایک قسم کا فرق تھا وہ یہ کہ ایک طبقہ کو تعلیم سماجی کاروبار اور قائد بنانے کے لئے دی جاتی تھی اور دوسرے کو تدریس کے لئے۔ اس فرق کی بنا پر یہ بالداروں کے بچوں کو (۶) گھنٹے پڑھنا اور دو گھنٹہ دستی کام کرنا پڑتا تھا۔ برخلاف اس کے غریبوں کے بچوں کو ۶ گھنٹے دستی کام کرنا اور دو گھنٹے پڑھنا پڑتا تھا۔ ہر صورت میں دستی کام کو اہمیت دی گئی تھی علاوہ ازیں جسمانی ورزش اور کھیل بھی داخل نصاب تھے اس زمانہ میں چونکہ السنہ قدیمہ کا سکہ جما ہوا تھا۔ اس لئے لاطینی زبان کو نظر انداز تو نہیں کیا گیا تاہم السنہ قدیمہ سے زیادہ توجہ مادری زبان اور فرانسیسی زبان کو دی گئی تاکہ درس حقائق سے قریب ہو نہ کہ محض الفاظ کا گورکھ دھندا ہی رہے بیس ڈو نے اپنی کتاب **Elementar-werk** میں اس خیال کی پوری پوری پابندی کی ہے اور اپنی تصنیف کو حتی الوسع موضوعی اور عملی بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ چنانچہ اس میں زندگی کے مختلف شعبہ جات اور کائنات کی بے شمار اشیاء کے متعلق معلومات درج ہیں۔ انسان کے متعلق علم تشریح الابدان، علم عنصریات جانوروں کے متعلق خاصکر پالتو جانوروں کا تعلق ہے، نباتات ان کی نشو و نما اور پیداوار، معدنیات اور کیمیائی اشیاء ریاض و طبقات کے آلات، تجارت تاریخ وغیرہ کے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ بہم پہنچایا گیا ہے اتنا مواد بچوں کے معیار سے کہیں زیادہ بلند ہے، اس بات کو خود بیس ڈو نے محسوس کر کے اپنی تصنیف کو مختصر کیا۔

اس ادارہ کی نمایاں خصوصیت اس کے ترقی یافتہ طریقے ہیں زبان پہلے بول چال اور بعد کو پڑھنے سے سکھلائی جاتی تھی، قواعد کو بہت بعد میں شروع کرایا جاتا تھا، بات چیت، کھیل، تصاویر، ڈرائنگ وغیرہ سے مدد لی جاتی تھی اور پڑھنے کے لئے عمدہ اور دلچسپ موضوع تلاش کئے جاتے تھے گو اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے لسانی طریقوں کی سفارش مانٹین رانسکے لاک اور سب سے زیادہ کمی نس نے کی تھی لیکن بیس ڈو اور اس کے شرکاء سے قبل کسی نے اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ حساب، ہندسہ، جغرافیہ، طبیعات، مطالعہ قدرت

اور تاریخ میں زبان کی طرح تدریجی ترقی کا لحاظ رکھا گیا تھا حساب ذہنی طریقوں سے سکھلایا جاتا تھا، ہندسہ، صاف اور
صحیح اشکال کھینچنے سے، جغرافیہ پہلے گھر کا پھر محلے کا، پھر شہر کا، پھر ملک کا اور آخر پر براعظم کا تبلایا جاتا تھا
اسی طرح سے بچوں کو راست طریقے سے حقیقی زندگی کے مسائل سے واقف کرایا جاتا تھا۔

فلانتھروپینیم ادارے کے تدریسی اسکیم میں الہیت کے فطری مذہب کا بھی خیال رکھا گیا تھا بچوں کی توجہ پہلے
فطرت کے مختلف مظاہر اور انواع کی طرف متوجہ کی جاتی تھی اور پھر ان سے اسباب و واقعات کی توجیہ پوچھ کر
خدائے برتر کا تصور دلایا جاتا تھا۔

فلانتھروپینیم کا اثر

اس ادارے کو دیکھ کر لوگ بہت خوش ہوتے بالخصوص طلبا کی دلچسپی اور مسرت مدح خاص
طور پر قابل قدر تھی۔ کانٹ اس ادارے سے بہت متاثر ہو کر ۱۷۷۶ء میں کہتا
کہ یہ تدریجی اصلاح نہیں بلکہ تعلیمی انقلاب ہے اس تجربہ کی تعریف کرتے ہوئے اس نے کہا کہ یہ درحقیقت ترقی کا پیش
خیمہ ہے اگرچہ یہ مدرسہ بالغوں کے لئے اتنا زیادہ مفید نہ سہی تاہم بارہ سال یا اس سے کم عمر بچوں کے لئے
واقعی یہ حد درجہ سودمند تھا

بیس ڈو چند باتی آدمی ہونے کی وجہ سے اس ادارے کا انتظام نہ کرسکا اور اس کو چھوڑ کر وہ ڈیسو میں
خانگی طور پر تعلیم دینے اور اپنے اصلاحی خیالات سے متعلق تعلیمی مقالے تصنیف کرنے لگا کیمپے بھی ایک سال
بعد علیحدہ ہو گیا اور ہمبرگ میں اسی قسم کا ایک ادارہ کھولا اسی قسم کے اکثر ادارے مختلف مقامات پر کھولے گئے
جن کا تعلیم پر بہت گہرا اثر ہوا ۱۷۹۳ء میں فلانتھروپینیم بالکل بند ہو گیا اور اس کے اساتذہ تمام جرمنی میں پھیل گئے
ذوالک کمپے اور سالزمان بہت جوش و خروش سے کام کرنے لگے اور لوگوں نے بھی اس پیشہ کو اختیار کیا۔
ان نیم حکیم شیخ چلیوں نے پیشہ تدریس کو تجارت بنا کر اس کی مٹی خراب کر دی چنانچہ شلو سے کہتا ہے کہ "ڈیسو
سے مدرسین نکل کر تمام جرمنی میں پھیل گئے اور ہر ایک نے بیس ڈو کے خیالات کو اپنے لائحہ عمل میں شامل کیا
انہوں نے ادارے قائم کئے اور اس معزز پیشہ کو تجارت سے بدل دیا" بہرحال کچھ ہی ہو فلانتھروپینیم کا اثر اچھے
نتائج پیدا کئے بغیر نہ رہ سکا اگرچہ اس کی حمایت بہت تھوڑی تھی۔ مگر اس کا اثر کم و بیش تمام یورپ کے
ممالک پر پڑا اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہر قیام پر تعلیمی ادارے کارخانوں کی طرح کھل گئے بالخصوص جرمنی اور سوئٹزر لینڈ
کو اس تحریک نے کئی ایک نئے خیالات سے روشناس کرایا۔ جن کو بعد میں چل کر پیسٹالوزی ہربارٹ اور فروبل
نے ترقی دی۔ بہرحال باوجود اپنی چند ذاتی کمزوریوں کے بیس ڈو پہلا مصلح تعلیم ہے جس نے روسو کی فطری

شکستِ ساغر

از

جناب عزیز احمد صاحب عزیز

اک ادائے ناز سے ساغر کے ٹکڑے کر دئے — پھر ستمگر نے دلِ مضطر کے ٹکڑے کر دئے

بیخودی کا راستہ جس نے بتایا دہر کو — رہزنِ گردوں نے اس رہبر کے ٹکڑے کر دئے

شعلۂ دل کو بجھا کر صبر آجاتا تجھے — کیا غضب ہے مشتِ خاکستر کے ٹکڑے کر دئے

بے سکوں اس عرصۂ ہنگامہ پرور میں محال — ظلمتِ شب نے مہ و اختر کے ٹکڑے کر دئے

از

جناب ایم اسلم صاحب

رات کسی کی زلف سیاہ کی طرح تاریک تھی جاڑے کا موسم تھا تاریکی اور وحشت کاٹ کھانے کو دوڑتی معلوم ہوتی تھی۔ شائد موت کے فرشتوں کو ایسی ہی رات سہانی معلوم ہوتی ہے۔

کوہستان ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں جو نیرنگیٔ عالم کا نظارہ صدہا سال سے خاموشی سے دیکھ رہی تھیں اس تاریکی اور سکوت میں ایک ہولناک منظر پیش نظر کر رہی تھیں چاند جو دیودار کے فلک پیما پیڑوں کے عقب میں سے نمودار ہو رہا تھا۔ دزدیدہ نگاہوں سے وادی کی طرف جہاں برف نے اپنا تسلط جمایا ہوا تھا دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ پہاڑی ندی جو کبھی موسم بہار میں شباب کی امنگوں کو دامن میں لئے ہوئے کوہسار سے اتر کر گل گلزار سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی دیوانوں کی طرح اچھلتی اور کودتی وادی سے ہمکنار ہو کر تشنہ دہن میدانوں کو لذت وصل سے سیراب کیا کرتی تھی آج خاموش تھی موج یم پر جمود طاری تھا۔ ہوا میں رقص کرنے والے پیارے پیارے طائر پہاڑوں کی کھوہ اور درختوں کی سوراخوں میں پناہ گزین تھے اس سکوت اور خاموشی میں بھی ایک قسم کی راحت معلوم ہوتی تھی۔ جانے یہی وہ جگہ ہو جہاں روحیں جسم کو چھوڑ کر دوسروں سے جا ملتی ہیں۔

دامن کوہسار سے کچھ فاصلے پر جنگل کاٹنے والوں کی دس بیس جھونپڑیاں تھیں۔ ان لوگوں کا داروغہ "ٹھاکر رام" مزدوروں کی جھونپڑیوں سے کچھ تھوڑے فاصلہ پر پتھروں سے بنے ہوئے ایک مکان میں رہتا تھا جاڑے کے موسم میں برق و باد و برف کے طوفانوں سے پناہ لینے کے لئے مزدوروں نے اپنی جھونپڑیوں میں

گڑھے کھود رہے تھے۔ رات کو یہ لوگ انہی گڑھوں میں پڑے رہتے۔

"جے رام" انگیٹھی کے پاس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ انگیٹھی میں جو آگ جل رہی تھی اس کے شعلوں کی سرخی کمرے کے سب سامان پر ایک ہولناک سرخی پھیلا رہی تھی۔ جب آگ سرد ہونے لگتی تو "جے رام" اور ایندھن ڈال دیتا جب شعلے بھڑکنے لگتے تو وہ ان کی طرف کچھ اس طور سے دیکھتا گویا اس نے ایسے اچھنبے کی چیز اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں۔ اچانک باہر کے دروازے پر کسی کی دستک سنائی دی لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا دروازہ برابر کھٹک رہا تھا۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا شعلوں کے سینوں پر آتشیں پریوں کا رقص دیکھتا رہا۔ اب اسے باہر کا دروازہ خود بخود کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی اس وقت "جے رام" اپنے کمرے کے دروازے کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھنے لگا جیسے عورتیں کسی جنازے کی طرف سہم سہم کر دیکھا کرتی ہیں۔

آخر کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا سبز عینک لگائے بھیڑ کی کھال کا لمبا بوٹ پہنے اندر آیا۔ ایک میلا کچیلا رومال اس کے سر پر تھا اور آنکھوں کا کچھ حصہ بھی اس سے ڈھنپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ نووارد نے کمرہ میں آکر ادھر ادھر ایک نگاہ ڈالی اور پھر "جے رام" کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤنا" جے رام نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "اف توبہ کیسی ہولناک رات ہے" بوڑھا جے رام کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے اس کی عینک کے شیشے بھی شعلوں کی طرح چمکتے نظر آتے تھے۔ جے رام نے پھر پوچھا۔

"کچھ کھاؤ گے؟ میں نے سنا تھا کہ تم مر گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن تم جیسے سخت جان کب مرا کرتے ہیں" لیکن بوڑھے نے کچھ جواب نہ دیا۔ جے رام نے تھوڑا سا ایندھن انگیٹھی میں اور ڈال دیا اور بوڑھے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہاری خاموشی تو رات کی تاریکی سے بھی ہولناک معلوم ہوتی ہے"

آج طوفان باد حشر برپا کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بستی پر عذاب نازل ہو رہا ہے۔ درختوں کے گرنے کی "تڑ تڑ تڑاغ" بادل کی گرج اور بجلی کی چمک اور گاہے گاہے مکان کے کسی کونے سے پہاڑی الو کی منحوس اور کرخت آواز سے جے رام بیٹھے بیٹھے کانپنے لگتا اور پھر خود ہی منمنا کر کہنے لگا۔

"کبھی بچپنے میں سنا کرتے تھے کہ جب کوئی دیو کسی بستی کی طرف آتا ہے تو اس کی آواز سے پہلے خوفناک

طوفان آیا کرتے ہیں۔ آج بھی کچھ ایسا ہی معاملہ نظر آتا ہے"۔

اور پھر بوڑھے کی طرف دیکھ کر

"یہ بت بنے کیوں بیٹھے ہو بولتے چالتے کیوں نہیں اگر یہاں سونا ہے تو بستر موجود ہے۔ لیکن سنبھل کے سونا...... اس مکان میں کئی خوفناک واقعات ہو چکے ہیں۔ سنو گے؟" (اور پھر اپنے آپ سے) "یہ مکان میں آ کیسے گیا...... کہیں یہ بھی تو کوئی بھوت نہیں..... معلوم تو نہیں ہوتا"

بوڑھے نے صرف سر ہلا دیا۔

اس وقت ہوا اس زور سے چل رہی تھی کہ مکان کے تمام دروازے کچھ اس طرح ہل رہے تھے جیسے کوئی انہیں زور زور سے ڈھکیل رہا ہو۔ جے رام ذرا اور آگ کے قریب ہو بیٹھا اور پھر کہنے لگا۔

"دو سال ہوئے کہ اسی مکان میں میرے ساتھ دو اور آدمی بھی رہتے تھے تمہیں تو وہ سیلاب یاد ہی ہوگا۔ جو تمام بستی کو ویران کر گیا۔ یہ انہی ایام کا ذکر ہے۔ ان دو شخصوں میں سے ایک چین کا رہنے والا تھا جو جنگل بھی کاٹتا اور کام کاج بھی کر دیا کرتا اچھا آدمی تھا۔ وہ کئی دنوں سے بیمار تھا جس روز سیلاب کا زور تھا اسی روز دنیا کے دکھ سے نجات پا گیا۔ ہم نے مجبوراً اسی مکان میں گڑھا کھود کر اسے دبا دیا۔ لیکن دبانے سے پیشتر میں نے اس کے بالوں کی لامبی چوٹی جسے چین والے بڑی عظمت کی چیز تصور کرتے ہیں کاٹ لی اور جہاں ہم نے اسے دبایا تھا۔ اسی جگہ لکڑی کے ایک ستون سے باندھ دی۔ یہ بال آج تک ویسے ہی لٹک رہے ہیں"۔

یہ سن کر بوڑھے نے ذرا سا سر ہلا دیا۔ جے رام پھر بولا۔

"چین والوں کا خیال ہے کہ انسان کی روح پتنگ کی شکل کی ہوتی ہے اور چوٹی کے بغیر آسمان پر نہیں جا سکتی ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ خیر ایک روز میں یہاں اکیلا بیٹھا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی چینی جسے کئی روز ہوئے ہم نے زمین میں دبا دیا تھا اور گڑھے کے اوپر لکڑی کے تختے لگا دیے تھے۔ اندر آیا۔ اور ادھر ادھر جھانک کر جلدی سے باہر نکل گیا۔"

اس وقت بادل بہت خوفناک طور پر گرجنے لگا اور ہوا کے چلنے کی آواز کچھ اس طرح سنائی دینے لگی جیسے کوئی نالہ ماتم برپا کر رہا ہو۔ جے رام نے آگ ذرا اور تیز کر دی اور کہا۔

"شاید تم یقین نہ کرو لیکن وہ اکثر یہاں آیا کرتا ہے۔ وہی چینی مزدور۔ لوگوں نے مجھ سے کئی بار کہا ہے کہ میں اس کی چوٹی اسی گڑھے میں جہاں اسے دبا دیا تھا دفن کر دوں۔ لیکن میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ اس

کے بال جیتے جی تو واپس کرونگا نہیں۔ آئے اور ہزار بار آئے میرا کیا بگاڑے گا

بوڑھا خاموش بیٹھا تھا اور جے رام کو اونگھ سی آنے لگی تھی وہ بیٹھے بیٹھے دیوار سے پیٹھ لگا کر بولا۔
"مجھے تو آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اس گڑھے کے جہاں میں نے اس چینی کو دبایا تختے توڑ رہا
ہے...... وہم بھی بری بلا ہے۔"
پھر وہ اسی حالت میں سو گیا۔ بوڑھے نے سر اٹھایا اس کی طرف دیکھا اور پھر چپکے سے اپنی جگہ سے
اٹھا اور "جے رام" کی چارپائی کی طرف دبے پاؤں گیا۔ تکیہ کے نیچے جے رام کا ایک بھرا پستول رکھا تھا۔ بوڑھے
نے وہ اٹھالیا اور دوسری چارپائی پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر کے بعد پھر ہوا کا ایک ایسا زبردست جھونکا آیا کہ مکان کے سب کواڑ ہلنے لگے جے رام نے
خوفزدہ ہو کر آنکھیں کھولدیں۔ اور پھر وہ اس ستون کے پاس جس کے ساتھ اس نے چینی کی چوٹی کے بال باندھے
تھے جا کھڑا ہوا۔ دو بالوں کو اور مضبوط کر کے گانٹھیں دیدیں۔ اور پھر چارپائی پر پڑ کر چادر اوڑھ لی اس
وقت پھر کچھ اس قسم کی آواز سنائی دی جیسے کوئی تختے توڑ رہا ہو۔ وہ گڑھا جہاں چین کو دبایا گیا تھا۔ اسی کمرے میں
تھا کھٹ کھٹ کی آواز آنی بند ہوگئی۔ لیکن اب وہ تختے کچھ اوپر کو اٹھتے سے معلوم ہونے لگے۔ بوڑھا کلائی پر ہاتھ
رکھے ان تختوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور جے رام چارپائی پر پڑا خراٹے بھر رہا تھا۔

آگ سرد پڑ چکی تھی۔ اور کوئلوں پر سپید سپید راکھ نمودار ہونے لگی تھی۔ گو کمرے میں اندھیرا سا ہو رہا تھا
تاہم دو دہاں کے راستے پر جو ہوا انگیٹھی میں آتی اس سے کبھی کبھی کوئلے چمکنے لگتے اچانک جے رام نے کروٹ
لی اور سر اٹھا کر انگیٹھی کی طرف دیکھنے لگا اس وقت اسے یہاں ایک اور اجنبی بیٹھا نظر آیا۔ اس کا لباس
میلا کچیلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کے سر پر ایک چھوٹی سی جالی بندھی تھی بالکل ایسی جیسے
مدرسوں کے لڑکے تیتریاں پکڑنے کے لئے بنالیا کرتے ہیں اب جے رام اٹھ بیٹھا بوڑھا چارپائی پر پڑا انتظار
سو رہا تھا۔ جے رام اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس وقت کوئلے خوب چمک رہے تھے اور ان کی
سرخ سرخ روشنی کمرے میں بھی جلوہ ریز تھی

روہیں نے سنا تھا" جے رام اپنے آپ سے کہنے لگا کہ یہ کم بخت بہت دن ہوئے مر گیا۔ لیکن مردے بھی زندہ ہوا کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید مجھے غلط اطلاع ملی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (اور پھر انگیٹھی کی طرف دیکھ کر) "جانے یہ پاجی کون ہے اور یہ آیا کہ ہر سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید میرا وہم ہی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھلا اٹھ کر دیکھو لوں تو سہی کہ یہ ہے کون؟"

لیکن پیشتر اس کے کہ وہ چارپائی سے اٹھے اس کی نگاہ ان تختوں پر پڑی جن کے نیچے چینی دبایا گیا تھا تختے آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھ رہے تھے۔ پھر اسے چینی کا سر نظر آیا جے رام نے خوف زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور پھر جو آنکھ کھول کر دیکھا تو چینی اپنے دانتوں سے اپنی چوٹی کے بال ستون سے کھول رہا تھا۔ کیوں کہ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے اسی طرح اسی سے جکڑ کر جے رام نے اسے دبایا تھا جے رام نے دہشت زدہ ہو کر چادر اوڑھ لی۔ اس وقت وہ شخص جو انگیٹھی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اپنی جگہ سے اٹھا ساتھ ہی جے رام بھی چادر ایک طرف پھینک کر کھڑا ہو گیا لیکن پیشتر اس کے کہ وہ ایک قدم اٹھائے بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر جے رام کو گولی ماری

چینی اپنی چوٹی کے بال منہ میں سنبھالتا ہوا گڑھے میں کود گیا اور وہ اجنبی جس کے ہاتھ میں جالی والی لکڑی تھی جالی ہلا ہلا کر کمرے میں کچھ اس انداز سے ادھر اُدھر گھومنے لگا جیسے کوئی تیتریاں پکڑ رہا ہو۔ اس وقت پھر ایک بار بادل کی گرج اور رعد کی کڑک سے مکان لرز گیا اور ساتھ ہی پہاڑی اُلو کی دہشتناک آواز سنائی دی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔

اگلے روز جب جے رام دوپہر تک گھر سے نہ نکلا تو دو ایک آدمی دروازہ توڑ کر اندر گئے۔ وہ اپنے پلنگ کے پاس ہی مردہ پڑا تھا۔ پستول کی گولی اس کے جگر کو چھید گئی تھی دوسری چارپائی پر خالی پستول پڑا ہوا تھا۔

طرفہ تر بات یہ تھی کہ انگیٹھی کے قریب ہی دو میلے کچیلے لامبے کوٹ بھی پڑے تھے یہ دونوں کوٹ بستی کے ان دو بوڑھوں کے تھے جو سیلاب کے دنوں میں مرے تھے اور لوگوں نے انہیں گڑھے کھود کر اسی طرح دبا دیا تھا۔

تو کیا کار پردازان اجل بھی لباس پہن کر جے رام کی جان لینے آئے تھے؟

محبت کا دیوتا

کسی گزرے ہوئے دن کا ذکر ہے۔
میں چلا جا رہا تھا، راستہ مجھے پسند نہ تھا۔
ہوا گرم تھی اور محبت کا دیوتا، ایک سادے راہ گیر کے لباس میں مجھے ملا۔
اس کی جنبش سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی کی بادشاہی چھن گئی ہو۔
میری طرف بڑھ کر پر خیال فکرمندی سے۔
اس نے اپنا سر اس طرح جھکا دیا کہ کوئی اور نہ دیکھ سکے۔
اور جب میں قریب پہونچا تو اس نے مجھے نام لے کر پکارا
اور کہا:۔
میں اس وقت سے برابر سفر کر رہا ہوں جب میں نے تیرے قلب کی تخلیق کی تھی۔
اور اس عرصے میں ہیچ کا کہر برابر باقی رہا۔
لیکن تیرا دل اب میں ایک لڑکی کے سپرد کر دونگا۔
ان الفاظ کے بعد اس کی ہستی مجھ میں اس درجہ سرایت کر گئی
کہ وہ غائب ہی ہو گیا۔
مگر مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ کیونکر!

(دانتے)

ساحلی میدان کے باشندے

از

جناب احمد الدین احمد صاحب - بی اے

ساحلی میدان میں دراوڑی نسل کے لوگ زیادہ آباد ہیں۔ ان کے بے شمار قبیلے۔ ساحل ملیبار، کوچین۔ ٹراونکور اور مدراس کے جنوبی اضلاع میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کا معیار زندگی نہایت ادنیٰ ہے زیادہ تر کاشتکاری کرتے ہیں بعض تجارت پیشہ اور زمیندار بھی ہیں عام طور پر محنت مزدوری اور کھیتی باڑی میں مشغول ہیں۔ ان کی حالت ہندوستانی کاشتکاروں اور مزدوروں کے مقابلہ میں بہت خراب ہے زیادہ قابل عزت نہیں سمجھے جاتے سب کے سب شودر کہلاتے ہیں۔ گھانس پھوس کے جھونپڑوں اور کویلو کے مکانوں میں رہتے ہیں دو تین پیتل یا تانبے کے برتن کمہار کے بنائے ہوئے مٹی کے مٹکے، لوٹے اور ہانڈیاں یہی ان کی کل کائنات ہوتی ہے موٹا جھوٹا کپڑا استعمال کرتے ہیں کبھی کبھی ریشمی اور عمدہ قسم کا کپڑا بھی خرید کر پہنتے ہیں۔

دنیا کی نعمتیں اور عیش و آرام انہیں حرام ہے۔ جھونپڑیوں میں پیدا ہونا، جنگلوں اور کھیتوں میں کام کرنا اور جنگلی نباتات کی طرح جل بھن کر سپرد خاک ہونا ہی ان کا مقصد حیات ہے ان کا مذہب انہیں ہر قسم کی ترقی سے روک رہا ہے۔

۱۸۶۲ء تک ان کی حالت غلاموں کی سی تھی ان کے بعض قبیلوں کی حالت اب تک نہایت ابتر ہے کاشتکاری کرتے ہیں اور قرض کے معاوضہ یا کھیتوں کے خرید و فروخت کے معاملہ میں ایک مالک سے دوسرے مالک کے پاس کھیتوں کے ساتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

غربت، ناداری، قرض خواہی کے جتنے اسباب معاشین وقت نے سپرد قلم کئے ان میں سرکاری مالگزاری

کو افلاس کا سب سے بڑا سبب بتلایا ہے۔ اس کے علاوہ رسومات شادی بیاہ، اخراجات زراعت، ذاتی اخراجات اور سود در سود کا دباؤ بھی انہیں سر طرح تباہ کر رہا ہے۔

فرقہ واری جدوجہد اس حصۂ سرزمین میں بھی نظر آتی ہے ہر فرقہ آزادی اور ترقی کی کوشش کر رہا ہے حالات سرعت کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ جن فرقوں کو نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، جن کا قریب آنا سامنے سے گذر جانا، صبح اٹھتے ہی نظر پڑنا شگونِ بد سمجھا جاتا تھا، جن سے بات کرنا، چھونا، دھرم کی خرابی کا باعث ہوتا تھا اب وہ اپنے مطالبات نہایت دلیری اور جرأت سے مانگ رہے ہیں۔

ان لوگوں کو بڑی بڑی شاہراہوں اور بازاروں میں اونچی ذات والوں کے ساتھ سودا سلف اور لین دین کی مطلق اجازت نہ تھی مگر اب وہ ان سب پر عمل کرنے کے لئے تلے ہوئے ہیں ان کی اس بیداری پر چند برہمنوں نے بھی ان کی ہمدردی اور رہبری کا بیڑا اٹھالیا ہے۔

اب ہم چند دراوڑی قبیلوں کا مختصر حال بیان کرتے ہیں۔

قبیلہ پانٹ یہ قبیلہ جنوبی کنارا میں آباد ہے زمینداری اور کاشت کاری کرتا ہے نہایت سادی زندگی بسر کرتا ہے کھیلوں کا بہت شائق ہے مرغ بازی اور بھینسوں کی دوڑ اس کا پیارا مشغلہ ہے بھینسوں کو دو دو کر کے جوتتے ہیں اور دھان کے کھیتوں میں جہاں پانی اور کیچڑ خوب ہوتا ہے دوڑاتے ہیں جو جوڑا جلد جلد گذرتا اور کیچڑ اور پانی خوب اڑاتا ہے اسے عوام پسند کرتے اور انعام دیتے ہیں۔

لبٹاس ایک تلنگی فرقہ ہے جس کا آبائی پیشہ ماہی گیری ہے مگر اب روز بروز زراعت کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے۔

بلاواس یہ بھی ایک تلنگی فرقہ ہے جنوبی کنارا میں آباد ہے تاڑ کے جنگلوں میں کام کرتا اور تاڑی نکالتا ہے۔

چکلیاس یہ لوگ دباغ ہیں۔ چمڑے کا کام نہایت عمدہ کرتے ہیں۔ مگر ذلیل سمجھے جاتے ہیں گوشت اور مسکرات کا استعمال کرتے ہیں۔ جوان ہونے پر شادی کرتے ہیں بیواؤں کی شادی کا رواج ان میں موجود ہے۔

پیرواس ان فرقہ کو سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کو پلایاس بھی کہتے ہیں شمالی ملبار میں کثرت سے آباد ہے اور زراعت پیشہ ہے انگریزی راج سے پہلے اس قبیلہ

کے لوگ غلام تھے۔ ان کی خرید و فروخت علانیہ ہوتی تھی ۱۸۶۲ء میں قانوناً موقوف کردی گئی یہ لوگ پست قد اور سیاہ فام ہوتے ہیں۔

ڈومارا یہ ایک پہاڑی اور خانہ بدوش قبیلہ ہے اس قبیلہ کے لوگ زراعت کی طرف آرہے ہیں بڑے شرابی ہوتے ہیں ہر قسم کے جانور مار کھاتے ہیں۔ ان کو بھی ارذل میں شمار کیا جاتا ہے۔

کیکولانس ان کو ہمارے یہاں جلاہے اور کوشٹی کہتے ہیں یعنے کپڑا بننے اور تیار کرنے والا فرقہ بمبئی کے اطراف و اکناف میں کثرت سے آباد ہے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ فرقہ ان نوشاہوں کی اولاد میں سے ہے جنہوں نے سبر اسیم دیوتا کی بھوتوں کے مقابلہ میں امداد کی تھی اس فرقہ میں ایک عجیب و غریب رسم یہ ہے کہ اس کا ہر ایک کیکونس خاندان اپنی ایک لڑکی کسی دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتا ہے۔

کلانس تامیلی فرقہ ہے۔ لوٹ مار، قتل و غارت، چوری ڈاکہ اور نقب زنی اس کا پیشہ ہے۔ ضلع مدرا میں دربانوں کا کام کرتے ہیں۔ فصلوں کی حفاظت اور زراعت کا کام بھی اچھی طرح انجام دیتے ہیں۔

کاماس یہ سپاہی قبیلہ ہے۔ لیکن اب زیادہ تر زمینداری اور کاشتکاری کرتا ہے۔ بہت محنتی، جفاکش، اور ہوشیار تمام قبیلوں میں یہی ایک کسی قدر مہذب اور دولتمند ہے۔

کومائی یہ قبیلہ محنت مزدوری اور معمولی تجارت پر بسر اوقات کرتا ہے علاقہ مدراس میں ہر جگہ آباد ہے۔ یہ قبیلہ سب سے زیادہ غریب اور عسرت سے زندگی بسر کرتا ہے بھیک مانگنا اور در بدر پھرنا ان کا کام ہے۔

مارواڑ جنوبی اضلاع میں کثرت سے آباد ہیں ان کا پیشہ بھی لوٹ مار اور غارت گری ہے یہ ایک پہاڑی قبیلہ ہے جو اب تک اپنی اصلی زندگی بسر کرتا ہے

ان دراوڑی نسلوں کے علاوہ یہاں آریائی نسلیں بھی آباد ہیں جن میں نامبدری برہمن کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کوئی ضلع کوئی تعلقہ اور کوئی دیہات اور کوئی چپہ زمین ایسا نہیں جہاں ان کے خاندان کے خاندان آباد نہ ہوں اگر اس خطۂ زمین کو "برہمن آباد" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا یہ لوگ سب سے بڑے زمیندار اور پٹہ دار ہیں انہیں کے کھیتوں، باغوں اور گھروں میں دراوڑی لوگ کام کرتے ہیں بڑے دولتمند اور مالدار ہیں تعلیم کے بے حد شوقین ہیں۔ ان میں بڑے بڑے عالم، فاضل، پنڈت اور ویدانت کے جاننے والے موجود ہیں سنسکرت

اب تک ان کے سینہ میں زندہ ہے پرانی باتیں اور پرانی آئین اب تک ان کی زبان زد ہیں تہذیب جدید سے ہنوز دور ہیں پرانی طرز رہائش پر ہی عمل پیرا ہیں حالانکہ زمانہ بہت کچھ بدل چکا ہے اور سرعت سے بدل رہا ہے۔ پرانے طریقے رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جاتے ہیں اس کا فرق اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب ہم مہاراشٹرا کے برہمنوں کا ان سے مقابلہ کریں مہاراشٹرا کے برہمن تہذیب جدید کے برہمن ہیں۔ زمانہ کے ساتھ پرانی روش کو چھوڑ جاتے ہیں اسی لئے آزادی ہند کی سلسلے میں نمایاں حصے لے رہے ہیں ان کی بدولت ازل اقوام بھی سیاست اور حکومت تعلیم مذہب سے واقف ہوتی جاتی ہیں مگر ساحلی برہمن ہنوز آگے، بھاؤ اور مذہبی نذرانوں میں مشغول ہیں ملبار کا بجی ورم۔ کمبا کونم، ہتاولی، تنجور شمالی ارکاٹ اور شمالی سرکاروں میں کثرت سے آباد ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ہندوستانی عورتیں بذات خود بنک ہوتی ہیں اور بنک کے مقصد کو خوب انجام دیتی ہیں دنیا بھر کی دولت ان کے سر سے لے کر پیر تک جمع رہتی ہے مرد بھی ہر وقت کوئی نہ کوئی زیور بنا کر ان کے کانوں یا ناکوں، ہاتھوں یا پیروں میں پہناتا رہتا ہے۔ جہاں پیسوں کی ضرورت ہوئی یا اخراجات میں کمی پڑی تو کسی زیور کو لے کر بازار میں بیچ آتا ہے یا رہن رکھوا دیتا ہے اور اس طرح اس بنک سے اپنی ضروریات پوری کرتا رہتا ہے اکثر لوگ اپنے سرمایہ کو دفن رکھتے ہیں۔ اس سے مزید کام نہیں لیتے اور نہ اسے کسی کام میں لگاتے ہیں اسی لئے ہندوستانی دولت کو شرمیلی دولت کہا جاتا ہے سچ تو یہ ہے کہ اس کے استعمال اور کام لینے کے طریق سے ہندوستانی ناواقف ہیں۔

آزادی کی تحریک نے ملک میں بیداری پیدا کر دی ہے تعلیم یافتہ طبقہ زیورات کو ترک کرتا جاتا ہے سرمایہ کو مختلف کاموں میں لگانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں مگر تمام کاموں کے لئے اعتبار بڑی چیز ہے جب تک لوگوں کو اس کا یقین نہ ہو اس وقت تک وہ کسی کام کو کرنے یا دولت کو کام میں لانے کے لئے تیار نہیں ہوتے شمالی ہند اور دکن میں بعض کمپنیاں ایسی قائم ہو چکی ہیں جن میں وہاں کے لوگ حصے لے رہے ہیں مگر ساحلی میدان کے متمول گھرانے ابھی تک خاموش ہیں۔

یہاں کی عام معاشی حالت شمالی ہند کے مقابلہ میں پست ہے ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ اجرت پر کام کرانے والے کاشتکاروں اور مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے جو پٹہ داروں اور زمینداروں کے کھیتوں کی مالگزاری اور خدمت گزاری میں اپنی عمریں گذار رہے ہیں۔ متمول زمینداروں اور پٹہ داروں میں پڑھے لکھے لوگ بھی موجود ہیں مگر زراعت کے معاملے میں بالکل کورے ہیں اب تک پرانے طریقوں ہی پر عمل پیرا ہیں جدید آلات سے

بہت کم واقف ہیں

ان کا معیار زندگی بھی کوئی اعلیٰ نہیں رہنے سہنے کھانے پینے کے طریقے ابھی تک پرانے ہیں البتہ مکانوں کے موقع محل اور طریقہ تعمیر میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے اینٹوں اور کوئلوں کا رواج پھیلتا جاتا ہے۔ عام لوگوں اور غریب پیشہ وروں کے مکانات۔ مٹی، بانس اور کھجوروں کے پتوں سے بنائے جاتے ہیں۔

تقریباً سب کی غذا چاول ہے اعلیٰ اور اوسط طبقوں میں کافی اور چائے کا رواج زیادہ ہے غریب لوگ عام طور پر تاڑی پیتے ہیں۔ ناریل کا پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔

مالگزاری کی زیادتی اور سختی سے جو خراب حالت ان کاشتکاروں کی ہوتی جاتی ہے اس کو نیو انڈیا (New India) نے ۱۲ مارچ ۱۹۱۸ء ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ جو قابل غور ہے:۔

"ایک اینگلو انڈین جس کی آمدنی ۲۵۰۰۰ روپے ہے فی روپیہ ایک آنہ یعنی ۶¼ فی صدی شرح سے ٹکس ادا کرتا ہے لیکن مدراس کا غریب سے غریب کاشتکار اور پٹہ دار جس کی آمدنی صرف ۵۰ روپے ہوتی ہے حکومت کو ۲۵ روپے ادا کرتا ہے جو اس کی آمدنی کا نصف یعنی ۵۰ فیصدی ہوتا ہے کیا یہ طرز عمل درست ہے؟"

اسی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی گذر اوقات کے لئے ہی بمشکل کفایت کرتی ہے۔ دنیا اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ

"کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگار ہیں"

جب ان لوگوں کے پاس پیسہ ہی نہ ہو تو ان کا معیار زندگی کیا خاک اعلیٰ ہو اور فن زراعت کو کیونکر فروغ ہو

ساحلی میدان میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے۔ ملبار میں موپلا، کوکن میں میمن کچھی پٹھان آباد ہیں ان میں میمنوں اور کچھیوں کی حالت اچھی ہے سب کے سب تجارت پیشہ اور مالدار ہیں موپلاؤں کی حالت اچھی نہیں ہے یہ ہندوستانی عورتوں اور عربوں کی نسل سے ہیں مشرقی اضلاع کے مسلمانوں کی حالت ایسی ہی ہے ان کی آبادی مغربی اضلاع کی نسبت بہت کم ہے بعض دیہاتوں میں پائے ہی نہیں جاتے اور بعض میں ان کا ایک ایک خاندان ہی آباد نظر آتا ہے جو محنت مزدوری پر بسر کرتا ہے۔

ان کے علاوہ ملبار میں شامی عیسائی بھی آباد نظر آتے ہیں جو اقوام یورپ کے آنے سے پہلے یہاں تجارت کی خاطر آکر بس گئے تھے یہ لوگ خوبصورت اور حسین ہوتے ہیں۔

از

جناب رضی الحسن صاحب رضی سابق "مدیر حسن خیال"

صدمۂ اندوہ و حرماں یاس افزا ہو گیا — شورشِ جذباتِ غم سے حشر برپا ہو گیا

اخگرِ تارا جیسی ہستی نشاطِ عارضی — برقِ خرمن سوز کا لیکن بہانا ہو گیا

جرمِ الفت کی مگر یہ داد کیا اچھی ملی — آئینہ دیکھا تو خود محوِ تماشا ہو گیا

زیرِ خنجر بھی ترے بسمل کی آنکھیں وا رہیں — کیا نظر آیا کہ محوِ روئے زیبا ہو گیا

حرفِ مطلب آگیا ان کی زباں پر خود بخود — میری خاموشی سے اظہارِ تمنا ہو گیا

پھر قفس میں چار تنکے لائی ہے بادِ صبا — سامنے پھر خانہ بربادی کا نقشا ہو گیا

خوگرِ آلام یوں مائل ہو راحت کی طرف — اب تو دردِ دل میں کچھ کچھ لطف پیدا ہو گیا

بے نقاب اُن کو نہ دیکھا ہم نے جی بھر کر رضی
جوشِ حیرت پردہ دارِ روئے زیبا ہو گیا

گویا فلم کا ماضی و مستقبل

از جناب ابو الولا محمد ذکریا صاحب مائل

گویا فلم کا پہلا قدم

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بولتا سینما اسی سال ڈیڑھ سال کی ایجاد ہے مگر یہ صحیح نہیں حقیقت اس کے خلاف ہے جو لوگ فن سینما کا گہرا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور اس کے ہر دور سے واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ ماہران فن کی کوششیں فلم اور آواز کی تطبیق میں اسی وقت سے مصروف تھیں جب خود معمولی فلم سازی یا سینما کی صنعت بالکل ابتدائی حالت میں تھی یا اپنے عہد طفولیت سے گزر رہی تھی یا یوں کہیے کہ جب سینما کے فلم نہایت کم حیثیت دوکانوں اور ادنی درجہ کی کمپنیوں میں فروخت ہوتے تھے اور سوائے ادنیٰ درجہ کے آدمیوں کے کوئی ان کا پرسان نہ تھا۔

ایڈورڈ ووڈ فلم دوست جماعت کے مشہور مقالہ نویس کی رائے کے مطابق گویا سینما اب سے ۱۹ سال پہلے بنا جا چکا ہے خود ایڈورڈ ووڈ نے اس زمانہ میں دو بولتے ہوئے فلم سنے تھے جن میں سے ایک میں کسی گویّے کا گانا تھا اور دوسرے میں کسی خوشنوا باجے کی آواز تھی اس وقت یہ آواز خود فلم سے نہیں آتی تھی بلکہ سینما مشین کے پاس جو فونوگراف کا سا آلہ منتقل الصوت لگا ہوا تھا اس سے منتقل ہوتی تھی اس آلہ کو "فونو فلم" کہتے تھے جسے ڈاکٹر لی ڈی فارسٹ نے ایجاد کیا تھا اس میں یہ صنعت رکھی تھی کہ آواز سینری کے ساتھ ساتھ حسب موقع نکلتی تھی۔

اس ایجاد کا نتیجہ یک گونہ اچھا برآمد ہوا مگر اس سے ابھی ضرورت کی تشنگی رفع نہ ہوئی تھی اس لئے موجدوں نے اس کی تحسین و تکمیل پر توجہ کی اور مدتوں ترمیم و اصلاح اور ایجاد میں مصروف رہے یہانتک کہ اسے حد کمال تک پہونچا ہی دیا۔

موجدوں نے اپنے اپنے طریقہ پر جو کوششیں کی تھیں ان کی بدولت کئی مشینیں وجود میں آگئیں۔ جن کے

ذریعہ سے آواز اور فلم میں تطبیق کا کام لیا گیا تھا وہ مشینیں یہ ہیں۔ فیٹافون اور موڈی ٹون۔ موڈی ٹون سے اور مشینیں بھی تیار ہوئیں جنہیں فوٹو فون۔ فوٹو ٹون اور فلمافون وغیرہ کہتے ہیں۔

فیٹافون کی اختراع میں وہی اصول زیر کار تھا جس پر فوٹو فلم کی قدیم اختراع کا اساس تھا یعنے فیٹافون میں بھی ایک چھوٹے سے موم کے ستون سے جذب و تحفظ آواز کا کام لیا جاتا ہے جو فلم دکھاتے وقت شروع سے آخر تک اس کے ساتھ حسب موقع نکلتی رہتی ہے۔

موڈی ٹون اور مشینیں جو اسی کے اصول پر مبنی ہیں یا اس کی فرع ہیں وہ آواز کو فلم کی جانب منتقل کرتی ہیں جس وقت فلم کی نورانی و ظلی شعاعیں اسکرین پر پڑتی ہیں اسی وقت فلم آواز کو بھی اپنی مخصوص مشین کے ذریعہ سے منتشر کرتا ہے۔ شو بوٹ گویا فلم میں اسی ایجاد سے کام لیا گیا تھا۔

فیٹافون سب سے پہلے جس کمپنی نے اس ایجاد کو استعمال کرکے لینے لئے پیٹنٹ کرایا ہے وہ وارنر برادرس کمپنی امریکہ ہے اس کمپنی نے فیٹافون کا پہلا تجربہ ۱۹۲۶ء میں کیا اور New York. Metropolitan opera. نیویارک میٹروپولیٹن اوپیرا کے ملازم ایکٹر شملی کے گانے پبلک کے سامنے پیش کئے جو ڈون جوان نامی ڈرامے میں گائے گئے تھے اس فلم میں "جان باریمور" نے ہیرو کا پارٹ کیا تھا فلم کا آغاز "ہولیوڈ" کے نگران عام "ول ہیر" کی تمہیدی تقریر سے ہوا تھا۔

یہ تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ وارنر کمپنی نے "فیٹافون" کے ذریعہ سے کئی گانے والے فلم تیار کرلئے جن میں سے ہر ایک کامیاب و مقبول ہوا، اس کے بعد کمپنی نے مکالمہ کے فلم تیار کرنے کی کوشش کی، اس کے لئے ایسے ایکٹر تلاش کئے جو پہلے متکلم فلم میں ہیرو کا پارٹ کامیابی سے کرسکیں چنانچہ امریکن اسٹیج کے مشہور ایکٹروں میں سے آل جولسن کو انتخاب کیا گیا جس نے Jazz Singer "فلم میں ہیرو کا پارٹ کیا اور اپنے بعض وہ گانے بھی سنائے جو پہلے اسٹیج پر بہت مقبول ہوچکے تھے۔ اس کوشش میں بھی وارنر کمپنی کو کامیابی ہوئی اور آل جولسن بھی فلمی دنیا میں مقبول ہوگیا۔

اس کے بعد کمپنی نے ایک اور فلم Singing fool (مجنوں گویا) تیار کیا اس میں بھی آل جولسن کا پارٹ تھا۔ یہ فلم بہت سی خوبیوں میں پہلے فلم سے بہتر ثابت ہوا اور اب گویا فلم کو ایک طرح قبول عام حاصل ہوگیا جس کے بعد وارنر برادرس نے بہت سے بولتے ہوئے فلم تیار کئے۔ اس کے بعد پہلا فلم اڈگر ویلس انگلستان کے مشہور مصنف کے "رعب" نامی ڈرامے سے اخذ کرکے اسٹیج کے لئے

لکھا گیا تھا اس فلم کے متعلق نیو یارک اور لندن کے ناقدوں نے تبصرہ کیا تھا کہ "یہ فلم ایکٹنگ کے نقطہ نظر سے تو بہت ناکام اور ناقص تھا مگر پبلک میں نہایت مقبول ہوا اور وارنر برادرس نے اس سے قرار واقعی منفعت حاصل کرلی۔

امریکہ میں گویا فلم کا مجنونانہ ذوق اور اس کے اثرات

جب اس حیرت انگیز ایجاد کی کامیابی کا سہرا امریکہ کے سر بندھ گیا تو امریکہ اتنے انہماک کے ساتھ اسے رواج دینے میں مصروف ہوئے کہ ان کے اس شغف پر جنون کا دھوکہ ہونے لگا اس سلسلہ میں فلم کے متعلق صنعتی انتظامات تبدیل کئے گئے گویا فلموں کی مناسبت سے جدید طرز کی موزوں عمارتیں بنائی گئیں اور اتنے تغیرات کئے گئے کہ دنیائے فلم کی کایا ہی پلٹ گئی ایک انقلاب یہ بھی ہوا کہ اسٹیج کے بڑے بڑے ایکٹر سینما کے میدان میں اتر آئے جنہیں پہلے فلمی دنیا میں کوئی نہ پوچھتا تھا یا یہ خود اس شعبہ کو عبث اور ناقابل التفات سمجھتے تھے۔ اسی طرح سینما کے ان ایکٹروں کے لئے بھی کامیابی کا دروازہ کھل گیا جو کافی حسین و شکیل نہ ہونے کی وجہ سے خوبصورت مناظر میں ناکام ہوتے تھے یا پبلک انہیں کم قبول کرتی تھی۔ اب یہی ایکٹر اپنی آواز کی موزونیت کی وجہ سے مشہور فلم اسٹارز سے برابر کی ٹکر لینے لگے۔

ادھر یہ تغیرات روز افزوں تھے ادھر فلم کمپنیوں پر مسابقت کی بلا مسلط ہوتی جاتی تھی ہر کمپنی اپنے ڈرامے تیار کرنے کے لئے خاص خاص تجویزیں سوچتی اور اختیار کرتی رہتی تھی اور اس کوشش میں انتہائی جد و جہد کرتی تھی کہ کس طرح اپنے حریفوں سے بازی لے جائے بعض کمپنیوں نے اس کوشش میں اتنا مبالغہ کیا کہ خاموش فلم بنانا چھوڑ دئے۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کمپنیوں کے تیار کئے ہوئے تمام گویا فلم کامیاب ہو چکے ہیں؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ بہت سے فلم نامقبول ہوئے بلکہ یہاں تک نوبت پہونچی کہ اگر پبلک جدت پسند نہ ہوتی تو عجب نہ تھا کہ لوگ سینما کے نام ہی سے متنفر ہو جاتے یہ صرف جدت پسندی کی برکت تھی کہ اس عدم قبول پر بھی ٹاکی فلم بنانے والی کمپنیوں نے خاطر خواہ نفع حاصل کیا۔

گویا کے خلاف تباہ کن جدوجہد اور اس کا اثر

عوام کے رد و قبول سے قطع نظر کرلی جائے تو بھی گویا فلم کو اپنے مخالفوں کی تباہ کن کارروائیوں سے نہایت سخت مقابلہ کرنا پڑا اور اس سلسلہ میں بڑی مشکل سے پنپنے پایا۔ سینما کے نقادوں نے الگ کاری ضرب لگائی اور اسٹیج والوں نے الگ خطرناک جنگ شروع کردی ایکٹر بالعموم اپنی آواز ٹاکی میں اچھی طرح منتقل نہ کرسکتے تھے،

اس لئے ان کا اس ایجاد سے مستفید نہ ہوسکنا ظاہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس ایجاد کو اسٹیج کے خلاف ایک خطرناک
بدعت تصور کرتے اور اس کا قلع قمع لازمی خیال کرتے تھے۔
رہے نقاد تو ان کی متفقہ رائے ہے کہ گویا فلم عنقریب سینما کی دلکشی اور حسن و تاثیر کو تباہ کردے گا کیونکہ
اس کی بدولت بہت سے ایسے نامور فلم اسٹار بھی ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ جن کی ہستی پر سینما کی ترقی کا دار و مدار ہے
جب ان خطرناک حملوں سے سابقہ پڑا تو فلم ساز کمپنیوں کی آنکھیں کھلیں اور اب ہر کمپنی اپنی اپنی جگہ بولتے فلم بنانے
میں پوری جدوجہد صرف کرنے لگی۔ کام کو ترقی دینے کے لئے زیادہ تعداد میں ایکٹروں کی تیاری ضروری تھی اس لئے
انہیں ایکٹروں پر اکتفا نہ کی گئی جن کی آواز ٹاکی کے لئے موزوں تھی بلکہ غیر موزوں آواز والے فلم اسٹاروں کو بھی کارآمد
بنایا ان کے لئے بڑے بڑے ماہر فن استادان موسیقی نوکر رکھے اور انہیں اچھی طرح تربیت دلا کر ان کی آوازوں
کو گویا فلم کے قابل بنا لیا۔ ان مساعی کا نتیجہ بہت اچھا برآمد ہوا اور سینما کی صنعت فی الجملہ تباہی کی دسترس سے
محفوظ ہو گئی۔

سلک کو خوش رکھنے کی عجیب چال

گویا فلم کے سلسلہ میں ایک وقت یہ بھی درپیش تھی کہ بعض فلم ایکٹروں کو
عوام میں بہت زیادہ قبولیت حاصل تھی مگر ان کی آواز تعلیم و تربیت
کے بعد بھی گویا فلم کے لئے موزوں ثابت نہ ہوئی دوسری طرف، غیر مقبول ایکٹروں کے تیار کئے ہوئے فلم سلک سے
خراج تحسین نہ حاصل کر سکتے تھے اس لئے اس گتھی کا حل یہ تجویز کیا گیا کہ تصویر تو مقبول ایکٹر ہی کی رکھی گئی مگر آواز
تبدیل کر دی گئی یعنی صاحب تصویر کی آواز کے بجائے کسی خوش آواز ایکٹر کی آواز بھر دی گئی تاکہ جب فلم دکھایا جائے تو سننے
والے یہی سمجھیں کہ ہم جس ایکٹر کو دیکھ رہے ہیں اسی کی آواز آ رہی ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔
یہ چال خوب چلی اور اس میں فلم سازوں کو پوری کامیابی ہوئی ——— جن واقف حال لوگوں نے
"شو بوٹ" گویا فلم دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ اس فلم میں "لارا لا
پلانٹ" کا گانے کا پارٹ تھا مگر اس کی آواز فنی حیثیت سے موزوں نہ تھی۔ اس لئے بجائے اس کے دوسری
مغنیہ کی آواز بھر دی گئی تصویر اس کی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ اسی آواز کو بہت سے لوگوں نے گاتے وقت "لارا لا پلانٹ"
کی آواز سمجھا اور اسے دوسرے مواقع سے بہت زیادہ خوشگوار اور پسندیدہ محسوس کیا۔
مذکورہ بالا صورتیں ایسی تھیں جن کی بدولت فلم سازوں نے بہت سے ایکٹروں کو خطرہ سے نکالنے کا
طریقہ معلوم کر لیا اور ان کے لئے ایک کامیاب خوشگوار مستقبل مہیا کر دیا ورنہ ان میں سے بہت سی ہستیاں اس طرح

تباہ ہو جاتیں کہ کوئی ان کا نام بھی نہ لیتا۔

مختلف زبانیں اور گویا فلم ساز کمپنیوں نے متکلم فلم ایک ہی زبان میں محدود نہیں رکھے کیونکہ اس طرح یہ ایجاد دنیا کے ہر حصہ میں نہ پہونچ سکتی۔ بلکہ دوسری زبانوں کے فلم تیار کرنے کے لئے اپنے ایکٹروں کو اور زبانوں کی بھی تعلیم دلائی چنانچہ اکثر کمپنیوں کے بہت سے ایکٹر جو پہلے صرف ایک زبان سے واقف تھے اب متعدد زبانوں کے ماہر ہو گئے اس کی ابتدا غالباً اولی فرمیٹی سے ہوئی جو جرمنی کا باشندہ تھا جب اس ایکٹر نے ہنگری میں تیار کئے جانے والے فلم میں پارٹ کیا تو ہنگری ہی کی زبان استعمال کی جس میں وہ اچھی طرح کامیاب رہا۔

اس کے بعد تو گویا میں لغات کو اتنی جگہ ملی کہ اس پرانتو زبان کے فلم بھی تیار ہو گئے جو خیال کیا جاتا ہے کہ تمام دنیا کی بین الاقوامی زبان ہو جائے گی۔ غرض یورپ والے کوئی دقیقہ اپنی ایجاد کو رواج دینے میں فروگذاشت نہیں کرتے گویا فلم کی ترقی و تحفظ کے لئے بھی ہمیشہ نئی نئی تدبیریں سوچتے اور ان پر عمل کرتے رہتے ہیں۔

گویا فلم کے ماہروں نے اس ایجاد کو زیادہ مفید اور فیض رساں بنانے کیلئے گویا فلم کے ذریعہ سے اخبارات کی چھپی ہوئی تقریریں اور لیڈنگ آرٹیکل (مقالات خصوصی) بھی شائع کرنا شروع کرے تاکہ زمانہ کے مشہور و بلند پایہ خطیبوں کے تصویروں اور تقریروں سے دنیا کا کوئی متمدن حصہ محروم نہ رہے۔ مسولینی اور برنارڈ شاہ وغیرہ کے لکچر ہر جگہ پہنچ سکیں جو وقتاً فوقتاً مقامی اخباروں میں نکلتے رہتے ہیں۔

یہ تو انسانی آوازوں کا ذکر تھا، ہر قسم کی غیر انسانی آوازیں بھی گویا میں پوری اصلیت کے ساتھ محفوظ ہو جاتی ہیں اور جب انسان تماشہ گاہ کی نشست پر بیٹھے بیٹھے ان سب عجائبات کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو اسی فضا میں محسوس کرنے لگتا ہے جو سامنے کے نظارے سے نمایاں ہوتی ہے اور اس وقت کے ہر مشاہدہ کو اپنا واقعی مشاہدہ اور ہر حکایت کو اپنی سرگزشت خیال کرتا ہے کیا عبرت اندوزی اور اخلاقی تربیت کے لئے اس سے زیادہ کامیاب اور اثر انداز طریقہ کی ضرورت ہے؟ میرے خیال میں اب حد ہو چکی ہے اب بقدر حوصلہ و استعداد اس سے فائدہ اٹھانا باقی ہے۔

ہندوستانی گویا ایک نظر ضرورت تھی کہ ہندوستان بھی اس ایجاد کو اپنے یہاں رواج دیتے وقت اس سے فائدہ اٹھانے میں یورپ کے قدم بہ قدم رہتا اور صرف تفریح تک محدود نہ رکھتا مگر اور بہت سی باتوں کی طرح یہاں کے گویا فلم کا معاملہ بھی یورپ سے بالکل مختلف ہے، یہاں اول تو ہوشیار اور کامیاب فلمسازوں کا قحط ہے،

دوسرے اگر کچھ ہیں بھی تو ابھی تک ان کا مطمح نظر وہ نہیں معلوم ہوتا جو ترقی یافتہ آزاد اقوام کا ہونا چاہیے، یہاں تو زیادہ تر توجہ جلب منفعت پر رہتی ہے اور پہلے اسے دیکھا جاتا ہے کہ پبلک کن پہلوؤں سے زیادہ روپیہ دے سکتی ہے اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ لوگوں کے دماغی اور اخلاقی اصلاح کن اصولوں سے ممکن ہے اگر ہندوستانی برادری بھی صحیح تربیت و مہارت کے بعد مفاد عامہ کو مدنظر رکھے تو یوروپ کی طرح یہاں بھی دونوں مقصد حاصل ہو سکتے ہیں قبول عام بھی اور ملکی نفع رسانی بھی مگر ابھی تو ایک مدت تک اس کی امید رکھنا تقریباً لایعنی ہے۔

اب تک ہندوستان کے تیار کئے ہوئے جتنے گویا فلم دیکھے جا چکے ہیں ان کی حالت کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے نہ انہیں کسی حیثیت سے یورپ کے ٹاکی فلموں کے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن ابھی اس میدان میں ہندوستان کا پہلا قدم ہے۔ اس لئے مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

گویا فلم کا مستقبل

امریکہ، انگلینڈ اور جرمنی کے تیار کئے ہوئے گویا فلموں کا یہ سیلاب دیکھ کر بیشتر ارباب نظر اس صنعت و ایجاد کی کامیابی تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی ابھی ناپید نہیں ہیں جو اس حالت کو وقتی سمجھ کر گویا کی تباہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

بہرحال اس سے تو کسی صاحب عقل کو انکار نہیں کہ مرحلہ سخت ہے ہر ایجاد ابتداً ہمیشہ زبردست مشکلات سے دوچار ہوتی ہے اور موجدوں کو مضحکہ و طعن و تشنیع کے حوصلہ شکن صدمے برداشت کرنی پڑتے ہیں۔ اسی اصول پر خاموش سینما کو بھی ابتدا میں ایسی دلشکن حوادث سے گزرنا پڑا تھا۔ مگر آخر کو کامیاب ہوا اس لئے مستقبل کے متعلق سنجیدہ رائے یہی ہے کہ اگر گویا فلم (ٹاکی) مضبوط و سنجیدہ اصولوں پر قائم رہا تو اس کی عالمگیر کامیابی میں کوئی شک نہیں جس طرح اور بااصول ایجادیں مشکلات سے گزرنے کے بعد بھی اپنا لوہا منوا کر رہیں اسی طرح ٹاکی بھی کھرے سکہ کی طرح رواج عام حاصل کریگا لیکن اگر حالات اس کے خلاف ظہور میں آئے اور گویا فلم ناقص اور غیر مہذب بنتے رہے تو اس صنعت کی بربادی کا اور ناکامی بھی یقینی اور مسلمہ ہے۔

حقائق

از

حضرت کوکب شاہجہانپوری

جب معرفت مطلوب نہ تھی
مرہون تمنا کوئی نہ تھا

بیگانۂ ذوق طلب تھے دل
مصروف تقاضا کوئی نہ تھا

جب مہر و وفا کا ذکر نہ تھا
جب لذت درد کی قدر نہ تھی

جب بادۂ عشق و محبت کا
عالم میں پیاسا کوئی نہ تھا

جب جوش جنوں کا دور نہ تھا
تخئیل پہ چھائی نہ تھی وحشت

سودائی منزل کوئی نہ تھا
آوارۂ صحرا کوئی نہ تھا

احساس نہ تھا سرگرم خلش
ادراک نہ تھا خواہان تپش

کچھ اور ہی تھی دنیا کی روش
لذت کش ایذا کوئی نہ تھا

اک نعرہ "ہو" ہے ہم نے کیا
شیرازۂ ہوش و حواس ابتر

اس وقت کے سارے عالم میں
دیوانہ تمھارا کوئی نہ تھا

زندگی کا بہترین زمانہ

مشاہیر یورپ و امریکہ کے نقطۂ نظر سے

مترجمہ

(جناب حشمت اللہ صاحب صدیقی)

(مسٹر ٹی - پی لوگوتریم - بی - سابق ممبر دار العوام - لندن)

زندگی کا بہترین زمانہ کونسا ہے ؟ جوانی متوسط العمری یا ضعیفی ؟ اس سوال کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ بہترین زمانہ "کوئی نہیں ہے کیونکہ ہر چیز کا انحصار خود انسان کے حالات پر ہوتا ہے بہتیرے ایسے ہیں جن کے جوانی عیش و عشرت میں بسر ہوتی ہے لیکن انجام آلام و مصائب سے لبریز ہوتا ہے بہتیرے لوگوں کی جوانی رنج والم کا پیش خیمہ ہے لیکن آخر زمانہ مسرت خیز ہوتا ہے پس یہ واضح امر ہے کہ عمر کے کسی دور میں خوشیوں کا میسر آنا بالکل واقعات پر مبنی ہے۔

بہت سے سن رسیدہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جوانی عمر کا بہترین زمانہ ہے میں بذات خود اس خیال سے متفق نہیں ہوں اور شاید ہی کوئی ایسا جوان ملیگا جو اس خیال سے اتفاق کریگا جہاں جوانی میں امیدوں کے سبز و شاداب باغ لہلہاتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں ناامیدی کے ہاتھوں بادِ سموم کے جھونکے بھی چلتے رہتے ہیں۔

متوسط العمری انسان کی مصروفیت کا زمانہ ہوتا ہے اور جب وہ زمانہ کی گردش کے ساتھ خود بھی گرم رفتار ہوتا ہے تو اس کو یہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا کہ وہ مطمئن ہے یا نہیں۔

دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا بہترین زمانہ ضعیفی ہے کیونکہ یہ زمانہ تکلفات اور جاں کاہیوں سے بری ہوتا ہے۔ لیکن خود مجھ کو ضعیفی میں وہ امن و اطمینان نصیب نہیں ہوا جس کے خوش آئند تذکرے لوگوں کی زبانی سنا کرتا تھا حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے انسان ضعیف ہوتا ہے زندگی تکلیف دہ ہوتی جاتی ہے خود میری دور زندگی میں میری مسرت کا زمانہ وہ چھ سال کا زمانہ تھا جو دار العوام میں گزرا کیونکہ وہ میری جد

مصروفیت کا زمانہ تھا اور نت نئے اور حیرت انگیز واقعات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس دنیا میں اگر کوئی شخص خوشی کی زندگی بسر کر سکتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ اس کو مشکلات پر غالب آنے کا صحیح راستہ معلوم ہو جائے۔

(سر آرتھر کیتھ علم نوع انسانی کا مشہور ماہر)

مجھ سے اس امر پر اظہار خیال کرنے کی استدعا کی گئی ہے کہ زندگی کا بہترین زمانہ کون سا ہے اس کے متعلق میرا جواب ہے کہ یہ کسی خاص قاعدے کے تحت مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ دوران عمر کے کسی حصے میں بھی ممکن ہے۔ میں بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ان کی زندگی کا بہترین زمانہ وہ تھا جب وہ پندرہ برس کے تھے اور بہت سے ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے اپنے مسرت کا زمانہ پچاس برس کی عمر میں بتایا ہے چنانچہ انسان کی زندگی کا مسرت خیز زمانہ پندرہ سے پچاس برس کے دوران کے کسی حصہ میں بھی ممکن ہے اس کا انحصار خود انسان کی حالت پر ہے۔

اگر کسی پہلوان سے دریافت کیا جائے کہ حیات انسانی کا بہترین زمانہ کونسا ہے تو وہ یہی کہے گا جب قوت پورے عروج پر ہو ایک کاروباری آدمی مختلف لوگوں کے حالات کے واقعات کی بنا پر ہر قسم کا جواب دے گا۔ ایک ماہر سیاست کے سامنے اگر یہ سوال پیش کیا جائے تو ممکن ہے وہ یہ جواب دے کہ زندگی کا بہترین زمانہ انسان کی ترقیوں کی ابتدا ہے یا ممکن ہے یہ کہے سب انسان کی کوششیں بار آور ہو گئی ہوں اور ان کے ثمر سے دامن امید پر ہو۔

سائنس دان کی زندگی کا بہترین زمانہ کونسا ہے؟ اب پھر جواب کا واقعات منحصر ہونا ضروری ہے میں خود اپنے معاملہ میں کہتا ہوں خدا جانے میری خوشی کا زمانہ جوانی میں تھا یا اس وقت ہو گا جب میں سن رسیدہ ہو جاؤں گا بہر کیف میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کیا ایک مرتبہ ایک مشہور شخص نے اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا کہ سارے آدمیوں کو جیسے ہی وہ ساٹھ برس کی عمر کو پہونچیں دارو‌ئے بیہوشی دے دینی چاہیئے، غالباً اس کا خیال راستی پر مبنی تھا۔

(ہیر نک ڈی کیلاگ مشہور امریکی مدبر)

انسان کی زندگی کا بہترین زمانہ ستر (۷۰) اور اسّی (۸۰) کے درمیان ہے جوان اور متوسط العمر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم سن رسیدہ لوگ اس دور زندگی سے گزر چکے ہیں جبکہ دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ ان کا خیال غلط ہے جتنا ہی ہم بوڑھے ہوتے ہیں اتنا ہی زمانہ کی گردش ہماری دلبستگی کے لئے نئے نئے سامان فراہم کرتی ہے اور عجائب روزگار چیزیں مشاہدے میں آتی رہتی ہیں میں خود اپنے معاملہ میں کہتا ہوں کہ بہ نسبت پہلے کے اب میں اپنے کو بہت بہتر حالت میں پاتا ہوں کاہلی سے مجھے عار ہے اور حکومت کے بامشقت کاموں سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنا سارا وقت سینٹ پال کے دفتر میں یا گولف کھیلنے میں گزارتا ہوں ایک محنتی اور جفاکش آدمی کے لئے گولف بہترین کھیل ہے۔

میرے ایک شفیق دوست جو مجھ سے دس بارہ برس بڑے ہیں فرماتے ہیں کہ چھہتر برس کی عمر ہونے پر بھی ابھی میں اعلیٰ مدارج پر نہیں پہونچا ان کا قول ہے کہ انسان کو اپنی ہستی کے رموز سمجھنے کی اسوقت تمیز ہوتی ہے جب وہ اس سے تجاوز کر جاتا ہے چنانچہ میں خود بھی اس بہار آفریں زمانہ کا نہایت شوق سے انتظار کر رہا ہوں

(روسیٹا فوربس مصنفہ)

میں کہوں گی کہ مرد کے لئے عمر کا بہترین زمانہ تیس (۳۰) سے چالیس (۴۰) کے درمیان ہے اور عورت کے لئے چھبیس (۲۶) سے چھتیس (۳۶) کے مابین ہوگا ان عمروں میں مرد و عورت دونوں زندگی کی شگوفہ کاریوں سے مستفید ہونے اور عمدہ عمدہ باتیں حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں کمسنی کا زمانہ ناتجربہ کاری کا ہوتا ہے اور تجربہ حاصل کرنے کی سعی میں کسی نہ کسی طرح ٹھوکر لگتی رہتی ہے جس سے دل کو صدمہ پہونچتا ہے۔ میرا روئے سخن مرد عورت دونوں اور خصوصاً عورت کی طرف ہے۔

تیس اور چالیس کے درمیان کا مرد اور چھبیس اور چھتیس کے درمیان کی عورت اس قابل ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے روزانہ واقعات سے چیدہ چیدہ اور عمدہ باتیں انتخاب کر لے اس وقت نیک و بد کی بخوبی تمیز ہو جاتی ہے اور وہ سمجھنے لگتی ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہے یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب کہ زندگی دلکش معلوم ہوتی ہے اور ان میں بھی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

کیا یہ واقعہ کہ انسان زندگی کی دلچسپیوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے یہ نہیں ثابت کرتا کہ وہ مرد ہو یا عورت خوش اور مطمئن ہے اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میرا جواب اثبات میں ہے جب انسان زندگی میں دلچسپیاں

نہیں پاتا ہے تو وہ ہرگز خوش نہیں ہے اسی طرح اگر کوئی خوش اور مطمئن ہے تو زندگی اس کو بیحد دلچسپ معلوم ہوتی ہے ایک خوش نصیب عورت یا مرد کبھی مغموم نہیں رہتا اور اس کو دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بیحد دلچسپی ہوتی ہے

(لیڈی ڈروتھی لمس مشہور سیاح اور مصنّفہ)

میں کہوں گی کہ عورت کے لئے زندگی کا بہترین زمانہ قریب تیس برس کے ہے۔ اس وقت عورتوں کی کثیر تعداد عقل سلیم سے بہرہ ور ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے "کیا عورتیں کبھی عقل سلیم سے بہرہ ور ہو سکتی ہیں؟" - یہ مسئلہ ذرا بحث طلب ہے لیکن میری ذاتی رائے ہے کہ اگر عورت نے تیس سال کی عمر کو پہنچنے تک کچھ تجربہ اور عقل حاصل نہ کر لیا تو پھر معینہ مدت گزرنے کے بعد وہ کبھی حاصل نہ کر سکے گی۔

بیس برس کی عمر زندگی کے نشیب و فراز سمجھنے کے لئے بہت کمسنی کا زمانہ ہوتا ہے اور جب وہ چالیس سے تجاوز کر گئی تو وہ اُن نعمتوں سے محروم ہو گئی جو تیس سالہ عورتوں کو حاصل ہوتی ہیں۔

اس لئے میں کہوں گی کہ عورت کے لئے تیس سال کی عمر زندگی کا بہترین زمانہ ہے مرد کے لئے جداگانہ صورت ہے وہ عورت کی طرح جلد مائل بہ انحطاط نہیں ہوتا اور اپنی جوانی اور قوت کو زیادہ عرصے تک قائم رکھ سکتا ہے میری رائے میں مرد کے لئے عمر کا بہترین زمانہ چالیس یا اس کے قریب تر ہے اس وقت تک اس کے بہت سے ارمان پورے ہو جاتے ہیں اور پھر بھی بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے کافی جوان رہتا ہے۔ بہت سے لوگ منزل مقصود پر اس وقت پہونچتے ہیں جب اپنی محنتوں کے ثمرے سے لطف اندوز ہونے کا وقت گزر جاتا ہے اور اپنی پیش از وقت جانفشانیوں پر حسرت بھری نظر ڈالتے ہیں اور اس وقت کو اپنی زندگی کا بہترین حصہ شمار کرتے ہیں۔ اس لئے حقیقتاً میں حیاتِ انسانی کا بہترین زمانہ اس وقت کو تسلیم نہیں کرتی ہوں جب کہ وہ آرام سے بیٹھ کر اپنی ترقی کے مدارج پر نظر ڈال سکتا ہے۔ بلکہ یہ زمانہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔

میری رائے میں یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب اس کی عمر چالیس یا اس کے قریب تر ہوتی ہے۔

(جون کرافورڈ مشہور فلم ایکٹرس)

جوانی جوانی ہی ہے کیا کبھی تم نے کسی جوان مرد یا عورت کو زمانہ کی کوتاہی پہ دستِ تاسف ملتے ہوئے دیکھا

ہے ؟ میں سینکڑوں نوجوانوں کو جانتی ہوں جو سن رسیدہ لوگوں کی دولت و امارت حکومت اور فرصت پر رشک کرتے ہیں مگر کسی نوجوان کو سن رسیدہ کی عمر پر رشک کرتے نہیں سنا جوان اور طاقتور ہونا ہمہ نعمت ہے کیا متوسط العمر مرد اور عورت اپنی جوانی کے زمانہ پر حسرت بھری نظر نہیں ڈالتے ہیں ؟ وہ جیسے جیسے عمر کے مدارج کو طے کرتے جاتے ہیں اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں کہ اب ان کو جوانی کی سی خوشی نصیب نہیں ہو سکتی ۔

اس لئے میں پرزور الفاظ میں کہوں گی کہ جوانی حیات انسانی کا بہترین زمانہ ہے ۔ یہ زمانہ زندگی کی بہار ہے اور دنیا کی ساری نعمتیں قدموں کے نیچے ہوتی ہیں نہ کسی چیز کے جاتے کا غم ہوتا ہے اور نہ یاس ہمت توڑتی ہے اسی زمانے میں آرزو تمنا اور حوصلے کی فراوانی ہوتی ہے اور امیدوں کے ہرے بھرے لہلہاتے باغ نظر آتے ہیں ۔

ان سب باتوں سے قطع نظر شباب محبت کا زمانہ ہے جس کے بغیر انسان کو سچی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی چنانچہ جوانی دنیا میں ایک بے نظیر شے ہے اور مرد یا عورت کے لئے زندگی کا بہترین زمانہ ہے ۔

(لیڈی وسٹ مورلینڈ مصنفہ)

تیس سال کی عمر زندگی کے اس دور میں ہوتی ہے جبکہ انسان چیدہ چیدہ باتیں حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے ۔

بس یہ مسلّمہ ہے کہ یہ دور زندگی کا بہترین زمانہ ہے عمر کے اس اسٹیج پر قدم رکھنے تک بہت سے لوگ ابتدائے جوانی کی غلط کاریوں کی تلافی کر لیتے ہیں اور زندگی کا صحیح مفہوم سمجھنے اور عقل کی رہنمائی سے کام کرنے کی قدر کو جاننے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔

چونکہ میں عورت ہوں اس لئے فطرتاً نسوانی نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ مرد بھی صنف نازک کی طرح آغاز جوانی میں غلط کاریوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور جیسے جیسے وہ عمر کے میدان کو طے کر کے تیئویں سال میں قدم رکھتے ہیں عقل و تمیز ۔ غور و خوض اور وقت کی قدر کا مادہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے ۔

عام طور سے لوگ جوانی کو زندگی کا بہترین زمانہ تصور کرتے ہیں لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے ۔ ہم جوش جوانی میں محض عارضی مسرت کے لئے بہت سی دیوانہ اور ناروا حرکتیں کر بیٹھتے ہیں اور بعد میں خود کردہ فعل پر نادم و پشیمان ہوتے ہیں ۔ مثلاً آغاز جوانی کی شادی ۔ متوسط العمر عورت یا مرد چالیس برس کی عمر کے اسٹیج پر قدم رکھنے سے پہلے ایک خاص حد اور معیار تک کام کر لیتا ہے اور اپنی گذشتہ محنتوں ۔ جفاکشیوں اور آئندہ مزید ترقی کے اسباب پر اطمینان اور دلچسپی سے غائر نظر ڈال سکتا ہے ۔

واشنگٹن مشہور ایکٹرس

عمر کا بہترین زمانہ خود انسان کی ذات پر منحصر ہے بہت سے نوجوان اپنے پیشہ وفن کی ان کامیابیوں کو جن کی تکمیل کا عزم صمیم اور غیر فانی مقاصد دل میں لے کر وہ گامزن ہوئے تھے رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ پیشہ ورجو کامیابی کی منزل پر پہونچ گئے ہیں اپنی جوانی پر دست تاسف ملتے ہیں جس کو کھو کر انھوں نے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے لیکن میرے خیال میں جیسا کہ قاعدہ ہے لوگوں کی زیادہ تعداد اپنی سب سے بڑی کامیابی کے زمانے کو زندگی کا بہترین زمانہ تسلیم کرنے پر اتفاق کرے گی اگر ایک بڑے مدبر، نامی انجنیر اور مشہور سائنس داں سے دریافت کیا جائے تو ان سب کا یہی جواب ہوگا کہ ان کی زندگی کا بہترین زمانہ وہی ہے جب ان کو مقاصد میں عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ حقیقتاً ان کی عمر کا بہترین زمانہ وہی ہوسکتا ہے جبکہ ان کی کامیابی حد معراج پر پہونچ گئی ہو اور وہ ساری دنیا کو اپنے زیرنگیں تصور کرتے ہوں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میں یہ کہتی ہوں کہ زندگی کا ہر دور اپنی جگہ پر بہترین زمانہ ہے کسی کو فوق نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا سارا انحصار خود انسان کی کارکن ہستی پر ہے۔

مبادی نفسیات

مرتبہ شیخ عبدالحمید صاحب صدیقی بی اے آنرز

یہ اردو میں نفسیات پر نہایت معقول اور محققانہ تالیف ہے انگریزی میں اس مضمون کی جو معرکۃ الآرا کتابیں ہیں ان کا مطالعہ اور باہمی تقابلہ کرکے مولف نے سلیس اردو میں یہ کتاب مرتب کیا ہے جو نفسیات جیسے دلچسپ اور کارآمد مضمون پر اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ثابت ہوگی قیمت عہ

جدید مطبوعات

افسانے

خواب و خیال — مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کے دس افسانوں کا مجموعہ ایوان اشاعت گورکھپور سے شائع ہوا ہے قیمت فی جلد ۱عہ/ مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتا ہے۔

انتقامِ فطرت — ایک مختصر معاشرتی افسانہ "مسٹر خان" کے قلم سے فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور سے شائع ہوا ہے

چینی کی انگوٹھی — مرزا عظیم بیگ چغتائی کے دو مختصر مزاحیہ افسانے "چینی کی انگوٹھی" اور "لوٹے کا راز" یکجا شائع ہوئے ہیں قیمت ۱۰/ مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔

کولتار — مرزا عظیم بیگ کا ایک مستقل مزاحیہ معاشرتی ناول ہے بہت اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ نہایت موزوں سائز پر شائع ہوا ہے قیمت عہ/ مکتبہ ابراہیمیہ سے بھی مل سکتا ہے۔

سوانح عمریاں

تذکرۂ جمیل — دورِ حاضرہ کی تعلیم یافتہ مسلم خواتین کے ادبی کارنامے، سوانح حیات اور تعلیمی جد و جہد کو محمد عبد الرزاق صاحب بسمل نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے قیمت عہ/ مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔

ظریفانہ

لاٹھی اور بھینس — ملا رموزی کی تازہ ترین تصنیف ہے قیمت ۸/ مکتبہ ابراہیمیہ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

شاعری

نقش و نگار جلیل احمد صاحب قدوائی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں بارہ نظمیں، پینتالیس غزلیں اور دس رباعیاں شامل ہیں۔ کتابت و طباعت بہت اچھی ہے قیمت عہ

دیوان ملا رموزی ملا رموزی کی چند نظموں کا مجموعہ ہے جس کے شروع میں ایک دیباچہ بھی انہیں کے قلم سے ہے اور جوش کی ایک نظم بھی شامل ہے قیمت ۴ر

تنقید

گناہ کی دیوار مصنفہ اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی قیمت ۸ر

اردو ادب میں ڈراموں کے فقدان اور ڈرامے اور اسٹیج کی پست حالت کو سب سے زیادہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے محسوس کیا، ڈرامے کے میدان میں جتنی کوششیں کی گئیں وہ انفرادی کامیابی سے قطع نظر مجموعی طور پر قابل مبارکباد ہیں۔ کہ اب اردو میں جدید ڈرامے برابر لکھے جا رہے ہیں۔

پیش نظر ڈرامہ جو اشتیاق حسین صاحب قریشی کے قلم سے نکلا ہے باوجود بہت کچھ خامیوں کے قابل ستائش ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خامیوں پر نظر ڈالی جائے تاکہ یہ خامیاں زبان میں مستقل نہ ہو جائیں۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ڈرامہ اسٹیج پر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ڈرامہ کے اخلاقی پہلو پر مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ آرٹ، اخلاقیات کی غلامی نہیں کر سکتا لیکن اس ڈرامہ میں اسی چیز کی کمی ہے جو ڈرامہ کا اصل مقصد ہے یعنی زندگی یہ ڈرامہ جو زندگی کی مصوری کرنے کے لئے لکھا گیا ہے خود زندگی سے عاری ہے، اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کا ایک پمفلٹ بن کر رہ گیا ہے باوجود حقیقت نگاری کی کوششوں کے زندگی کی آگ کہیں نظر نہیں آتی۔ عمل (Action) بہت سست ہے عمل کی سستی کی وجہ سے کرداری اداکاری کو کوئی مدد بھی نہیں پہنچ سکتی کیونکہ مکالمے کا بجا زیرو بم کرداری اداکاری میں حقیقت کا رنگ پیدا ہی نہیں ہونے دے سکتا۔ یہ تمام خرابیاں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ مصنف نے بجائے براہ راست کتاب زندگی سے استفادہ کرنے کے، موجودہ یورپ کے ڈرامہ نگاروں سے کتابی استفادہ

کیا ہے۔

ڈرامہ اور ادب کی دوسری صنفوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ڈرامے کا مقصد، زندگی کی صرف ایک اہم اور ہلچل پیدا کر دینے والی ساعت کی نقاشی ہے، ڈرامے زندگی کے صرف ایک انقلاب انگیز واقعے کو پیش کرتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے ارسطو نے اتحادِ عمل، اور اتحادِ مکان کے ساتھ اتحادِ زماں کی قید بھی قائم کی تھی۔ یہ ڈراما اس اہم شرط کو پورا نہ کر سکا۔

قصہ یہ ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی کو اپنے خیالی معیار سے گرا ہوا پاتا ہے، اس سے کشیدہ رہتا ہے، اس کا ایک چالاک دوست دھوکا دے کر دونوں میاں بیوی میں تفریق پیدا کرا دیتا ہے۔ شوہر سادھو بن کر جنگل چل دیتا ہے اور بیوی، چالاک دوست کی ہمدردی کے بھروسے پر اس کے ساتھ بھی چلی جاتی ہے۔ چالاک دوست فریبِ ہوس کی تکمیل کے بعد اسے ایک چکلے کے مالک کے حوالے کر دیتا ہے اور بیوی بیوہ بن جاتی ہے اس زندگی سے بیزاری کے عالم میں ایک اصلاحی انجمن کا سرگرم رکن اسے اس چکلے سے نکال کر اس کے شوہر کے سپرد کر دیتا ہے۔ شوہر پھر اپنی بیوی کی بظاہر گناہوں بھری، لیکن فطرتاً پاک زندگی سے متاثر ہو کر اس کی خطاؤں سے درگزر کر جاتا ہے۔

جدید ڈرامہ اس قسم کے پلاٹ کا بمشکل متحمل ہو سکتا ہے اور پھر اختصار کے ساتھ تو اس پلاٹ کی مٹی پلید ہونا ضروری ہے جدید ڈرامہ کے اصول سے قطع نظر پلاٹ میں اس کی صلاحیت موجود تھی کہ وہ زندگی کے متضاد پہلوؤں کے مکالمے اور اداکاری سے نہایت حسن کارانہ انداز سے پیش کرتے۔ لیکن مکالمہ اور سٹنگ [illegible] کی حد تک ڈرامہ نگار کو تو کامیابی نہیں ہو سکی اداکاروں کی کامیابی کا کیا امکان ہے؟

پھر بھی یہ کوشش مبارکباد کی مستحق ہے۔

(عزیز احمد)

درسی و تعلیمی کتابیں

(ان میں سے اکثر کتابیں قلمروئے آصفیہ حضور نظام کے مدارس میں داخل نصاب ہیں)

۱۔ خیابانِ اردو۔ از عارف مدیر صبح دکن۔ ہندوستان کے ماضی و حال کے ممتاز انشا پردازوں اور شعرائے گرامی کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب ضخامت (۳۲۰) صفحے قیمت مجلد (عاں)

۲۔ حدائق الاخلاق از مولانا نذرمین کے نظم و نثر کے مجموعہ جو ہائی اسکولوں کے لئے نہایت مفید ہے ضخامت (۱۵۰) صفحے قیمت (عہ)

۳۔ تنظیم الاخلاق۔ از سید عبدالعزیز عزیز لڑکے اور لڑکیوں کے لئے اخلاقی نظموں کا مجموعہ ضخامت (۹۸) صفحے قیمت ۱۲ر

۴۔ خزینہ اخلاق از سید عبدالعزیز عزیز اخلاقی اور اول نظم و نثر کا مجموعہ جو لڑکے اور لڑکیوں کے لئے بیحد مفید ہے ضخامت ۶۴ صفحے قیمت ۶ر

۵۔ قاعدہ فارسی۔ از ابوالمحاسن متین طریقی۔ راستہ پر فارسی زبان کا جدید قاعدہ قیمت ۶ر

۶۔ درس فارسی حصہ اول از ابوالمحاسن متین طریقی راستہ پر فارسی کی پہلی کتاب قیمت ۸ر

۷۔ مخزن القواعد از میرزا علی رضا شیرازی لکچرار سٹی کالج ہائی سکول کے لئے فارسی کی بہترین گرامر قیمت ۱۲ر

۸۔ عقائد الامام۔ از محمد عبدالغفور عابدی حضرت امام اعظم کی مقبول عام کتاب فقہ اکبر کا عام فہم اور سلیس اردو ترجمہ ۳ر

۹۔ قواعد مضمون نویسی حصہ اول۔ از مظفرالدین اردو مضمون نگاری کی تعلیم و تربیت میں بہترین کتاب قیمت ۵ر

۱۰۔ قواعد مضمون نویسی حصہ دوم از مظفرالدین قیمت ۶ر

۱۱۔ طریقہ املا نویسی از مظفرالدین اردو املا سکھلانے کا مفید رسالہ قیمت ار

۱۲۔ حمایت الحساب (۵ حصے) از غلام رسول ابتدائی جماعت سے لے کر چوتھی جماعت کے لئے حساب کی کی کارآمد و مفید کتاب ہر ایک کی قیمت بالترتیب ۴ر ۶ر ۶ر ۷ر ۶ر ۲ر ۶ر ۲ر ۱۲ر ۴ر ار

۱۳۔ جبر و مقابلہ وسطانیہ۔ از سید انوار حسین بی اے مڈل اسکولوں کے لئے کارآمد جبر و مقابلہ قیمت ۱۵ر

۱۴۔ مکمل ہندسۂ عملی از منیرالدین بی اے ٹیچر کمپوزیشن کے لئے نہایت کارآمد و مفید ہندسۂ عملی ۴ر

۱۵۔ تاریخ ہند حصہ اول۔ ہندوں اور مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ جو ایک تجربہ کار ٹرینڈ گریجویٹ نے لکھی

ہے قیمت ۲؍

۱۶۔ جغرافیہ ریاست حیدرآباد از غلام قادر بی اے وغلام رسول اساتذہ سٹی کالج قلمرو سرکار آصفیہ حضور نظام کا بہترین جغرافیہ ضخامت (۲۷۶) صفحے قیمت ۱۲؍

۱۷۔ معلومات دیہی حصہ اول از غلام رسول قلمرو آصفیہ کی زراعت کی ابتدائی معلومات اور دیہاتی انتظام کے متعلق مفید کتاب قیمت ۲؍۶

۱۸۔ معلومات دیہی حصہ دوم از غلام رسول زراعت اور انتظام سے متعلق مزید معلومات قیمت ۲؍

۱۹۔ شاہ رفیع الدین قندھاری۔ از محمد عبد الغفور عابدی دکن کے ایک صاحب حال صوفی اور عالم کی دلچسپ سوانحمری ضخامت ۸۴ قیمت ۵؍

۲۰۔ سیرت خیر البشر از ذہین آنحضرت صلعم کے اخلاق حمیدہ نظم میں قیمت ا؍

۲۱۔ چھوٹا شیطان از ذہین علم کی فضیلت اور جہل کی مذمت نظم میں قیمت ا؍

۲۲۔ بچوں کا قاعدہ از مولانا مختار احمد ذہین بچوں کے لئے اردو کا مفید قاعدہ قیمت ۳؍

۲۳۔ اردو کے حروف تہجی کا تختہ مدارس کے لئے اردو کے ابجد پڑھانے کا رنگین باتصویر چارٹ ۸؍

۲۴۔ بالک پہاڑا بچوں کے لئے جمع تفریق ضرب اور تقسیم اور کسری پہاڑے قیمت ۶؍

مطبوعات دار الاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدر آباد دکن

علمی اور ادبی کتابیں

۱- اُردو شہ پارے حصہ اوّل - از ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے - پی - اچ ڈی (تاریخ اردوئے قدیم اور ابتدا اردو سے لے کر ولی اور نگ آبادی تک نظم و نثر کا بہترین انتخاب معہ نمونہ نقالے شعرائے قدیم ضخامت (۴۰۰) صفحے قیمت مجلد ۱۲/ ہے

۲- روح تنقید - از ڈاکٹر صاحب موصوف اردو میں فن تنقید کی پہلی کتاب ہے - قیمت ۱۲/

۳- تنقیدی مقالات - از ڈاکٹر صاحب موصوف روح تنقید کا دوسرا حصہ پیش کردہ تنقیدی اصولوں کی روشنی میں چید ہ شعرا کے کلام پر تنقید و تبصرہ ضخامت (۵۰۰) صفحے مجلد قیمت (سے)

۴- اردو کے اسالیب بیان - از ڈاکٹر موصوف ابتدائے نثر سے لے کر موجودہ زمانے کے نثر نگاروں کے انداز تحریر و بیان کی ارتقائی تاریخ ضخامت (۲۰۴) صفحے مجلد ۱۲/

۵- محمود غزنوی کی بزم ادب - از ڈاکٹر صاحب موصوف غزنوی دور کی علمی و ادبی کارناموں کا مرقع ضخامت (۱۲۰) صفحے قیمت (۱۲/)

۶- ارباب نثر اردو - از سید محمد ام اے اردو نثر نویسی کی تاریخ اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفین اردو کا تذکرہ ضخامت ۲۲۰ صفحے مجلد قیمت عاں -

۷- گلشن گفتار - مرتبہ سید محمد ام اے - اردو شعرا کا پہلا تذکرہ مع جامع مقدمہ ۱۱۶۵ھ سے پہلے کے دکن ہندوستان کے مشہور شاعروں کے حالات نوشتہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی ضخامت (۸۵) صفحے قیمت ۱۲/

۸- دکن میں اردو - از نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل جنوب ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اور آصف جاہی دور کے شعرا کا تذکرہ اور دکن کے علمی تصانیف رسائل اخبارات کے مفصل حالات ضخامت (۴۸۰) صفحے قیمت (عاں)

۹- آثار الکرام - از حکیم سید شمس اللہ قادری ام آر - اے - یس - لندن وسط اور جنوبی ہند کے اسلامی سلاطین کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت (۱۴۴) صفحے قیمت ۱۲/ -

۱۰- مقدمات عبدالحق حصہ اوّل - مرتبہ مرزا محمد بیگ اسپیشل افسر مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو ہند و صدر اردو جامعہ عثمانیہ کے علمی و ادبی مقدموں اور ریویوں کا مکمل مجموعہ جو مختلف موضوع کی گراں مایہ کتابوں میں شائع ہوئے تھے ضخامت تقریباً (۵۰۰) صفحے قیمت مجلد (سے)

۱۱- مقدمات عبدالحق حصہ دوم - قیمت (عاں)

۱۲- دنیائے افسانہ - از عبدالقادر سروری ام اے - ال ال - بی - اردو افسانوں کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان پر تنقید اردو میں اپنی نوعیت کی

پہلی کتاب ضخامت (۲۱۸) صفحے قیمت عہ

۱۳۔ کردار اور افسانہ۔ از سروری افسانہ نگاری میں کردار اہم جزو ہے اردو کے چند مشہور افسانوی کردار عمرو عیار (داستان امیر حمزہ) نجم النسا مثنوی میر حسن (توبتہ النصوح) محمد عون (مراثی انیس) تنقیدی مقالات قیمت (۲۳۲) صفحے قیمت عہ

۱۴۔ قدیم افسانے۔ از سروری دنیا کے شہ کار افسانوں میں سے قدیم ترین (۲۵) افسانوں کا مجموعہ ضخامت ۱۴۴ صفحے قیمت عہ

۱۵۔ چینی اور جاپانی افسانے۔ بہ نگرانی سروری چین اور جاپان کے شہ کار افسانوں کا مجموعہ ضخامت (۲۷۰) صفحے قیمت ۹

۱۶۔ انگریزی افسانے۔ بہ نگرانی سروری انگلستان کے شہ کار افسانوں کا مجموعہ ضخامت (۱۴۰) صفحے قیمت عہ

۱۷۔ مبادی فلسفہ۔ از میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی ڈاکٹر اے یس رایو پورٹ پی ایچ ڈی کی پرائمر آف دی فلاسفی کا عام فہم سلیس اردو ترجمہ ضخامت (۲۳۶) صفحے قیمت ۱۲

۱۸۔ مبادی نفسیات۔ از شیخ عبد الحمید شوق بی اے (آنرز) یہ اردو زبان میں نفسیات سے متعلق اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ضخامت (۱۹۰) صفحے قیمت عہ

۱۹۔ قاموس الاغلاط۔ از مولانا سید مختار احمد ذہین پانچ ہزار الفاظ کی تحقیق اور اول اغلاط کی تصحیح جو اہل تحقیق کے لئے مفید کتاب ضخامت (۱۸۴) صفحے قیمت (عہ)

۲۰۔ محمود گاواں۔ از ظہیر الدین سلطنت بہمنیہ وزیرو مدبر خواجہ جہاں محمود گاواں کی معتبر سوانح عمری ضخامت (۵۵) صفحے قیمت ۸

۲۱۔ نیلگری۔ از حمید اللہ ام اے ال ال بی جنوبی ہند کے صحت افزا مقام کی تاریخی و جغرافی مؤلفات ضخامت ۱۴۰ قیمت ۱۵

زندہ طلسمات

جس کو بادشاہزادگان حیدر آباد کے علاوہ معزز حکمار و ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونیکے علاوہ رجسٹرڈ ڈیپلیکیٹ شدہ ہے حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھاتا اس کا ایک قطرہ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ، پلیگ، بخار، پیچش، متلی، کھانسی، دمہ، بواسیر، خارش، سانپ بچھو کے زہر اور اقسام کے درد کیلئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی عرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے شیشی نمبر (۱) عہ (۲) ۸ (۳) ۱۴ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی معاف ہوگا۔

پتہ خط و تار زندہ طلسمات حیدر آباد دکن

غیبی دنیا۔ یعنے غیب کی آوازیں سننے کا علم امریکہ کی ایک پُر اسرار انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ جس میں عملی ہدایتیں رازکی باتیں وہ جو مر چکے ہیں جن کا وجود اب اس دنیا میں نہیں رہا اس کتاب کی مدد سے آپ اُن کی آوازیں ہوبہو سن کر ان کے بے لوث مشورہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ زمین میں مدفون شدہ خزانوں اور گم شدہ اشخاص کا پتہ لگانے کے علاوہ اپنی قسمت کا حال بھی معلوم کر سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ملنے کا پتہ

یونیورسل ٹریڈ مارک کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۵۰

لاہور

تصنیفات حضرت سلطان جہاں بیگم مرحومہ

حضرت نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ سابق فرمانروائے بھوپال نے عورتوں کی اصلاح و ترقی اور ان میں تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کی ترویج کے لئے جو عظیم الشان کوششیں فرمائیں اور جس طرح کی شاندار اسلامی اور علمی اور تعلیمی خدمات انجام دی ہیں ان سے کون ناواقف ہے۔ آپ کی مفید تصنیفات جو سلیس اور دلکش انداز بیان میں ہوتی ہیں، خاص طور پر خواتین کے لئے مفید ہیں عورتوں کے حقوق بچوں کی پرورش اور تربیت، معاشیات خانہ داری، تیمارداری وغیرہ کل ضروریات نسوانی پر آج تک کسی نے اس جامعیت اور توجہ سے قلم نہیں اٹھایا، جو آپ کی خاص خصوصیت ہے آپ کی یہ تمام مفید کتابیں جو صحت اور اہتمام سے چھپی ہیں، ہمارے ہاں سے مل سکتی ہیں۔

سیرت مصطفےٰ | سلیس اور سادہ اُردو میں آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک جو صحیح روایات پر مبنی ہے اور خاص طور پر عورتوں کے مطالعہ کے لئے تیار کی گئی ہے قیمت (۱۲/)

سبیل الجنان | ارکان اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اور دیگر شعائر اسلامی پر عورتوں کے مطالعہ کے لئے ایک دلچسپ اور بسیط کتاب ہے۔ قیمت (۱۲/)

عفت المسلمات | پردے کی نسبت شرع شریف کے نقطہ نظر کی تشریح کے بعد مشرق اور مغرب کے حالات حاضرہ کی روشنی میں عالمانہ نقد و نظر قیمت (۱۲/)

اسلام میں عورت کا مرتبہ | اسلام نے عورت کو کیا مرتبہ دیا اور ان کی عزت و احترام کی نسبت کیا ہدایات دی ہیں ان پر ایک دلکش تقریر جو لیڈیز کلب بھوپال میں کی گئی ہے قیمت (۵/)

مقصد ازدواج | اس کتاب میں نا کتخدا لڑکوں اور لڑکیوں کو شادی کے اصل مقاصد اور حسن معاشرت کے نکات عقلی اور اسلامی نکتہ نظر سے پیش کئے گئے ہیں قیمت (۱۲/)

فرائض النسا | معاشیات خانہ داری، مکان اور اس کا سامان، ملازمین، صفائی، لباس، غذا، پانی، تیمارداری بچوں کی پرورش و تربیت غرض عورت کے فرائض زندگی کے ہر پہلو کو سلیس پیرایہ میں اور نہ مختصر کیسا پیش کیا گیا ہے قیمت (۱۲/)

ہدیتہ الزوجین | یہ نکاح میاں بیوی کے حقوق، تعداد ازدواج وغیرہ پر شرعی احکام کی روشنی میں ایک مفید رسالہ ہے قیمت (۱۰/)
حفظ صحت | عورتوں کے لئے جسم و جان کی حفاظت اور ابتدائی طبی امداد کی معلومات قیمت (۵/)
ہدایات تیمارداری | بیماری کی تیمارداری علاج سے زیادہ ضروری اور مشکل ہے اس موضوع پر ضروری معلومات کا مجموعہ قیمت (۵/)
تربیت الاطفال | اس کتاب میں بچوں کی تربیت کے اصول ان کے مشاغل کا انتخاب ذہنی اور اخلاقی تربیت و اصلاح اور اعلیٰ جذبات کی ترقی اور بری عادتوں سے بچاؤ کی تدابیر بیان کی گئی ہیں۔ قیمت (۱۰/)
بچوں کی پرورش | چھوٹے بچوں کی پرورش، ان کی غذا، لباس اور بیماریوں کے علاج پر ایک بے مثل کتاب جو کئی اردو اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ قیمت (۱۲/)
تندرستی | اس کتاب میں حفظان صحت کے تمام اصول، امراض متعدی سے حفاظت کی تدابیر اور تیمارداری کے طریقے اور علاج معالجے متعدد انگریزی کتابوں سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں قیمت (۵/)
مطبخ کنگ جارج | اس میں بتایا گیا ہے کہ غذا اور ترکیب غذا میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے اور ایسے کھانے جو عموماً بیمار کے واسطے مفید ہوں کیونکر تیار ہوتے ہیں اور حالت بیماری میں ہم اپنے مریضوں کے لئے کس طرح اور کس قسم کی زود ہضم غذائیں تیار کر سکتے ہیں قیمت (۱۲/)
علم زراعت | نباتیات پر ایک ابتدائی رسالہ جس میں پودوں کی پرورش اور کاشتکاری کے طریقے بیان کئے گئے ہیں قیمت حصہ اول و دوم (۳/)
سلک شہوار | اگر آپ تعلیم نسواں کی ترقی کے بارے میں بیگم صاحبہ بھوپال کے خیالات وضاحت سے معلوم کرنا چاہیں تو یہ کتاب پڑھیے جو موصوفہ کی اس موضوع پر تمام تقاریر کا مجموعہ ہے قیمت (۵/)
مہذب زندگی | اس میں اسلامی احکام و ہدایات اور مسلمانوں کی تاریخی حکایات کو درج کیا گیا ہے تاکہ ہر ایک ہونہار ابتدا سے کچھ نہ کچھ اپنے مذہب کے اخلاقی احکام سے اور بزرگوں کے اخلاق و عادات حسنہ سے واقفیت حاصل کرے قیمت (۵/)
مدارج الفرقان | جس میں قرآن مجید کے متعلق بچوں، عورتوں اور عام معلومات کے لئے چند ضروری مضامین درج ہیں قیمت (۵/)
باغ عجیب | اس کے تین حصے ہیں جن میں (۳۳) مختلف کہانیاں ہیں جو تمام تر اخلاقی نصیحتوں سے مملو ہیں قیمت حصہ اول دوم سوم (۵/) (۵/) (۱۰/)
فرائض باغبانی | یہ مختصر رسالہ ان کیلئے بیحد مفید ہے جنہیں باغات کا شوق ہے اور باغات کی پیداوار سے دلچسپی ہے اس میں جنوری سے ڈسمبر تک جو جو کام ہر مہینے میں ہونی چاہئیں ان کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے ضخامت (۱۵) صفحات قیمت (۵/)

المشتہر — مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود متصل صدر ڈاکخانہ پتہ انگریزی حیدرآباد دکن

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔ یہ علمی وادبی رسالہ ہے جس میں علم وادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے۔ حجم کم ازکم چار جز ہوگا۔

بنظر احتیاط ہر پرچہ سرٹفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عا) فی پرچہ ۶ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کیلئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی کیلئے (عہ) ہے اگر زیادہ مدت کیلئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں (۱۲½) فیصدی سے (۲۵) فی صدی تک کمی ہوسکے گی۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط وکتابت منتظم مجلہ مکتبہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے

باہتمام

محمد نظام الدین مددگار منیجر مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد

صرف ٹیبل مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد